سیرت علیؑ

(حضرت علی علیہ السلام کی مکمل سیرت و سوانح حیات)

تصنیف : ہاشم معروف الحسنی (لبنان)

ترجمہ و تحقیق : سید محمد قرۃ العین عابدی

یکے از مطبوعات : جماران پبلی کیشنز لاہور

☆ جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں ☆

کتاب	سیرت علیؑ
مصنف	ہاشم معروف الحسنی
ترجمہ	سید محمد قرۃ العین عابدی
اشاعت اول	مئی 1994ء
تعداد	1000
ہدیہ	125 روپے
ناشر	جماران پبلی کیشنز
	16 - ریٹی گن روڈ - لاہور

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

(۱) ابتدائیہ ____ ۱
(۲) تعارف ____ ۴
(۳) تبصرہ ____ ۶
(۴) مقدمہ ____ ۸
(۵) امام علیؑ ____ ۱۵
(۶) امامؑ اور دعوت اسلام ____ ۲۰
(۷) امامؑ شعب ابوطالب میں ____ ۲۶
(۸) امامؑ ہجرت کی رات میں ____ ۲۸
(۹) امامؑ اور اخوت ____ ۳۴
(۱۰) امامؑ بوتراب ____ ۳۷
(۱۱) امامؑ جنگ بدر میں ____ ۴۱
(۱۲) امامؑ جنگ احد میں ____ ۴۸
(۱۳) امامؑ جنگ خندق میں ____ ۵۷
(۱۴) امامؑ حدیبیہ میں ____ ۶۹
(۱۵) امامؑ قلعہ خیبر میں ____ ۷۶
(۱۶) فتح مکہ میں حضرت کے کارنامے ____ ۸۵
(۱۷) بنی جذیمہ کے ساتھ ____ ۹۱
(۱۸) امامؑ وادی حنین میں ____ ۹۴
(۱۹) امامؑ اور غزوۂ تبوک ____ ۱۰۰
(۲۰) ذات السلاسل کے سریے ____ ۱۰۵
(۲۱) سورۂ برائت ____ ۱۱۱

(۲۲) امامؑ حجۃ الوداع میں ______ ۱۱۵

(۲۳) رخصت کے لمحات میں آنحضرتؐ کے ساتھ ______ ۱۲۷

(۲۴) سقیفہ بنی ساعدہ ______ ۱۳۸

(۲۵) امامؑ بیعت کے بعد ______ ۱۵۷

(۲۶) آپؑ کی شجاعت ______ ۱۸۲

(۲۷) آپؑ کا زہد ______ ۱۸۸

(۲۸) امامؑ اور بیت المال ______ ۱۹۸

(۲۹) امامؑ اور خلفاء ______ ۲۱۴

(۳۰) امامؑ حضرت عمر کے دور میں ______ ۲۲۶

(۳۱) حضرت عمر کی وفات ______ ۲۳۴

(۳۲) شوریٰ ______ ۲۴۱

(۳۳) شوریٰ نے کسے منتخب کیا ______ ۲۵۱

(۳۴) حضرت عثمان اور ان کے حواریوں کے بارے میں حضرت ابوذر غفاری کا موقف ______ ۲۸۲

(۳۵) حضرت عثمان کے خلاف بغاوت اور ان کا انجام کار ______ ۲۹۴

(۳۶) امامؑ اور خلافت ______ ۳۰۹

(۳۷) حضرت عائشہ کی لشکر کے ساتھ روانگی ______ ۳۲۸

(۳۸) امامؑ کوفہ کی طرف ______ ۳۵۲

(۳۹) معرکہ صفین اور اس میں پیش آنے والے حادثات ______ ۳۶۰

(۴۰) خوارج ______ ۳۷۶

(۴۱) ہولناک سازش ______ ۳۹۲

ابتدائیہ

علیؑ اور ان کے شیعہ ہی فلاح پانے والے ہیں

الحمد الله رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی محمد و آله اجمعین

جلال الدین سیوطی درمنثور میں سورۂ حجر کی ساتویں آیۂ مبارکہ کے ذیل میں ابن عساکر سے نقل کرتے ہیں کہ ہم لوگ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور اس دوران میں علیؑ آنحضورؐ کی خدمت میں آتے تھے تو آنحضرتؐ فرماتے تھے کہ "علیؑ اور اس کے شیعہ ہی قیامت کے دن فلاح پانے والے ہیں"۔

ایک جلال الدین سیوطی کیا اہلسنت کی دوسری مستند کتابوں میں بھی اس حدیث نبویؐ کی دھوم ہے۔ مناوی کی کنوز الحقائق' ہیثمی کی مجمع الزوائد اور ابن حجر کی صواعق محرقہ اسی قسم کے مضمون کو بڑی خوبصورتی سے رقم کرتی ہیں۔

جہاں بات مولائے کائنات کی آجائے وہاں قلم میں طاقت اور ہاتھوں میں جنبش نہیں رہتی۔ چودہ سو سال گذر جانے کے بعد بھی جس کے چاہنے والے اور جس سے عشق کرنے والے ایسے ہوں' جن کے نام پر فتح و کامیابی کی امیدیں ہوں' جن کے فضائل اور کارنامے زندہ و تابندہ ہوں' جن پر ہزاروں قلم اٹھ کے ناتمام رہ گئے ہوں ان کے بارے میں ہمیں اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ابن شہر آشوب مازندرانی جب مولائے کائنات کی زندگی و سوانح حیات پر فضائل و مناقب کی کتاب لکھنا چاہتے تھے تو ان کی لائبریری میں مولائے متقیان کے فضائل پر ہزار کتابیں موجود تھیں۔

لیکن اس اعتراف کے باوجود بھی ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ علیؑ کے چاہنے والوں کی کچھ خدمت کر سکیں۔ ان لوگوں کی جنہوں نے علیؑ کے راستہ میں جو اسلام کا راستہ ہے بہت زحمتیں اور مشقتیں اٹھائی ہیں۔ ہمارا تو بس یہی مقصد ہے کہ اپنی محدود معلومات کے دائرے میں علیؑ کے ماننے والوں کو علیؑ کا راستہ دکھائیں۔ یہی صراط مستقیم ہے یہی سنت نبویؐ ہے۔ اس لئے کہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن ان کے ساتھ ہے۔

لبنان کی سرسبز و شاداب سرزمین جس نے شہید اول' شہید ثانی و حر عاملی جیسے عظیم دانشوروں کو پروان چڑھایا ہے وہاں کے ایک مفکر و دانشور ہاشم معروف حسنی بھی ہیں جنہوں نے سیرت النبیؐ کے بعد سیرت آئمہؑ پر قلم اٹھایا یہ کتاب اسی کا ایک حصہ ہے--- یہ کتاب فضائل کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ واقعات و حالات سے بھرپور مولائے کائنات کے طرز زندگی کو سمجھنے کی اچھی کاوش ہے۔

ہم نے اس کتاب میں پوری کوشش کی ہے کہ مفاہیم کو صحیح انداز میں منعکس کرکے ان کا خلاصہ پیش کریں تاکہ محترم پڑھنے والے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فیض حاصل کر سکیں۔ لہٰذا اس سلسلہ میں قارئین کے مفید مشوروں کا

خیرمقدم کریں گے۔ قارئین کی آسانی کے لئے ہم نے کتاب میں بعض جگہوں پر مفید اطلاعات فراہم کی ہیں اور آیات و مولائے کائنات کے کلمات کو ریفرنس کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں مصنف کی رائے سے بھی اختلاف کیا ہے۔ اس کتاب کی تکمیل و تقسیم کے تمام مراحل میں ہم ہندوستان کے مشہور عالم دین، مفکر، اور ادیب جناب سید عقیل الغروی کی خدمات کو ہرگز نہ بھولیں گے جنہوں نے متعدد موقعوں پر ہماری رہنمائی کی۔

اس ضمن میں لبنان کے مایہ ناز اور جانے پہچانے اسکالر جناب سید جعفر مرتضیٰ عاملی کے بھی شکر گذار ہیں جنہوں نے مختلف مسائل کے جوابات دیئے۔ خداوند عالم سے دعا ہے کہ یہ کوشش مفید اور بارآور ثابت ہو۔ اور ہم مولائے متقیان کے سچے شیعوں میں قرار پائیں۔

والسلام علیکم
سید محمد قرۃ العین عابدی
ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ

تعارف

الحمد لله رب العالمین والصلوة والسلام علی اشرف خلقه خاتم رسله وعلی آله الهداة المیامین

سچی بات یہ کہ حضور رسول مقبول کے خدا پسند جانشینوں کی زندگی ہدایت کی جاگتی ہوئی مثال اور طہارت کی روشن علامت ہے۔

اور اس موضوع پر قلم اٹھانے والے وہ لوگ ہیں جو قافلہ بشری کی راہوں میں کمال اخلاص کے ساتھ چراغاں کرتے ہیں! کوثر چھلکاتے ہیں!

پھر ہاشم معروف الحسنی جیسے صاحب طرز اور ہوش مند لکھنے والوں کا کیا کہنا! یہ ذہن بناتے ہیں اور فکر کی کاشت کرتے ہیں!

ہاں! ہمکتا ہوا ذہن! لہکتی ہوئی فکر!

یہ دانشور جن کا ابھی ذکر ہو رہا تھا۔ بڑی قد آور شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے آئمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی، حالات اور کارناموں پر جو

کام کیا ہے وہ اپنی ہمہ گیر افادیت کے لحاظ سے پڑھنے کی شئے اور سمجھنے کی چیز ہے!

مگر یہ قیمتی ذخیرہ عربی میں تھا اور اردو داں طبقہ اس سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا تھا۔ اللہ سلامت رکھے فاضل جلیل اور جرنیل جناب مولانا سید محمد قرۃ العین صاحب عابدی کو جنہوں نے اس بیش بہا کاوش کو اردو میں منتقل کرکے ایک بہت بڑے طبقے کے لئے ایک اچھی بلکہ بہت اچھی پیش کش کے مطالعے کا بندوبست کر دیا۔

کتاب کا ترجمہ بہت رواں تفہیم کا انداز نہایت حسین اور تقدیم کا اسلوب حد درجہ پرکشش ہے۔

خدا کرے کہ یہ جواں سال دانشور ہمیشہ اتنے خوبصورت کارنامے انجام دیتے رہیں اور سدا کامیابیاں ان کے ہر شاہکار کا استقبال کریں۔

واللہ ولی التوفیق

خادم العلم و
الشریعہ

ابن حسن نجفی

تبصرہ

دنیا میں قوموں کی شکستہ دلی، شکستگی اور ان کے زوال کے کتنے ہی اسباب رہے ہوں لیکن ان اسباب کے درمیان ایک ہست، کلیدی اور بنیادی سبب جوسب سے اہم ہے وہ فروغ علم کا فقدان ہے۔ سامراج کی گرم ہواؤں میں سانس لینے والا انسان، اور اسلحہ کی دوڑ دھوپ میں پل کر جوان ہونے والی نسل شاید مادی ارتقاء ہی کو تکمیل حیات سے عبارت کرے لیکن اس مادی ارتقاء کی عمارت جن کھوکھلے اصولوں پر رکھی گئی ہے وہ کسی وقت بھی نوع انسان کی تباہی کا سبب بن سکتے ہیں۔ بنجر ذہنوں کی اس یلغار میں ہمیں علم کو عام کرنے والے لوگوں کی قدر کرنا چاہئے کہ انہوں نے اندھیروں میں روشنی کی سبیلیں لگانے کا اہتمام کیا ہے۔ تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ ترجمے کی منزلیں طے کرنے والے قلمکاروں کی بھی خدمات اس ذیل میں لائق تحسین ہیں۔ ترجمے کی اہمیت یوں بھی زیادہ ہوجاتی ہے کہ اس طرح ایک زبان کے علمی سرمایہ کو دوسری زبان میں منتقل کرکے استفادے کی بہت سی راہیں پیدا کردی جاتی ہیں عربی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے اردو بولنے والوں کی ایک

کثیر تعداد جن فکری اور علمی کتابوں کے مطالعے سے محروم تھی ان میں لبنان کے اسکالر ہاشم معروف الحسنی کی یہ کتاب بھی جس کا ترجمہ "سیرت علیؑ" کے نام سے سید محمد قرۃ العین عابدی نے کیا ہے۔ ترجمے کا کام آسان نہیں ہوا کرتا بعض مترجم حضرات ذہنوں کو سنوارنے اور نکھارنے کے بجائے الجھا بھی دیا کرتے ہیں۔ قرۃ العین عابدی صاحب نے بہت احتیاط و توازن سے قلم اٹھایا ہے انہوں نے مصنف کے اوریجنل (Original) افکار کو بے روح ترجمے سے مسخ نہیں ہونے دیا بلکہ اسے جلا بخشی ہے۔ انہوں نے کتاب کے ابتدائیے میں لکھا ہے۔

"ہم نے اس کتاب میں پوری کوشش کی ہے کہ مفاہیم کو صحیح انداز میں منعکس کر کے ان کا خلاصہ پیش کریں تاکہ محترم پڑھنے والے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فیض حاصل کر سکیں۔"۔

میں کہتا ہوں کہ وہ اس رائے میں مترجم کے فرائض کو سمیٹ لائے ہیں انہوں نے سادہ اور شیریں زبان استعمال کی ہے بوجھل اور ثقیل لفظوں سے معانی کا خون نہیں کیا بلکہ دلنشین پیرایہ بیان کو ملحوظ رکھا ہے۔ یہ ادبی خدمت بھی ہے اور مذہبی خدمت بھی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔ اگر انہوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا تو یقین ہے کہ آئندہ بھی ان کے توسط سے ہزاروں لوگ علمی استفادہ کریں گے۔

ہلال نقوی

۲۷ جون ۱۹۹۳ء

مقدمہ

حمد و ثناء اور صلوٰۃ و سلام کے بعد یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں ایک عرصہ سے آئمہ اطہارؑ کی سیرت طیبہ پر قلم اٹھانے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس بات کا متمنی تھا کہ جلد از جلد یہ سعادت پاؤں! جس زمانے میں، میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدریس و تدوین میں مشغول تھا اسی دوران مجھے یہ انکشاف ہوا کہ

"جن لوگوں نے بھی اسلام کے ابتدائی دور میں اسلامی آثار کو جمع کیا ہے دراصل انہوں نے تاریخی واقعات اور حقیقتوں کو اپنے مذہبی جذبات کا آئینہ بنایا ہے۔ اور اس دور کی سیاسی حکومتوں کا ساتھ دیا ہے جس زمانے میں حکومتوں کو ایک خاص قسم کی دینی سیاست نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا! میں اس نتیجے کے صحیح ہونے پر یقین رکھتا ہوں اور اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے سیرت النبیؐ کے شروع سے آخر تک کے تمام عناوین کو اسی مطابقت سے تحریر کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

اس تدریس کے بعد میں ان افکار و نظریات کا موجد بن چکا تھا جنہیں میں نے تاریخی واقعات اور اس دور کے خاص حالات و شرائط سے اخذ کیا تھا۔ لیکن یہ نظریات میرے قارئین کے لئے بالکل نئے تھے!

اگرچہ میں جانتا ہوں کہ ایک ایسے موضوع کے بارے میں قلم اٹھانا جو انسانی عقیدے سے وابستہ ہو' میانہ روی اختیار کرنا اور غلطیوں سے دور رہنا آسان کام نہیں' لیکن اتنا بتاتا چلوں کہ میں نے ان تمام تاریخی واقعات اور ان کے بارے میں قائم کئے جانے والے نظریات میں ہرگز جانبداری سے کام نہیں لیا۔

سیرت النبیؐ کی تدوین سے فارغ ہوتے ہی میں دوبارہ اس سوچ میں پڑگیا شاید اس لئے کہ میں نے اپنے آپ کو آئمہ اطہار علیہم السلام کی سیرت لکھنے کے لئے وقف کردیا تھا۔ موضوع دراصل جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ کی سیرت کی تکمیل تھی اور پھر حضورؐ اور آپ کے گھر والوں کے حق کی ادائیگی بھی ضروری تھی۔

ہمارے اماموں کو اسلام کے ابتدائی دشمنوں کی اولاد نے بے شمار تکلیفیں دیں۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے اماموں' نے بھی ابوسفیان' حکم بن عاص' عباس بن عبدالمطلب کی نسلوں اور تمام ظالم و جابر اور دوغلے حکمرانوں کے ساتھ وہی رویہ اپنایا جو سلوک ان کے جد امجد صلی اللہ علیہ و آلہ نے قریش کے سرغنوں' مکہ کے چودھریوں اور بنی قریظہ کے یہودیوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ آئمہ اطہارؑ نے لوگوں کو بندگی و آزادی' تنگدستی و بے نیازی' ظلم و انصاف' علم و جہالت اور جنگ و امن کے معنی سمجھائے اور عملی زندگی میں ہمیشہ مظلوموں' محروموں اور نیک لوگوں کا ساتھ دیا۔ ساتھ ساتھ انہوں نے بہترین عالم' بہترین انسان' بہترین حاکم اور بہترین معاشرہ ایجاد کرنے کے لئے مقابلہ کی بنیادیں ڈالیں تاکہ شریعت کو ظلم و غلامی کی طوق سے آزاد کراسکیں۔ انہوں نے زندگی کی مشکلات کا حل اس نسخہ کیمیاء سے کیا جو ہر زمان و مکان میں اپنی تاثیر باقی رکھتا ہے اور علم و دانش اور کمالات کے وہ آثار چھوڑے جو بڑی بڑی کتابوں میں بھی نہیں سما سکتے! یہ ورثہ جہاں کہیں اور جس

حالت میں بھی ہو' نہایت کثرت کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تمام چیزیں کرنا ان کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی کیونکہ انہوں نے اسے جناب امیر علیہ السلام سے حاصل کیا تھا اور جناب امیرؑ کو یہ ورثہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی جانب سے ملا تھا۔ شہر علم نے ان (علیؑ) پر علم کے ہزار دروازے کھول دیئے تھے اور ساتھ ہی انہیں قرآن مجید کا نظیر اور شبیہ قرار دیا تھا اور بتایا تھا کہ یہ دونوں (علی اور قرآن) ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر میں ان کے پاس پہنچ جائیں اور یہ کہ قرآن میں ہر چیز کی وضاحت ہے۔

معصومین علیہم السلام کو حکام وقت کی طرف سے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایذاء رسانی کا یہ سلسلہ اس شدت سے جاری رہا جو یا تو ان کی شہادت یا اسیری و نظربندی پر ختم ہوا۔

اس کے علاوہ انہیں اپنے شیعوں کی صفوں میں رہتے ہوئے بھی ان دشمنوں کا سامنا تھا جو ان کی بساط الٹنے اور اسلامی تعلیمات کو بدعتوں اور افسانوں میں بدلنے کے درپے تھے اور ان نادان دوستوں کا بھی جنہوں نے آپ حضرات سے وہ کام منسوب کئے جنہیں آپ نے انجام نہیں دیا یا وہ باتیں کیں جو یہ خود اپنے بارے میں کرتے تھے۔

رسالت کے یہ حقیقی وارث دونوں قسموں کے افراد کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"خدا کی قسم خوارج اور ہم سے بد زبانی کرنے والے ہمارے اتنے دشمن نہیں جتنے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمارے بارے میں وہ بات کہی جو ہم خود نہیں کہہ سکتے۔"

آئمہ معصومین علیہم السلام ہماری رہنمائی یوں فرماتے ہیں۔

"اگر کوئی بات ہماری طرف سے کہی جائے جو لوگوں کے بارے میں امکان پذیر ہو لیکن اگر تم اسے نہ جانتے ہو اور نہ ہی تم نے اس پر غور و فکر کیا ہو تو

اس کا انکار نہ کرو بلکہ اسے ہم سے منسلک کردو۔

"لیکن اگر کوئی ایسی چیز ہم سے منسوب کی جائے جو خلق خدا کے حق میں ممکن نہ ہو تو اسے جھٹلادو اور ہماری طرف نہ پلٹاؤ۔"

اس سلسلہ میں مجھ ناچیز کی رائے یہ ہے کہ راویوں نے جو کچھ اہل بیت علیھم السلام سے روایت کیا اور ان کی گفتار و کردار کو سچی نیت کے ساتھ جس طرح تحریر و تدوین کیا اسے دیکھ کر ہمارے مظلوم و بیکس امام شاید اپنی قبروں میں بھی تڑپتے ہوں گے کیونکہ ان روایت کرنے والوں نے اتنی چھان بین اور جستجو نہیں کی کہ سیاہ سفید کو الگ کر سکیں۔۔۔ اگرچہ ان لوگوں نے قابل تحسین خدمات بھی انجام دیں ہیں لیکن ساتھ ساتھ اسلام دشمنوں کے ہاتھ میں ہتھیار بھی دیدیئے تاکہ وہ آسانی سے زہرپاشی کریں اور شیعہ عقیدے کو انتشار کا نشانہ بنائیں۔ یہ زہریلے آثار ان دشمنوں کی شروع سے آخر تک کتابوں میں نہایت وضاحت کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ بہرحال اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ کام انہوں نے اچھی نیت سے کیا ہو یا بری نیت سے مگر جو کچھ شیعہ فرقے اور ان کے اماموں سے چپکایا گیا اس میں تکیہ انہی احادیث پر کیا ہے جو ہماری بڑی اور جامع کتابوں میں موجود ہیں۔ وہی کتابیں جنہیں ہمارے تاجر حضرات نئے نئے انداز اور سنہرے الفاظ میں چھاپنے پر کمربستہ رہتے ہیں لیکن اس میں موجود ان روایتوں سے غافل ہیں جو ہمارے اماموں کے مراتب و درجات کے مطابق نہیں ہیں۔

اس زمانہ کے لوگ درکنار خود عصر حاضر کے لکھنے والے بھی جب آئمہ اطہارؑ کی سیرت پر قلم فرسائی کرتے ہیں تو بس آنکھیں بند کرکے لکھنا شروع کردیتے ہیں!

معاشرتی قدروں میں انقلابی تبدیلیاں آنے کے بعد آج کا انسان اپنی سوچ اور جہاں بینی میں اس دور کے انسان سے خاصا مختلف ہے۔ لٰہذا ضروری نہیں کہ کسی شخصیت کی عظمت کا تعارف صرف ان ہی طریقوں سے کرایا جائے جو اس وقت کا دستور تھا۔ بلکہ اگر صرف واقعات اور ان سے باقی رہنے والے

آثار کی روشنی میں ان کی حیات طیبہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ کام کہیں زیادہ ان کی شان و شوکت کا بیان گر ہوگا۔

لہٰذا اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کی سیرت کے بارے میں بحث کرنے والا ان کی زندگی اور ان کے چھوڑے ہوئے آثار سے کمالات کی بڑی مثالی منزلوں کی نشان دہی کر سکتا ہے۔ اگر شیعوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے پاس حضرت علیؑ اور باقی امام ہوتے تو وہ کائنات کو ان کی خوبیوں اور ان کی یادوں سے چھلکا دیتے۔ اور ان کی حیات طیبہ کے اسرار و رموز سے ایک نئی دنیا بنا ڈالتے!

شیخ جفناوی اور شیخ خضیری اپنی کتابوں میں رقم کرتے ہیں کہ ابوسفیان کے بارے میں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ کا یہ کہنا کہ "جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگیا وہ امان میں ہے" ------- اس کے لئے اتنا بڑا شرف ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوا--------

حالانکہ اگر کوئی شخص سیرت النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا تھوڑا سا مطالعہ بھی کرتا ہو اور دعوت اسلام کی تبلیغ میں سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی روش کو ذرا برابر بھی جانتا ہو تو وہ اچھی طرح سمجھ سکے گا کہ آنحضرتؐ نے یہ جملہ خاص موقعہ پر کہا تھا تاکہ قریش کو خون خرابہ سے رو کا جاسکے---- مزید یہ کہ آپؐ نے اسی وقت یہ بھی فرمایا تھا کہ "جو حکیم بن حزام کے گھر میں پناہ لے وہ امان میں ہے' جو اپنا ہتھیار پھینک دے وہ امان میں ہے اور جو اپنے گھر جاکر اندر سے دروازہ بند کرلے وہ بھی امان میں ہے------- لیکن اس کے باوجود بھی جفناوی اور خضیری کو اور سواد اعظم کے بعض مشائخ کو صرف ابوسفیان ہی میں وہ خوبی دکھائی دیتی ہے کہ جس سے وہ مولائے متقیان تک کو محروم کردیتے ہیں جبکہ شیعہ سنی اپنے پورے اتفاق کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام کے فضائل میں کیا کچھ نہیں بیان کرتے؟------- جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے امیرالمومنین کو فتح مکہ کے دن اپنے کندھوں پر چڑھایا تاکہ ان بتوں کے ٹکڑے کردیں جنہیں

ابو سفیان پوجتے تھے اور پوجتے رہے یہاں تک کہ کفر کی موت مرے۔!

بہرحال اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ اپنی ناقص صلاحیتوں اور محدود وسائل کے ساتھ آئمہ اطہارؑ کی سوانح حیات کے کچھ گوشوں پر روشنی ڈالوں اور اب جبکہ میں اس کام سے فارغ ہوچکا ہوں تو آنسوؤں کے ساتھ سعادت پانے کا ایک جذبہ بھی امنڈ آتا ہے۔کیونکہ ان کی زندگی خدا کی یاد دلاتی ہے اور مردہ دلوں کو اسی طرح زندہ کرتی ہے جس طرح سے رحمت کی بارش بنجر زمینوں کو سرسبز کردیتی ہے----- اور جتنا ہر شخص ان کی زندگی سے متاثر ہوتا ہے اور ان سے علم کی بھیک مانگتا ہے اتنا ہی وہ عظمت و وجاہت حاصل کرتا ہے۔

ہم ہردور میں سینکڑوں شیعہ علماء اور دانشمند حضرات کو دیکھتے ہیں جنہوں نے اہل بیت کی شان و شوکت کے آگے اپنا سر تسلیم خم رکھا ہے اور وہ تمام علوم کی تاریخ کو اہل بیت علیہم السلام سے منسلک کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ مکتب جعفری سے تعلق نہ رکھتے اور اس مکتب کے اماموں کے گرویدہ نہ ہوتے تو ہرگز یہ مقام و منزلت نہ پاتے اور ناچیز ہی رہتے۔

میں نہ تو سرے سے کوئی نئی چیز لانے کا ادعاء کرتا ہوں اور نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ مجھے ان کی حیات طیبہ کے تمام گوشوں پر احاطہ ہے! اور ان کی زندگی کے گوشوں سے واقف ہوں۔کیونکہ تفصیلی علم تو صرف خاص بندوں ہی کو میسر ہے۔ البتہ جتنا جاننے اور سمجھنے کی مجھے توفیق ملی استطاعت کے مطابق اسے پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔ اس سیرت طیبہ کے بارے میں جو میرا نقطہ نظر ہے اسے میں نے اس کتاب میں تحریر کردیا ہے۔ اور کوشش یہ کی ہے کہ اختصار سے کام لوں لیکن ان تاریخی واقعات اور سیاسی حالات (جو ہمارے اماموں کی زندگی میں اہمیت کے حامل ہیں) پر قدرے تفصیل سے بحث کرنا پڑی جو مورخین کی تحریفات کا نشانہ بنے اور وہاں قلم کو آزادی دینا پڑی شاید اسی لئے یہ سیرت دو جلدوں تک پھیل گئی۔

اب جبکہ میں معصومین علیہم السلام کی زندگی کے تاریخی لمحات کو قلم بند

کرکے ان کی خدمت اقدس میں پیش کر رہا ہوں تو مجھے کبھی حضرت یوسف کے بھائیوں کا وہ مقولہ یاد آجاتا ہے جو انہوں نے مصر پہنچ کر خدا کے پیارے نبی حضرت یوسف سے کہا تھا کہ '

"حضور والا ہم اور ہمارے گھر والے بہت تکلیف میں ہیں اور ایک ناچیز سی پونجی لے کر آئے ہیں لہٰذا آپ غلہ تلوا دیجئے اور اپنی بخشش سے محروم نہ کیجئے۔ خداوند عالم بخشش کرنے والوں کو جزائے خیر دیتا ہے"۔

اور کبھی شاعر کا وہ شعر یاد آجاتا ہے۔

"اے اہل بیت زندگی میں تم ہی میرا سہارا ہو

اور آخرت میں تم ہی میری پناہ ہو!

میں نے قیامت کے لئے تمہاری سچی محبت اور حسن اعتقاد کے علاوہ کچھ جمع نہیں کیا۔

حمد ہو اس خدائے پاک پر کہ جس نے ہمیں ہدایت کی اور اگر اس کی رہنمائی نہ ہوتی تو ہم ہرگز ہدایت پانے والوں میں نہ ہوتے!

مصنف

ہاشم المعروف

امام علیؑ

جن کے بارے میں سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

"اے علی اگر میں اس سے خائف نہ ہوتا کہ لوگ تمہارے بارے میں وہ کہیں گے جو نصرانیوں نے عیسیٰ بن مریم کے بارے میں کہا تھا تو اس طرح سے تمہاری تعریف کرتا کہ لوگ تمہارے قدموں کے نیچے کی مٹی اٹھاتے۔"

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اس نفیس گفتار کے بعد میری کیا مجال کہ ان کے بارے میں کچھ کہوں یا لکھوں۔ ان کے بارے میں ہر دور کے مشہور مورخوں اور دانشمندوں نے بے شمار کتابیں لکھیں اور مختلف سوچ اور مزاج کے لوگوں نے ان کی تعریف و توصیف میں نہ جانے کیا کیا کہا۔ نیز ان کی محبت میں طغیان کرنے والوں نے نصیریوں کی طرح انہیں خدا بنا دیا۔

میں کیونکر ان کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہوں وہ تو خود پہلوانوں اور شہ سواروں کے لئے زندہ مثال ہیں، مخلص مجاہدوں کے ہادی و پیشوا ہیں اور اسلامی علوم، فلسفہ، اخلاق، تربیت، قانون گزاری اور اسلامی سیاست کے بانی

ہیں۔ وہ مثبت سیاست جو ہر دور کے لوگوں کو انصاف و عدالت اور امن و سعادت دیتی ہے۔ اور آخرت کی نعمتوں سے بہرہ مند کرتی ہے۔

اپنے اس اعتراف اور اقرار کے بعد بھی میں کوشش کروں گا کہ ان کی سیرت کے کچھ جوانب پر قلم اٹھاؤں۔ اس سلسلے میں بارگاہ ربوبی سے توفیق و مدد کا طالب ہوں۔

بے شک امیر المومنین علیہ السلام کی زندگی انسانیت کی تاریخ کا ایک عظیم معجزہ ہے جو ولادت سے لے کر آخری سانسوں تک عام طبیعت و عادات سے بہت مختلف تھی۔ انہوں نے دنیا میں آنکھیں کھولیں تو اپنے کو خانہ کعبہ میں پایا۔ تاریخ ولادت کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہے کہ ان کی والدہ قریش کی معزز خاتون' طواف کی غرض سے آئیں تھیں کہ ناگہاں شدید درد اٹھا۔ ابھی ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے ہی تھے کہ خانہ کعبہ کی دیوار شق ہوئی اور آپ اندر چلی گئیں۔ یہ ولادت ایک ایسا اعزاز ہے جو نہ آپ سے پہلے کسی کو نصیب ہوا اور نہ ہی آپ کے بعد۔ جیسے خدا کے گھر سے آئے تھے ویسے ہی جب رخت سفر باندھا تو خدا کا گھر تھا۔ "ہاشمی الطرفین" ہونا انہی کی ذات سے منسوب ہوا حالانکہ اس گھر میں آپ سے پہلے حضرت طالب و جعفر و عقیل تشریف لاچکے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب فاطمہ بنت اسد نبی اکرمؐ کی ولادت کی خوشخبری لے کر حضرت ابوطالب کی خدمت میں آئیں تو انہوں نے کہا کہ آپ تیس سال ٹھہر جائیں تو میں آپ کو بھی ہو بہو ایسے فرزند کی نوید دوں گا جس میں نبوت کے سوا تمام خوبیاں ہوں گی[۵] -

آپ کی والدہ ماجدہ بیان کرتی ہیں کہ ولادت کے بعد تین دن تک آپ نے ان کا دودھ نہیں چھوا۔ اس دوران آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی

۵۔ الکافی جلد ۱ صفحہ ۲۵۲ محمد ابن عبداللہ سکان کی روایت' کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ اور جناب امیرؑ کی ولادت میں بھی تیس سال کا فرق ہے۔

زبان مبارک چوستے رہتے تھے یہاں تک کہ سیراب ہو جاتے۔

ہم اس روایت سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا تھا کہ آپ کو رسول امینؐ کی آغوش میں ایک ایسی تربیت ملے کہ آپ آنحضرتؐ کی زندگی اور زندگی کے بعد کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا سکیں۔ پس پہلی چیز جو آپ کے بدن میں داخل ہوئی وہ کوئی ایسی معمولی چیز نہ تھی جس سے شیر خوار بچے مانوس ہوں بلکہ وہ خدا کے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک زبان تھی جو شروع سے حق و صداقت پر پروان چڑھی تھی یہاں تک کہ آنحضرتؐ جوان ہوگئے اور سچائی اور امانتداری ان میں اس طرح سے رسوخ کرگئی کہ لوگ حسب و نسب سے زیادہ آپؐ کو ان دو خوبیوں سے پہچاننے لگے۔

آنحضرتؐ چاہتے تھے کہ جس طرح سے خدا نے آپ دونوں کے دلوں کو یکجا کر دیا ہے اسی طرح زبانیں بھی یکساں ہو جائیں۔ اس لئے پہلے دن سے انہوں نے آپ کے منہ میں وہ زبان دیدی جو صداقت و حکمت کے بغیر نہیں ہلتی تھی۔ تاکہ آپ کی زبان پر بھی حکمت و دانائی کو نقش کر دیں، سچائی و صداقت کو آپ کی گھٹی میں پلادیں اور کفر و الحاد سے جنگ کو آپ کی سرشت میں سمو دیں۔ پھر کہیں جاکر دودھ پینے کی نوبت آئی۔ آپ کو اس ماں کے دودھ پینے کا شرف حاصل ہوا جس نے یتیمی کے زمانہ میں آنحضرتؐ کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا اور اپنی تمام اولاد پر انہیں اتنی فوقیت دی تھی کہ شاید وہ اپنی والدہ ماجدہ سے بھی اس کی توقع نہ کرتے۔

حضرت امیر علیہ السلام آٹھ سال تک اپنی والدہ کی زیر نگرانی رہے پھر آنحضرتؐ نے آپ کو زیر تربیت لے لیا۔ وہ آپ کو بہت زیادہ توجہ دیتے۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے، آداب و اطوار سکھاتے، اچھی چیزوں کی تعلیم دیتے اور جہان ہستی اور خالق کی معرفت سے متعلق حقائق سے آشنا کرتے۔ اسی لئے آپ نے کائنات کے اسرار و رموز کو اس طرح سمجھا کہ آپ کے علاوہ رسولؐ اللہ کے بعد کوئی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

آپ کی تمام خوبیوں میں آنحضرتؐ کی صفات جھلکتی تھیں۔ نیز جاہلیت کے

دور کی برائیوں سے جس طرح آنحضرتؐ نے دامن بچایا اسی طرح آپ بھی ان سے محفوظ رہے۔ اور اپنی صفات و کردار میں ایک اعلیٰ مثال بن گئے۔

آپ خود فرماتے ہیں کہ میں نے سات سال کی عمر میں خدا کی پرستش کی اس سے پہلے کہ اس امت کا کوئی شخص خدا کی عبادت کرتا۔ آپ کے دوست و دشمن دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ علم و تقویٰ، شجاعت وقضاوت اور زہد و پرہیز گاری میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ اسی طرح عقل و ادراک، فہم و فراست، صبر و ضبط، رزم و جزم کے معرکوں اور مظلوم کو اس کا حق دلانے میں بھی ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ مولائے متقیان بچپن ہی سے حضور اکرمؐ کے زیر تربیت آگئے تھے۔ آپ نے آغوش رسالت میں پرورش پائی یہاں تک کہ جوانی کی حدود میں داخل ہونے لگے۔ اور اس وقت جب آپ کی عمر تیرہ برس کی ہوئی آنحضرتؐ رسالت پر مبعوث ہوچکے تھے۔ انہوں نے جب آپ کو اس دین کی دعوت دی تو آپ نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا اور اسلام کے تمام احکام و تعلیمات پر اپنے ایمان کا اظہار کردیا۔

دن ہو یا رات آپ ہمیشہ آنحضرتؐ کے ساتھ ہوتے اور ان کے تمام رازوں سے باخبر رہتے۔ سوائے ان خاص چیزوں کے جو نبوت کے مقام سے مخصوص ہوتی ہیں آپ تمام آسمانی خبروں کو بھی سن سکتے تھے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ اسلام کی روح آپ کی ذات و صفات میں نمایاں ہوتی ہے تو بیجا نہ ہوگا اس لئے کہ آپ ایک ایسے دور میں پلے بڑھے تھے جہاں سے اسلام کی دعوت کا آغاز ہوا۔ پھر بچپن سے لے کر اس دعوت کے آغاز تک اسلام کے پیغمبر سے آپ کا اتنا گہرا لگاؤ اور اتنا زبردست روحی اور فکری تعلق رہا جو رشتوں کی بنیاد پر استوار نہیں ہوا کرتا۔ مورخین و محدثین کے علاوہ آپ کے سرسخت دشمن بھی مانتے ہیں کہ اس نئے دین کے لئے آپ سے زیادہ مخلص اور جاں نثار شخص نہ تھا جس نے اپنی تمام توانائیوں کو اس کے لئے وقف کردیا تھا۔

آپ قرآن کی تعلیمات اور حضور اکرمؐ کی سیرت اور ان کے اعلیٰ اخلاق کو اپنی گفتار و کردار اور تمام کاموں میں اس طرح مجسم کرگئے جو تمام مسلمانوں کے لئے ایک سنہری مثال ہے۔

اس لئے کسی نے کہا ہے کہ میں اس شخصیت کے بارے میں کیا کہوں کہ جس کے دوست ڈر کے مارے اس کے فضائل سے چشم پوشی کرتے تھے اور جس کے دشمن حسد و کینہ کی وجہ سے اس کی خوبیوں کو چھپائے رکھتے تھے پھر بھی ان کے اتنے کمالات سامنے آئے جنہوں نے مشرق و مغرب کو ہلا کر رکھ دیا۔

اپنے پرائے سب ہی ان کے گرویدہ تھے۔ ہر شخص نے اپنی سوچ اور اپنے نظریات کے مطابق ان کی تعریف کی۔ کچھ لوگ تو ان کی محبت و دیوانگی میں اتنے بڑھے کہ نعوذ باللہ انہیں خدا کہا۔ اور خدا کے بجائے ان کی عبادت اپنالی۔ یقیناً یہ لوگ دوزخ کی آگ میں جل رہے ہوں گے۔ بنی امیہ اور خوارج ان سے بدزبانی کرتے تھے۔ لیکن یہ لوگ صرف جنگ صفین میں اس وقت جب قرآن نیزوں پر اٹھایا جاچکا تھا حکم کرنے میں غلطی کو ان سے نسبت دے سکے۔

سلام ہو اس پاک رسولؐ پر جنہوں نے بہت پہلے ہی مولا کو ان چیزوں سے آگاہ کردیا تھا اور فرمایا تھا۔

"اے علی تمہاری ذات میں دو شخص ہلاک ہوگئے وہ عاشق و محب جس نے تمہاری محبت میں طغیان کیا اور وہ جس نے تم سے کینہ و بغض رکھا اور اول فول بکتا رہا۔"

عقاد جیسا دانشمند لکھتا ہے کہ میں نے کسی شخص کے بارے میں اتنا اختلاف نہیں دیکھا کہ کچھ لوگ تو اسے خدا کہہ رہے ہوں اور کچھ کافر و ملعون سمجھ رہے ہوں۔"

امامؑ اور دعوت اسلام

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چالیس سال کی عمر میں رسالت پر مبعوث ہوئے تھے۔ تمام مورخین اور محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت خدیجہ علیہا السلام وہ پہلی شخصیت تھیں جنہوں نے اسلام کا اظہار کیا۔ تاریخ ابن خلدون اور تاریخ یعقوبی اس بارے میں یہ بھی رقم کرتی ہیں کہ جب نماز کا حکم آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پہلی نماز ادا کرنے کا شرف حضرت خدیجہ کو نصیب ہوا۔

مورخین اس میں بھی کوئی شک نہیں رکھتے کہ امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب مردوں میں سب سے پہلے اپنے اسلام کا اظہار کر چکے تھے اور آپ کے بعد اسلام لوگوں میں پھیلنا شروع ہوا۔ اختلاف اس پر ہے کہ اسلام کے اس اعلان کے وقت آپ کی عمر کیا تھی۔؟

اس بارے میں ہماری نظر میں مناسب ترین مقولہ یہ ہے کہ اس وقت آپ کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ حسن بصری اس مقولہ کو روایت کرتے ہیں اور

مورخین کی ایک جماعت اسے پسند کرتی ہے۔

البتہ کتاب ''الکافی'' میں محمد یعقوب کلینی روایت کرتے ہیں ۔ اسلام لاتے وقت آپ کی عمر دس سے تیرہ سال کے لگ بھگ تھی ---- جبکہ حذیفہ بن یمان اور ابن ابی شیبہ کی روایتوں کے مطابق آپ چودہ سال کے تھے۔

اہلسنّت کے ایک دانشمند جاحظ آپ کی عمر کو سات سال بتاتے ہیں۔ وہ اس مقولہ میں اس اختلاف پر تکیہ کرتے ہیں جو آپ کی عمر کے بارے میں ان روایتوں میں موجود ہے۔

حالانکہ جتنی روایتیں بھی مولا کے اسلام کے بارے میں ملتی ہیں ان میں آپ کی عمر کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ مزید یہ کہ جاحظ کے علاوہ کوئی بھی اس نظریہ کا حامی نہیں اور خود محدثین کی ایک جماعت ان کے اس نقطہ نظر کو جہالت پر مبنی ٹھہرا کر غیر حقیقی قرار دیتی ہے۔ انہی افراد میں ابو جعفر اسکافی بھی ہیں جو ان کی تردید میں لکھتے ہیں[۱] -

''چھوٹے بڑے پڑھے لکھے اور بے پڑھے سب ہی جانتے ہیں کہ علیؑ اس گھر میں پیدا نہیں ہوئے جہاں سے اسلام کی دعوت کا آغاز ہوا بلکہ وہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آئے جب ان کی عمر آٹھ برس کی تھی اور مکہ میں قحط و خشک سالی تھی۔ وہ سات سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں رہے اور اس پورے عرصہ میں نبوت کی خبر بھی نہ ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دوران دین ابراہیمی پر عمل پیرا تھے اور حضرت علیؑ بھی ان کی پیروی کرتے تھے -- جب اسلام کی دعوت کا آغاز ہوا تو وہ عاقل و بالغ ہو چکے تھے۔ لہٰذا جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو اسلام کی دعوت دی تو آپ نے فہم و فراست اور عقل و شعور کی روشنی میں اسے لبیک کہا۔''

---

[۱] شرح نہج البلاغہ صفحہ ۲۶۵-۲۶۴ جلد ۲

اسکافی کی اس دلیل سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام اسلام کے اظہار کے وقت عاقل و بالغ تھے۔ لیکن جاحظ جیسے متعصب لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت علیؑ بچوں کی مانند بڑوں کے کہنے پر اسلام لائے تھے اور حضرت ابوبکر جو مرد تھے پوری عقل و دانش کے ساتھ اسلام کی طرف بڑھے تھے۔

اس قسم کی کوششیں اہل بیت کے دشمنوں کی طرف سے ہوتی رہی ہیں اس لئے کہ جب وہ مولا علیؑ کی اس مثالی زندگی میں ایک عیب بھی نکالنے سے عاجز آگئے تو ناچار انہوں نے اس قسم کی کوششیں شروع کر دیں۔

بالفرض اگر مان لیا جائے کہ اس وقت آپ کی عمر سات سال تھی تب بھی تاریخ یہی رقم کرتی ہے کہ دعوت اسلام کے تمام مرحلوں میں آپ سے بڑھ کر کوئی اسلام کا حامی و مددگار اور اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فدائی اور خیر خواہ نہ تھا۔ اس بارے میں تفصیل سے ''سیرۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' میں بحث کی جاچکی ہے۔

اہلسنت کی معتبر کتابیں، سنن ابن ماجہ، مسند احمد، سنن نسائی، کنز العمال، مروج مسعودی اور مجمع الزوائد یہ تو نہیں لکھتیں کہ اسلام پر لبیک کہتے وقت آپ کی عمر سات برس کی تھی لیکن ان میں یہ اشارے ضرور ملتے ہیں کہ اس وقت آپ عہد طفولیت میں تھے۔ لیکن اسکافی ان باتوں کی تردید کر کے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا شمار مردوں میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے اس ادعاء کو دعوت ذوالعشیرۃ جیسے مشہور تاریخی واقعہ سے ثابت کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے اسلام کا پیغام پہنچنے کے کچھ ہی دنوں بعد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دیں۔ جناب ختمی مرتب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سب لوگوں کو دعوت دی۔ جب سب جمع ہوگئے اور کھانا تناول فرمایا جاچکا تو خدا کے حبیب نے خدا کی وحدانیت کا درس دیا اور اسلام کا پیغام ان لوگوں تک پہنچایا اور پھر فرمایا۔

"تم میں سے جو کوئی بھی اس کام میں میری مدد کرے گا وہ میرا بھائی، وصی اور میرے بعد میرا جانشین ہو گا۔"

تاریخ لکھتی ہے کہ سوائے علیؑ کے کسی نے مثبت جواب نہیں دیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیسری دفعہ بھی اس جملے کو دہرا چکے اور کسی نے جواب نہیں دیا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا۔

"تم میرے بھائی، وصی اور وارث ہو اور میرے بعد میرے جانشین ہو۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ بات سن کر وہ لوگ ہنستے مذاق اڑاتے اٹھ بیٹھے اور محفل برخاست ہو گئی۔"

اسکافی رقم کرتے ہیں کہ کیا کھانا دینے کا انتظام و اہتمام سات سال کے کمسن بچہ کے سپرد کیا جاسکتا ہے۔؟ کیا اتنی عمر کے بچہ میں یہ استعداد ہوتی ہے کہ بڑوں بوڑھوں کو دعوت دے۔؟

اور پھر کیسے ممکن ہے کہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسالت کا بوجھ ایک ایسے بچہ پر لادھ دیں جو پختہ عمری تک نہ پہنچا ہو۔ لہٰذا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دیدیا اور آپ کو اپنا خلیفہ بنالیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس کی اہلیت رکھتے تھے اور اس سے متعلق تمام چیزوں کی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے تھے۔۔

خود امیر المومنین علیہ الصلوۃ و السلام اپنے اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی قرابت داری کا اظہار یوں فرماتے ہیں[1]۔

"تم لوگ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میری رشتہ داری اور ان کی نظر میں جو مقام و منزلت میرے لئے تھا، اس سے بخوبی واقف ہو۔

---

[1] اسے شرح نہج البلاغہ سے نقل کیا گیا ہے۔

وہ مجھے اپنے کمرے میں رکھتے اور جبکہ میں بچہ تھا مجھے اپنے سینہ سے چمٹاتے اور اپنے بستر پر سلاتے۔ وہ اپنا جسم مجھ سے مس کرتے تھے جس کی خوشبو سونگھ کر میں عجیب فرحت کا احساس کرتا تھا۔ پہلے لقمہ چباتے اور پھر میرے منہ میں ڈالتے۔ انہوں نے میری رفتار میں جھوٹ پایا نہ میرے کردار میں خطا دیکھی۔ جس اعلیٰ اخلاق سے بارگاہ ربوبی سے انہیں نوازا گیا تھا اس میں میں یوں ان کی پیروی کرتا تھا جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر روز اپنے بلند اخلاق میں سے ایک خلق سکھا کر میرے علم میں اضافہ کرتے اور مجھے اس پر پابند رہنے کی تاکید کرتے۔

اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت خدیجہ اور میرے علاوہ کوئی اسلام کا ماننے والا نہ تھا۔ میں نے وحی و رسالت کے نور کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور نبوت کی خوشبو سونگھی۔ میرے کانوں میں کسی کے رونے کی آواز سنائی دی تب میں نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کس کے رونے کی آواز ہے۔ انہوں نے جواب دیا یہ شیطان کی آواز ہے جو خدا کے بندوں سے مایوس ہوکر رورہا ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امیرؑ کی شان میں یہ جملے کہے۔

"تم ہر اس چیز کو سن رہے ہو جو میں سن رہا ہوں اور وہ کچھ دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں سوائے اس کے کہ تم نبی نہیں ہو بلکہ وزیر (وصی) ہو اور اچھائی پر گامزن و استوار ہو۔"

علامہ مجلسی "بحار الانوار" میں علی بن ابراہیم سے روایت کرتے ہیں کہ مولائے متقیان کے بعد جعفر بن ابیطالب ایمان لائے پھر زید بن حارثہ اور پھر حضرت ابوبکر اگرچہ ابن ابی الحدید معتزلی بھی اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں لیکن کچھ روایتوں میں حضرت امیر علیہ السلام کے بعد حضرت ابوبکر کے اسلام کا تذکرہ ملتا ہے جبکہ کچھ اور روایتوں میں حضرت امیرؑ کے بعد زید بن حارثہ کے اسلام کو بتایا گیا ہے۔

البتہ زیادہ تر روایتیں اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ حضرت جعفر و زید کا

اسلام حضرت ابوبکرؓ کے اسلام سے پہلے تھا۔

دوسری طرف سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کچھ ایسے مصنفین بھی نظر آتے ہیں جو رقم کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے نہ صرف اسلام لانے میں سبقت کی تھی بلکہ وہ اسلام کے داعی بھی بن گئے تھے اور ان کے زیر اثر حضرت عثمان' زبیر' طلحہ اور سعد بن ابی وقاص اسلام لے آئے تھے۔ یہ تمام لوگ اس رائے کو اختیار کرنے میں حضرت ابوبکر کی صاحب زادی اسماء کی روایت پر تکیہ کرتے ہیں۔

مورخین اور محققین حضرت ابوبکر کے اسلام پر تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کی تردید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت ابوبکر ان لوگوں پر اثرانداز ہوں جبکہ ان میں سے کوئی بھی ان کے حلقہ احباب میں نہیں تھا۔ پھر جب وہ اپنے والد' اپنے بیٹے عبدالرحمٰن اور بیوی نملہ کو اسلام کی طرف مائل نہ کرسکے تو کیونکر وہ لوگوں کو مسلمان کرتے۔

مزید یہ کہ اسماء جو اس روایت کی واحد سند ہیں' اس وقت زیادہ سے زیادہ چار سال کی تھیں اور تین یا چار سال کی بچی میں اتنا شعور نہیں ہوتا کہ وہ ان تمام مسائل کو سمجھ سکے۔

ان نکات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ روایات معتبر نہیں ہیں لہٰذا یہ مقولہ باطل ہوجاتا ہے۔

امامؑ شعب ابی طالب میں

قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحاب پر تمام حربے آزما کر اور ظلم و استحصال کی انتہا کر کے' ہمت ہار بیٹھے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ نہ صرف ان کوششوں کا کوئی فائدہ نہیں نکلا بلکہ الٹا نقصان بھی ہوا ہے۔ انہوں نے اس بات کا بھی بخوبی جائزہ لے لیا تھا کہ جب تک علیؑ اور حمزہ مسلمانوں کے درمیان موجود ہیں وہ اس تحریک کو ختم نہیں کر سکیں گے۔

بلکہ اب تو اس تحریک کی قدرت روز بروز بڑھتی چلی جارہی تھی اور کوئی ایسا گھر نہیں تھا جہاں اس نئے دین کا ماننے والا نہ ہو۔ مکہ ہی پر کیا منحصر یہ آواز حبشہ تک پہنچ گئی تھی جہاں کے بادشاہ نے اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی۔ نیز آس پاس کے علاقوں میں بھی کم و بیش اس کے اثرات پہنچ گئے تھے۔

اس بڑھتے ہوئے خطرے کے پیش نظر قریش' بنی مخزوم اور مکہ کے دوسرے قبیلوں نے بنی ہاشم کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے آپس میں طے کیا کہ بنی ہاشم سے لین دین' شادی بیاہ اور اس قسم کے دوسرے معاملات پر

پابندی لگادی جائے۔ انہوں نے اس قرارداد کو منظور کر کے تحریری صورت میں خانہ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کردیا۔ اور یوں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور بنی ہاشم کو شہر سے دور ایک تنگ اور بے آب و گیاہ گھاٹی میں محصور ہونا پڑا جسے تاریخ شعب ابوطالب کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس ناکہ بندی کی مدت دو سال اور کچھ تاریخوں کے مطابق تین سال تھی۔ کچھ ہی مہینہ بعد بنی ہاشم کا آذوقہ اور کھانے پینے کا سامان ختم ہوگیا اور بھوک و فاقہ کی شدت سے اکثر بچوں اور عورتوں کی چیخ و پکار سنائی دیتی۔ ادھر قریش بازار کی چیزیں مہنگے داموں خرید لیا کرتے تاکہ کہیں یہ بنی ہاشم تک نہ پہنچ جائیں۔ رات کی تاریکی میں کبھی کبھار اگر کوئی چیز پہنچتی تو وہ اس خاندان اور قبیلہ کے تمام لوگوں کے لئے اتنی کم ہوتی جس سے بھوک کی تیزی میں کمی نہ آتی لہٰذا مجبوراً یہ لوگ گھاس پھوس اور پتے کھاکر زندگی گزار رہے تھے۔

اہلسنّت کے مشہور مورخ ابن کثیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

"یوں نظر آتا ہے کہ ابوطالب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو باقی رکھنے اور انہیں زندہ دیکھنے کے حد درجہ مشتاق تھے۔ وہ رات کی تاریکیوں میں بستر بدل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے کسی بھی فرزند کی جگہ سلادیا کرتے اور اپنے فرزند کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ پر تاکہ اگر کبھی دشمن حملہ کرے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آسیب نہ پہنچے۔

شرح نہج البلاغہ میں ابی جعفر محمد بن حبیب کی امالی سے ایک روایت نقل ہوتی ہے جس کے مطابق حضرت ابوطالب اکثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ کر فرط محبت سے رو پڑتے تھے اور اپنے بھائی عبداللہ کو یاد کرتے۔ اس روایت میں یہ بھی ملتا ہے کہ وہ اکثر امیر المومنینؑ کو ان کے بستر پر سلادیتے اور جناب امیر علیہ السلام خدا کی خوشنودی کی خاطر اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت میں بڑے شوق سے سوجایا کرتے۔ اس روایت میں آپ دونوں کے اشعار بھی ہیں جو اس جذبہ کی عکاسی کرتے ہیں جو آپ دونوں اس دین اور اس دین کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں رکھتے تھے۔

امامؑ ہجرت کی رات میں

حضرت ابو طالب کی وفات کے بعد قریش جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر حد سے زیادہ جری ہوگئے تھے۔ وہ آپ کی عزت کرتے نہ احترام برقرار رکھتے۔ مکہ میں کوئی بھی نہ تھا جو آپ کو امان دیتا اور کفار کے شر سے محفوظ رکھتا۔ جب آپ پہلی مرتبہ حضرت امیرؑ اور زید بن حارثہ کے ساتھ اس دین کی تبلیغ کے لئے نکلے اور سرزمین طائف پر قدم رکھا تو یہاں کے لوگوں نے نہ صرف آپ کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پیچھے اوباش قسم کے لڑکے بھی لگا دیئے۔ انہوں نے آپ کو لہولہان کر دیا۔ اس موقع پر امیر المومنین علیہ السلام تمام پتھروں کو اپنے سینے پر روکتے ہوئے زخمی ہوگئے تھے لیکن پھر بھی کچھ پتھر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ٹانگوں پر لگے جس سے خون بہنے لگا۔

طائف سے واپس آکر جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بہت مشکل سے مطعم بن عدی کی امان میں مکہ میں داخل ہوسکے۔ یہاں پہنچ کر آپ اللہ تعالیٰ کے حکم اور مدینہ کے وفود کا انتظار کرنے لگے۔

قریش اور خصوصاً ابولہب آپ پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ ہجرت کرنے میں کامیاب ہوگئے اور اگر مدینہ اسلام کی نشرو اشاعت کا مرکز بن گیا تو پھر اسلام پورے جزیرہ عرب کے لئے خطرہ بن جائے گا۔ دوسری طرف ان میں سے کسی میں بھی اتنی جرات نہ تھی کہ بنی ہاشم کے اس چشم و چراغ کو بجھادے اور اپنے یا اپنے قبیلے کے ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خون سے رنگین کرلے۔ لہٰذا انہوں نے اس مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے لئے "دارالندوہ" نامی جگہ پر ایک جلسہ منعقد کیا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ اس جلسہ میں ہر قبیلے کے سردار اور بزرگ نے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں لیکن آخری فیصلہ ابوجہل بن ہشام نے کیا۔ طے یہ پایا کہ رات کی تاریکی میں تمام قبیلوں سے منتخب شدہ افراد کا ایک گروہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر بھیجا جائے جو آپ ؐ کا کام تمام کردے۔ اس گروہ نے آتے ہی آپ ؐ کے گھر کو چاروں طرف سے گھیرلیا اور رات کے مزید تاریک ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

ادھر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے وحی نازل کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قریش کے ناپاک عزائم سے آگاہ کیا اور ہجرت کا حکم دے کر قریش کا یہ منصوبہ خاک میں ملادیا۔ جب سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مولائے متقیان کو اس واقعہ کی خبر دی تو فرط محبت سے ان کی آنکھیں آزردہ ہوئیں اور وہ رونے لگے۔ لیکن جب خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے بستر پر سونے کے لئے کہا تو انہوں نے پوچھا'

"یا رسول ؐ اللہ کیا اگر میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کروں تو آپ بچ جائیں گے"۔۔؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیوں نہیں۔ میرے خدا نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ یہ سن کر امیر المومنین علیہ السلام نے ہنسی خوشی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر اوڑھی اور خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے انداز سے لیٹ کر اطمینان و یقین کی گہری نیند سوگئے۔

ہمارے سامنے بڑے بڑے پہلوانوں کے معرکہ خیز قصے اور واقعات ہیں جنہوں نے ہتھیار و اوزار کے بہترین استعمال سے طاقتور دشمن کو شکست دی۔ لیکن کسی ایسے دلاور اور شجاع کا تذکرہ نہیں سنا جو خالی ہاتھ موت کو گلے لگالے اور اسے تھوڑی بہت پریشانی بھی نہ ہو۔

روایات کے مطابق قریش کے یہ پٹھو رات کوگھر کی دہلیز سے جھانک کر دیکھتے رہتے تھے اور ہر دفعہ انہیں یہ اطمینان ہوجاتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی سو رہے ہیں۔ آنحضرتؐ جو گھر میں کہیں چھپ گئے تھے' باہر نکلے اور انہوں نے جنوب کی سمت میں غار ثور کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

سیرت ابن ہشام' تاریخ طبری اور طبقات ابن سعد میں مرقوم ہے کہ گھر سے باہر نکلتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے تھے۔ جاتے وقت آپؐ نے زمین سے اپنی مٹھی میں مٹی بھری اور ان سروں پر پھینکنے لگے اور اس آیۂ شریفہ کی تلاوت کرنے لگے۔

"اور ہم نے ان کے درمیان اور ان کے پیچھے ایک دیوار کھڑی کر دی ہے اور انہیں مدہوش کر دیا ہے پس وہ نہیں دیکھ سکتے۔"

جب رات کا اچھا خاصا حصہ گزر چکا تو ان سب نے آنحضرتؐ کے بستر پر دھاوا بول دیا لیکن علی بن ابی طالبؑ کو دیکھ کر ان کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

کچھ روایتوں کے مطابق انہوں نے دور سے پتھر پھینکے لیکن جب سونے والے نے حرکت نہ کی تو انہوں نے بستر پر حملہ کر دیا۔ امیر المومنین علیہ السلام بھی خالی ہاتھ ان لوگوں کے مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے جن کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں۔ ان میں خالد بن ولید پیش پیش تھے۔ تھوڑی سی دیر میں آپ نے خالد سے تلوار چھینی اور سب کو بھگا دیا۔

تاریخ یعقوبی میں مرقوم ہے کہ اسی رات خداوند عالم نے اپنے دو مقرب

ملائکہ کو وحی کی کہ میں نے تم دونوں کے درمیان برادری اور اخوت برقرار کی ہے اور تم میں سے ایک کی عمر کو زیادہ قرار دیا ہے۔ پس تم میں سے کون یہ طویل زندگی دوسرے کو پیش کرنا پسند کرے گا؟

جب دونوں میں سے کوئی بھی اس قربانی کے لئے حاضر نہ ہوا اور دونوں نے اپنے لئے زندگی کو پسند کیا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم کیوں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور علیؑ مرتضیٰ کی طرح نہیں ہو کہ میں نے ان کے درمیان بھی اخوت برقرار کی تھی اور ان میں سے ایک کو زیادہ زندگی دی تھی لیکن علیؑ نے بستر پر سو کر اپنی جان ہمارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان کر دی۔ تم دونوں زمین کی طرف جاؤ اور انہیں دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھو۔ دونوں زمین پر اترے اور فرمان الٰہی کی اطاعت کی۔

ان میں حضرت جبریل یہ فرمارہے تھے۔

"اے علیؑ آپ جیسے لوگ کتنے سعادت مند ہیں کہ خدا سات آسمان کے اوپر سے بیٹھا آپ پر فخر و افتخار کر رہا ہے۔"

بہرحال حضرت امیر علیہ السلام کا آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بستر پر سونا اگرچہ ایک بے لوث ایثار ہے لیکن آپ کی اور آپکے والد کی پوری زندگی اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ حضرت ابوطالب نے آخری سانس تک جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت کی وہ بے مثال ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر ہی انہوں نے کئی سال تنگ گھاٹی میں گزارے اور فقر و فاقہ کو برداشت کیا۔ یہاں وہ راتوں کو بستر بدل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے کسی بچہ کی جگہ سلا دیتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اطمینان دلانے کے لئے یہ کہتے۔

"خدا کی قسم جب تک وہ ہمیں زمین میں دفن نہ کر دیں تب تک تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکیں گے۔"

لیکن اس جذبہ کی تاریخ نے یہ قدردانی کی کہ ان کی وفات کو شرک کی موت

بتایا۔ شاید ان لوگوں کی نظر میں حضرت ابوطالب کی کوئی غلطی نہ تھی سوائے اس کے کہ وہ مولائے متقیان کے والد تھے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ سب لوگ ان کی قداست و پاکیزگی کے گیت گاتے۔۔۔ خود امیر المومنین علیہ السلام کا سرور کائنات کی چادر اوڑھ کر خاص ان کے انداز سے انہی کے بستر پر سونا حکمت سے خالی نہ تھا لیکن غیر تو غیر خود علیؑ کا کلمہ پڑھنے والے اور ان کے شیعہ بھی اس واقعہ کو بصیرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

مقصود یہ دکھانا تھا کہ علیؑ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ لینے اور ان کی نمائندگی کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

دوسری طرف سے کچھ لوگوں نے کوشش کی ہے کہ حضرت ابوبکر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہجرت کرنے کو ان کی فضیلتوں میں شمار کریں تاکہ یہ ہمراہی بھی کسی طرح جناب امیر علیہ الصلوۃ السلام کی قربانی سے کم نہ ہو۔ حالانکہ خود تاریخ ضبط کرتی ہے کہ ڈر اور خوف کے مارے ان کا وہ حال ہوگیا تھا کہ اگر سرور کائنات انہیں اطمینان و سکون بہم نہ پہنچاتے تو شاید وہ اس دنیا سے گزر چکے ہوتے۔

امام فخر رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے امیر المومنین کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سونے کی مناسبت سے یہ آیہ شریفہ نازل کی۔

"ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ"

"اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کی خوشنودی کی خاطر اپنی جان بھی داؤ پر لگادیتے ہیں۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ امیر المومنین کی اس عبادت سے ان کا اس دنیا سے حقیقی زھد اور ان کے خلوص اور سچی نیت کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ساتھ ہی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ان کی وفاداری اور خود ان کی شجاعت اور بہادری بھی ثابت ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آپ کو بے حد چاہتے

تھے اور اسی وقت سے آپ کو خلیفہ بنانے کے لئے راہیں ہموار کرنے لگے تھے۔
یہ عنایتیں کسی صورت بھی چچا زاد بھائی ہونے کی وجہ سے نہ تھیں اس لئے کہ
تعصب اور خاندانی دوستی کی یہ باتیں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم
کی ذات سے بہت دور تھیں۔

امامؑ اور اخوت

زیادہ تر تاریخیں لکھتی ہیں کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں ہجرت سے پہلے ہی مسلمانوں کے درمیان اخوت و برادری برقرار کی تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے حضرت عمر کو حضرت ابوبکر کا، حضرت عثمان کو عبدالرحمٰن بن عوف کا اور زبیر کو عبداللہ بن مسعود کا بھائی بنایا۔ اور جب جناب امیر علیہ السلام کے علاوہ کوئی نہیں رہ گیا تو مسلمان گویا باتیں بنانے لگے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کو تنہا چھوڑ دیا ہے اور انہیں کسی کا بھائی نہیں بنایا۔ لیکن بہت جلد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک جملہ کہہ کر یہ مشکل حل کر دی۔ انہوں نے جناب امیر علیہ السلام سے فرمایا۔

"کیا تم راضی نہیں ہو کہ میرے بھائی بنو۔ جناب امیر علیہ السلام نے عرض کیا کیوں نہیں اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔"

کچھ لوگ اس اخوت خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مولا علیؑ کی برادری کو باوجود اس کے کہ یہ کثرت سے روایت کی گئی ہے، ماننے سے انکار کردیتے ہیں۔ انہی میں ایک ابن ہشام بھی ہیں۔ ابن ہشام اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے بعد مہاجرین و انصار میں اخوت کی بنیاد رکھی۔ یہ برادری قائم کرکے آپ مہاجر و انصار میں اسلام و ایمان کا بندھن ایجاد کرنا چاہتے تھے تاکہ تعصبی اور قبائلی رشتے کمزور پڑ جائیں اور یہ لوگ اسلام کے پرچم تلے جمع ہوجائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بھی چاہتے تھے کہ انصار معاشی مسائل میں مہاجرین کی مدد کریں۔ اس ضمن میں سیرت ابن ہشام تفصیلات ذکر کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ وہ تعلقات جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مہاجر و انصار کے درمیان قائم کرنا چاہتے تھے، وجود میں آگئے تھے۔

اس کتاب میں کہیں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جناب امیرؑ کی برادری کا تذکرہ نہیں ملتا حالانکہ خود اہلسنت کی معتبر کتاب "ریاض النضرۃ" رقم کرتی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مولائے متقیان کو تنہا چھوڑ دیا اور کسی کے ساتھ بھی ان کی برادری برقرار نہ کی تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا

"اے خدا کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؐ نے سب کے درمیان اخوت برقرار کی اور ہمیں اکیلا چھوڑ دیا۔"

جناب ختمی نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ میں نے تمہیں صرف اپنے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو اور اگر کوئی پوچھے تو کہہ دینا۔

"میں خدا کا بندہ ہوں اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھائی ہوں۔ میرے بعد جو یہ دعویٰ کرے گا جھوٹا ہوگا۔"[1]

---

[1] احمد اپنی مناقب میں، متقی کنزالعمال میں اور ابن عدی کامل میں اسے ذکر کرتے ہیں۔

طبرانی کی روایت کے مطابق "ریاض النضرۃ" تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ کلمات بھی نقل کرتی ہے جو امیرالمومنینؑ کے بارے میں کہے گئے ہیں۔ "قسم اس ذات کی جس نے مجھے حق پر مبعوث کیا' تمہیں میں نے صرف اپنے لئے تنہا رکھ چھوڑا تھا۔ تمہیں مجھ سے وہی نسبت حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ البتہ تم میرے بھائی ہو اور وارث ہو۔"

جناب امیر علیہ السلام نے پوچھا کہ میں کیا ورثہ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے لوں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا' جو باقی انبیاء اپنے وارثوں کو دیتے ہیں یعنی خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت۔ پھر بیٹی فاطمہ کے علاوہ تم بھی جنت کے محل میں میرے ساتھ ہوگے۔

امام ؑ ابو تراب

تاریخ جناب امیر علیہ السلام کے اس نام سے یاد کئے جانے کے بارے میں لکھتی ہے کہ مسلمان ہجرت کے دوسرے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سرکردگی میں ایک غزوہ پر نکلے جسے غزوہ عشیرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس غزوہ میں لشکر کے پرچم دار حضرت حمزہ ؓ تھے اور ساتھ ہی مسلمانوں کی ایک جماعت تھی جس میں حضرت علی ؑ بن ابی طالب اور حضرت عمار بن یاسر بھی تھے ان لوگوں نے "ینبع" نامی مقام تک پیشقدمی جاری رکھی۔ اس سفر میں کسی سے جھڑپ نہ ہوئی بلکہ بنی مدلج اور ان کے ہم پیمان گروہوں سے صلح کرلی گئی۔

ابن اسحاق حضرت عمار سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اس بارے میں فرماتے ہیں کہ "ہم لوگ غزوہ عشیرہ کیلئے نکلے تھے جب لشکر نے راستہ میں ایک جگہ قیام کیا تو ہمیں بنی مدلج کے کچھ لوگ اپنے چشمے میں کام کرتے دکھائی دیئے۔ حضرت علی ؑ نے مجھ سے پوچھا "اے عمار کیا تم اس پر رضامند ہو کہ چل کر

دیکھیں کہ بنی مدلج کے لوگ کس طرح کام کرتے ہیں ؟" میں نے جواب دیا کہ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہم لوگ وہاں گئے اور ایک گھنٹہ تک ان کی فنکاری کے مظاہرے دیکھتے رہے یہاں تک کہ نیند ستانے لگی لہٰذا قریب ہی کھجور کے درخت کے سائے میں ستانے لگے یہاں تک کہ ہم پر نیند غالب آگئی۔ آنکھ کھلی تو دیکھا سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ہمیں اٹھا رہے ہیں اس دن انہوں نے پہلی مرتبہ حضرت علیؑ کو "بوتراب" یعنی خاک نشین کے نام سے یاد کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

"اے بوتراب کیا کر رہے ہو"

پھر انہوں نے فرمایا کیا چاہتے ہو کہ تمہیں شقی ترین شخص سے آگاہ کروں۔ ہم نے جواب دیا کیوں نہیں ؟"

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا دواشخاص سب سے زیادہ شقی ہیں۔ ایک وہ جس نے صالح کی اونٹنی کو ذبح کیا۔ (پھر انہوں نے آپ کے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا)۔

"دوسرا وہ جو یہاں وار کرے گا اور اس داڑھی کو خون سے تر کردے گا"۔

تاریخ کی مستند ترین کتاب "تاریخ طبری" میں یہ واقعہ بعینہ موجود ہے۔

مورخ طبری لکھتے ہیں کہ البتہ کچھ لوگ حضرت امیرؑ کو اس نام سے یاد کئے جانے کے بارے میں ایک الگ واقعہ نقل کرتے ہیں۔جس کا لب لباب یہ ہے کہ '.

عبدالعزیز بن خازم اپنے والد سے روایت کرتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب سہل بن ساعدی جیسے بہترین مقرر سے کہا گیا کہ مدینہ کے امراء چاہتے ہیں کہ تم منبر پر بیٹھ کر علیؑ کو برا بھلا کہو اور توہین کیلئے انہیں بوتراب کے نام سے

یاد کرو تو سہل نے جواب دیا کہ خدا کی قسم جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کا یہ نام رکھا تھا۔ جب لوگوں نے پوچھا کیسے تو سہل نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ حضرت امیر علیہ السلام گھر آئے اور گھر سے ہوتے ہوئے استراحت کیلئے مسجد چلے گئے۔ اور وہاں جاکر سوگئے۔ کچھ دیر بعد جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم گھر تشریف لائے اور حضرت فاطمہ سے آپ کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مسجد میں سو رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم وہاں تشریف لے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مولائے متقیان وہاں سو رہے ہیں، چادر جسم سے اتر گئی ہے اور مٹی لگی ہوئی ہے۔ انہوں نے اس حال میں دیکھ کر آپ کو آواز دی "ابو تراب اٹھو"۔ پس خدا کی قسم اس اس نام سے انہیں صرف رسول اللہ نے یاد کیا اور یہ ان کے نزدیک حضرت امیرؑ کے سب سے پسندیدہ ناموں میں سے تھا۔

ہماری نظر میں دونوں واقعات صحیح ہیں کیونکہ یہ ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پہلی مرتبہ اس وقت مولا علیؑ کو بوتراب کہا جب آپ عمار بن یاسر کے ساتھ سو رہے تھے اور آپؑ کے قاتل کے بارے میں عالم غیب سے خبر دی اور فرمایا کہ شقی ترین شخص وہ ہے جو تمہاری داڑھی کو تمہارے خون سے رنگین کرے گا۔ دوسری مرتبہ آپ کو اس نام سے یاد کیا جب آپ مسجد میں سو رہے تھے چادر جسم سے ہٹ گئی تھی اور بدن خاکی ہوگیا تھا۔

اسی سلسلہ میں ابن ہشام ابن اسحاق سے ایک عجیب روایت نقل کرتا ہے۔ ابن اسحاق اسے اپنے جاننے والوں میں ایک جماعت سے روایت کرتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم علیؑ کو بوتراب کے نام سے یاد کرتے تھے کیونکہ جب بھی ان کے اور حضرت فاطمہؑ کے درمیان کوئی ناراضگی پیش آتی یا حضرت فاطمہ زہراؑ کوئی ایسا کام کرتیں یا کوئی ایسی چیز کہہ گذرتیں جو انہیں ناگوار گذرتی تو وہ احتراماً جناب سیدہ کو کچھ نہ کہتے۔ جب غصہ آتا تو مٹی اٹھا کر اپنے سر میں ڈالنا شروع کر دیتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی مولا کو ایسا کرتا دیکھتے تو سمجھ جاتے کہ فاطمہؑ اور آپ میں کسی بات پر اختلاف

ہوا ہے۔ یوں وہ آپ کو بوتراب کے نام سے یاد کرتے۔

ہم بڑے اطمینان اور وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ روایت گھڑی گئی ہے اس لئے کہ ابن اسحاق اپنی سیرت میں عروہ بن زبیر سے اسے روایت کرتا ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ روایت بھی عروہ سے کی گئی ہو۔ عروہ ایک ایسا شخص تھا جو جان بوجھ کر مولا علیؑ پر جھوٹ باندھتا تھا اور اس میں اکثر وہ اپنی خالہ حضرت عائشہؓ کا حوالہ دے دیا کرتا تھا۔ اور حضرت علیؑ و فاطمہؑ کے بارے میں حضرت عائشہؓ کا نقطہ نظر اور ان کا سلوک کس سے ڈھکا چھپا ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تمام تر توجہات کا مرکز بنیں جبکہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زیادہ تر عنایات علیؑ و فاطمہؑ پر ہوتی تھیں۔ جس کا اعتراف وہ خود بھی کرتی ہیں۔ پھر ہم حضرت خدیجہ کے بارے میں ان کے خیالات پر تفصیلی نگاہ ڈال چکے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جناب امیر علیہ السلام کے خلیفہ بنتے ہی انہوں نے تمام قرآنی آیات اور فرمان الٰہی کو پامال کرکے گھر سے باہر قدم رکھا اور مولا کے خلاف بغاوت کا پرچم لہرا کر اس گروہ کی سربراہی اور سرپرستی کی جس نے مسلمانوں کے خلیفہ سے جنگ کی تھی۔ لہٰذا یہ کام بھی ان سے بعید نہیں۔

پھر حضرت فاطمہ زہراؑ اپنے اس مثالی اخلاق و کردار کے ساتھ کیسے کوئی ایسا قدم اٹھا سکتی ہیں یا ایسی بات کہہ سکتی ہیں جسے وصئی رسولؐ پسند نہ کریں۔

امامؑ جنگ بدر میں

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مدینہ ہجرت کر جانا ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ وہ اس نئے شہر میں نئے اصحاب سے جا ملے تھے جنہوں نے جان و مال سے آپ کی مدد اور حمایت کرنے کا عزم کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آمد پر انہوں نے اتنا بھرپور استقبال کیا جس کی نظیر تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ روز بروز ان کے اور آپؐ کے تعلقات مستحکم ہو رہے تھے اور سارا شہر اسلام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ البتہ کچھ ایسے بھی سنگ دل لوگ تھے جو اسلام کا خول چڑھا کر بت پرستی کو دل میں سجائے ہوئے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو کھلم کھلا کفر و شرک پر باقی تھے۔ مدینہ کے اطراف میں یہودیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی یہ لوگ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آمد سے ناخوش تھے اور انہوں نے آہستہ آہستہ عربوں اور قبائلی علاقہ کے لوگوں کو مخالفت پر اکسانا شروع کر دیا تھا۔

ادھر مرسل اعظم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس وقت رکھ رکھاؤ ہی سے

معاملات کو حل کرنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے تمام چیزوں سے صرف نظر کیا لیکن ان لوگوں نے قریش کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے مدینہ پر چھاپہ مار قسم کے حملے شروع کر دیئے تھے۔ اور واضح سی بات ہے کہ اس نازک موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کوئی کمزور اور بے جان موقف اختیار نہیں کرنا چاہئے تھا لہٰذا مجبوراً آپ نے بھی جوابی کارروائیاں کیں جس کی زد میں ان کے تجارتی قافلے بھی آ گئے۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کھلے عام آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جہاد کرنے کا حکم دیا' ارشاد باری تعالیٰ ہوا۔

"اے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خدا کی راہ میں جہاد کرو تم اپنے سوا کسی اور کے ذمہ دار نہیں ہو لہٰذا مومنوں کو جہاد کی ترغیب دو عنقریب خدا کافروں کی ہیبت توڑ ڈالے گا اور خدا کا جلال اور اس کی سزائیں اس سب سے کہیں زیادہ سخت ہیں۔"

اس حکم کے بعد کئی سرایا بھیجے گئے اور کچھ جھڑپیں بھی ہوئیں لیکن ایک بڑی باقاعدہ جنگ کچھ عرصہ بعد ہوئی جسے تاریخ بدر کبریٰ یا دوسری بدر کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس جنگ نے قریش اور دوسرے قبیلوں پر ثابت کر دیا کہ جنگوں میں کامیابیاں اسلحہ اور طاقت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ خدا تعالیٰ پر ایمان اور عقیدے کی خاطر جانیں قربان کرنے سے حاصل ہوتی ہیں اور خدا کی کتاب کیا خوب کہتی ہے۔

"کتنی ہی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ خدا کی اجازت سے محدود اور مختصر لشکر بڑی بڑی فوجوں کو شکست دیدیتے ہیں۔" اور واقعی جنگ بدر میں بھی خدا تعالیٰ کی مرضی سے مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ایمان والوں کو ثابت قدم رکھا اور علیؑ و حمزہ جیسے افراد کے ہاتھوں قریش کو اس ذلت و خواری سے دوچار کیا کہ کوئی گھر بھی اس داغ سے محروم نہ رہ سکا۔ اس نصرت کی دھاک یہودیوں اور دوسرے عرب قبیلوں پر بھی بیٹھ گئی تھی۔

تاریخ جنگ بدر کی تفصیلات کچھ یوں لکھتی ہے کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم اپنے تین سو تیرہ اصحاب کے ساتھ قریش کے اس تجارتی قافلہ کے تعاقب میں نکلے تھے جو شام سے ہوکر مکہ واپس جارہا تھا۔ اتفاقاً جب مسلمانوں کے ان عزائم کی خبر ابوسفیان کو ملی تو اس نے ہزار منتخب شدہ گھڑ سواروں کا ایک جرار لشکر ترتیب دیا۔ اور اسے مدینہ کی جانب روانہ کردیا۔ اسلحہ میں غرق اس لشکر نے بدر کی سرزمین میں پہنچ کر ہی سکون کا سانس لیا۔ جب سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان لوگوں کی آمد کی خبر ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بارے میں مسلمانوں سے صلاح و مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ تاریخ لکھتی ہے کہ جب سب جمع ہوگئے اور نظر خواہی کی گئی تو سب سے پہلے حضرت عمر کھڑے ہوئے۔ انہوں نے قریش اور ان کے بھیجے ہوئے لشکر کی شان و شوکت پر شاندار تقریر کی اور مسلمانوں کو ان سے جنگ نہ کرنے کی نصیحت کی۔ حضرت عمر کے بعد مقداد اور پھر سعد بن معاذ کھڑے ہوئے۔ ان دونوں نے مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندگی کرتے ہوئے بارگاہ رسالت میں عرض کیا۔

"اے خدا کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ رب العزت کے حکم پر عمل درآمد شروع کردیجئے ہم آپ کے ساتھ ہیں آپ ہمیں جہاں کہیں بھی لے جائیں گے اپنے ساتھ ہی پائیں گے۔ اور ہم کبھی بھی بنی اسرائیل کی بھیڑوں کی طرح یہ بات زبان سے نہیں نکالیں گے کہ

"ہم یہاں بیٹھے ہیں تم اپنے خدا کے ساتھ جاکر جنگ لڑو۔"

ان دونوں اصحاب کی زبردست تقریر سن کر اور ان کا عزم و جزم دیکھ کر رسول عرب و عجم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں میں سے دو تین افراد کو قریش کے بارے میں مزید اطلاعات بہم پہنچانے پر مامور کردیا۔ یہ لوگ سرزمین بدر کے آس پاس کے علاقوں میں گئے اور قریش کے دو غلاموں کو پکڑ لائے جن سے قریش کی صحیح جنگی طاقت کا اندازہ ہوا۔

اس سے پہلے کہ جنگ شروع ہوتی جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم نے قریش کو خون خرابہ سے ڈرایا اور انہیں احساس دلایا کہ وہ کس سے لڑ رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شیریں گفتار قریش کے بہادر اور تجربہ کار جرنیل عتبہ کے دل میں اتر گئی اور اس نے قریش کو جنگ سے باز رکھنے کی کافی کوشش کی لیکن اقتدار کے نشہ میں چور ابوجہل کو قریش کی اتنی بڑی تعداد پر گھمنڈ ہوگیا تھا لہٰذا وہ عتبہ کو بزدلی کے طعنے دینے لگا جسے غلط ثابت کرنے کے لئے عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور بیٹے ولید کو میدان جنگ میں لے آیا جو قریش کے زبردست اور نامی گرامی پہلوان سمجھے جاتے تھے۔ جب مسلمانوں کی طرف سے جماعت انصار میں سے تین جواں مردان کے مقابلہ پر گئے تو انہوں نے ان سے لڑنے سے انکار کر دیا اور جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چاہا کہ خود قریش سے ان کے ہم وزن لوگوں کو مقابلہ پر بھیجیں۔ یہ سننا تھا کہ پیغمبر عرب وعجم نے ایک مرتبہ اپنے چچا زاد بھائیوں کی طرف دیکھا گویا کہ ان کے وجود سے آپ کو ڈھارس تھی اور شاید وہ لوگ بھی آپ کا ہاتھ بڑے شوق اور ولولہ سے بٹاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا'

"اے عبیدہ بن حارث' اے حمزہ بن عبدالمطلب اور اے علی بن ابی طالب اٹھئے!۔"

اس آواز کا سننا تھا کہ یہ لوگ مسکراتے چہروں کے ساتھ بجلی کی سی تیزی سے اٹھے اور اس انداز سے دشمن کے مقابلے پر گئے کہ ان کے جسموں میں ایمان کی حرارت اور یقین کی کھنک تھی۔ ان کے دل مطمئن اور پرسکون تھے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس مشن میں اپنا سب کچھ لٹا دینا ان کی آرزو تھی۔ اور بہرحال اس میں شک نہیں کہ اگر ہاشمیوں کی قربانیاں اور خدمات نہ ہوتیں تو اسلام اپنے آغاز ہی میں شکست سے دوچار ہو جاتا۔

خود بدر کی جنگ میں وہ پہلی اور کاری ضرب جس نے پانسہ پلٹ دیا اور کفار کی امیدوں پر پانی پھیر دیا انہی چچا زاد بھائیوں کے ہاتھ لگی تھی۔

یہ لوگ جب آگے بڑھے تو عتبہ ان لوگوں کو آتا دیکھ کر خوش ہوگیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ حضرت عبیدہ عتبہ کے مقابلے پر حضرت حمزہ شیبہ کی ٹکر پر'

اور حضرت علیؑ ولید سے لڑنے کے لئے گئے۔ حضرت حمزہ نے اپنے حریف کو موقع دیئے بغیر ہی زیر کرلیا اور اسی طرح مولائے متقیان نے بھی بہت جلد ولید کو واصل جہنم کیا لیکن حضرت ابو عبیدہ اور عتبہ درگیر رہے اور دونوں ایک دوسرے کو زخمی کر چکے تھے۔ حیدرکرار نے جو اپنے چچا زاد بھائی کا یہ حال دیکھا تو ان کی مدد کو گئے اور ایک ہی ضربت میں عتبہ کو دو ٹکڑے کرکے انہیں نجات دی۔ آپ پھر حضرت حمزہ کی مدد سے حضرت ابو عبیدہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حضور لے گئے وہاں پہنچ کر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا میرا نام بھی شہیدوں میں ہے حضور والا مقام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ یہ سننا تھا کہ ان کی خوشی کی انتہا نہیں رہی اور کچھ عرصہ بعد ہی زخموں کی تاب نہ لاکر وہ شہادت کے درجہ پر فائز ہوگئے۔ وہ مسلمانوں کے درمیان پہلے شہید تھے۔

ادھر قریش نے ان پہلوانوں سے مایوس ہوکر حنظلہ بن ابی سفیان کو بھیجا۔ لیکن شیرخدا نے ایک ہی ضربت میں اسے بدر کی ریت پر موت کی نیند سلادیا۔ اس کے بعد عاص بن سعید بن عاص اور دوسرے پہلوان بھی آئے لیکن آپ نے انہیں بھی واصل جہنم کیا۔

اپنے سرداروں کا یہ حال دیکھ کر قریش پر عجیب وحشت طاری ہوگئی اور ڈر کے مارے انہوں نے ابوجہل کو حفاظت کی غرض سے گھیرے میں لے لیا۔ اور بعد میں بھی کچھ لوگوں کو بھیجا جو حیدر کرار اور حضرت حمزہ کے تہ تیغ آتے رہے۔ اور پھر جنگ بھرپور انداز میں شروع ہوگئی اور دونوں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔

مشہور مورخ ابن ہشام اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ مسلمان قریش کی فوجوں پر بڑھ چڑھ کر حملہ کررہے تھے جن میں حضرت علیؑ و حمزہ پیش پیش تھے لیکن کہیں بھی حضرت ابوبکر و عمر کا ذکر نہیں ملتا جو سائبان میں جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہمراہ موجود تھے۔۔ جب خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور قریش کے حوصلے پست ہورہے تھے تو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم سائبان سے باہر نکلے آپ نے خدا سے دعا کی کہ کفار کے دلوں کو مسلمانوں کے رعب و دبدبے سے بھر دے۔ اور پھر ایک پتھر اٹھایا اور اسے قریش کی طرف پھینک دیا جس کے فوراً بعد وہ لوگ پسپا ہوگئے' ان کے سپاہی اسلحہ چھوڑ کر فرار کر گئے۔ اور اللہ تعالٰی نے مسلمانوں کو کامیابی کی نوید دی۔

"اس وقت کو یاد کرو جب خدا ملائکہ کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں لہٰذا مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔ بہت جلد میں کفار کے دل میں رعب و دبدبہ ڈال دوں گا۔ لہٰذا انہیں مار ڈالو اور نیست و نابود کر دو اس لئے کہ انہوں نے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے اور جو لوگ خدا اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عداوت کرتے ہیں وہ جان لیں کہ خدا بہت سخت سزا دینے والا ہے۔

شیعوں میں سے شیخ مفید اور اہلسنّت کے دانشمند واقدی اور عبدالفتاح لکھتے ہیں کہ جنگ بدر سو فیصد مسلمانوں کے حق میں تھی۔ اور جتنے لوگ مرے ان میں سے آدھے صرف شیر خدا کی تلوار سے کیفر کردار کو پہنچے اور باقی کا دوسرے مسلمانوں نے کام تمام کیا۔

اہلسنّت کے دانشمند امام سیوطی اپنی تفسیر کی کتاب درمنثور میں اس آیہ شریفہ کو نقل کرتے ہیں۔ "کیا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیئے ان کی طرح سمجھیں جو زمین پر فساد پھیلاتے ہیں۔" اور اس کے ذیل میں رقم کرتے ہیں کہ ابن عساکر ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آیہ شریفہ میں عمل صالح انجام دینے والوں سے مراد علی بن طالب و حمزہ و ابوعبیدہ بن حارث ہیں جبکہ مفسدین کے صحیح مصداق عتبہ و شیبہ و ولید ہیں۔

"ذخائر عقبی"، "ریاض النضرۃ" اور قزوینی کی "فضائل خمسہ" میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بدر کی جنگ کے دن ملائکہ پکار رہے تھے "لاسیف الاذوالفقار ولا فتی الا علیؑ" تلواروں میں صرف ذوالفقار ہے اور جواں مردوں میں صرف علیؑ ہیں۔ خود "فضائل خمسہ" طبری جیسے مشہور مورخ سے فاتح خیبر کی شجاعت تفصیل سے نقل کرتی ہے اور یہ بھی رقم

کرتی ہے کہ اس دن یہ آواز بھی سنی گئی ”لاسیف الا ذوالفقار ولا فتی الا علیؑ“

بہرحال مورخین اور دانشمند بدر کی جنگ میں امیر المومنین کی شجاعت اور دلیری کا تذکرہ کھل کر کرتے ہیں اور سوائے ہیکل جیسے متعصب افراد کے کوئی آپ کی ان بے بہا خدمات سے چشم پوشی نہیں کرتا۔

امامؑ جنگ احد میں

احد کی جنگ ۳ ہجری میں ہوئی۔ اس جنگ میں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایات پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کو بڑی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ جنگ بدر نے قریش سے سکھ و اطمینان چھین لیا تھا اور پورے شہر کو غم و رنج میں ڈبو دیا تھا۔ جس شہر کے نوجوان اور پہلوان قبرستانوں کی زینت بن گئے تھے وہ شہر اتنا داغدار اور سنسان ہوگیا تھا کہ اس نے اپنی عورتوں تک کو چیخنے اور رونے سے منع کر دیا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد خود یہ لوگ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے اور عورتوں کو نوحہ خوانی کے لئے بلواتے تھے۔ شاید اس لئے کہ یہ گریہ و زاری جذبات کو بھڑکاتی اور انتقام کی اس آگ کو مزید شعلہ ور کرتی تھی جو ان کے سینوں میں بھڑک رہی تھی۔ ساتھ ساتھ یہ لوگ جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ لہٰذا ایک سال کی بھرپور تیاری کے بعد انہوں نے یہودیوں کو اپنا ہم پیمان بنایا' اسلام دشمنوں کو یکجا کیا اور آس پاس کے تمام قبیلوں کو ساتھ ملا کر مدینہ پر چڑھائی کا پروگرام بنایا۔ بظاہر عباس بن عبدالمطلب بھی ان کے ساتھ دکھائی دیتے تھے لیکن وہ

ان کے درمیان رہ کر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو قریش کے عزائم سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ لہذا پروگرام فائنل ہونے پر انہوں نے تمام اطلاعات خفیہ طور پر بہم پہنچائیں اور سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسی وقت سے تیاریاں شروع کر دیں۔

ادھر قریش اسلحہ میں غرق، تین ہزار کے لشکر کو لے کر مدینہ کے لئے روانہ ہوگئے ان میں پچیس عورتیں بھی تھیں جن میں ابوسفیان کی بیوی اور عتبہ کی بیٹی ہندہ بھی دکھائی دیتی تھی۔ یہ لوگ جب "ابواء" کے مقام پر پہنچے اور گزر جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی والدہ ماجدہ کی قبر سے ہوا تو انتقام اور نفرت کے جذبات ابھر آئے اور انہوں نے چاہا کہ قبر کو کھودیں اور لاش کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیں لیکن قریش کے بزرگ ڈرتے تھے کہ کہیں یہ غلط رسم خود قریش میں نہ رخنہ ڈال لے۔ لہذا انہوں نے ان نوجوانوں کو اس کام سے روک لیا۔ یہاں سے آگے بڑھ کر انہوں نے سفر جاری رکھا اور "سفح جبل" کے مقام پر قیام کیا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ان لوگوں کے آنے کی خبر ہوئی تو آپ نے مسلمانوں کو جمع کر کے درپیش خطرے سے آگاہ کیا اور اس بارے میں ان سے صلاح و مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ مسلمانوں کی آراء مختلف تھیں۔ روایات صراحت سے بیان کرتی ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے زیادہ تر مسلمانوں کا نقطہ نظر دریافت کرلیا تو ان سے خطاب کیا۔ انہیں صبر و ضبط کی تلقین کی اور یقین دلایا کہ اگر وہ بے جگری سے لڑیں گے اور ڈٹے رہیں گے تو کامیابی ان کے قدم چومے گی۔

بہرحال آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان لوگوں کو لے کر شہر سے باہر نکلے جو ہزار کے لگ بھگ تھے۔ ابھی آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم شہر کی حدود سے باہر ہی نکلے تھے کہ منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو واپس لے کر آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے جدا ہوگیا۔

جبکہ ایک روایت کے مطابق مسلمانوں کی تعداد سات سو تھی لیکن جب پیغمبر

اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدینہ سے نکلنے لگے تو خبر ملی کہ عبداللہ بن ابی کے ہم پیان یہودی جو تین سو کی تعداد میں تھے' آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہمراہی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ کہہ کر انہیں واپس کر دیا کہ

"ہم شرک کے مقابلہ میں مشرکوں کی مدد نہیں لیا کرتے۔"

نتیجتاً آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انہی سات سو اصحاب پر اکتفا کیا اور احد کے مقام تک پیش قدمی کی۔ یہاں پہنچ کر آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مسلمانوں کو تیار کیا اور صفوں کو صحیح انداز میں ترتیب دیا۔ نیز پشت پر موجود ٹیلہ پر پچاس تیر انداز نصب کر دیئے۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انہیں سختی سے ہدایت کر دی کہ اگر کفار حملہ کریں تو انہیں تیر باران کرنا لیکن مسلمانوں کے جنگ جیتنے کی صورت میں بھی مورچے خالی نہ کرنا۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پورے لشکر کو اس طرح ترتیب دیا جو عسکری تنظیم کا اعجاز ہے۔

ادھر قریش نے اپنا پرچم بنی عبدالدار کے خاندان کو سونپا اور ان کے درمیان سے طلحہ بن طلحہ نامی پہلوان آگے بڑھا اور اس نے اپنا مد مقابل طلب کیا۔ مسلمانوں کی جانب سے مولائے کائنات اس کے مقابلہ پر گئے۔ آپ نے بڑھ کر تلوار کی ایک ایسی ضربت لگائی کہ خون میں نہا کر وہ واصل جہنم ہوا۔۔ اس کے مرتے ہی اس کا بھائی عثمان بن طلحہ رجز پڑھتا ہوا آگے بڑھا اور پرچم ہاتھ میں اٹھالیا۔ اس کی پشت پر عورتیں دف بجا رہی تھیں اور گا گا کر اپنا تعارف کرا رہی تھیں۔ وہ حسن کے اظہار کے ساتھ قریش کے سپاہیوں سے یہ کہہ رہی تھیں۔

"اگر ڈٹے رہے تو بانہوں میں لیں گے اور بھاگ گئے تو شکل بھی نہ دیکھیں گے۔"

عثمان بن طلحہ پرچم لے کر آگے بڑھا ہی تھا کہ حضرت حمزہؑ اس کی داد رسی کے لئے گئے اور اس کا کام تمام کیا۔ جب تیسرا بھائی آیا تو اس دفعہ شیر خدا حضرت علیؑ آگے بڑھے۔ آپ نے نہ صرف اسے بلکہ اس گروہ کے آٹھ نو

افراد کو موت کے گھاٹ اتارا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ پرچم اٹھانے والے گروہ میں بنی عبد الدار کے خاندان کے نو افراد تھے جنہیں صرف حضرت امیر علیہ السلام نے کیفر کردار تک پہنچایا[1]۔

زیادہ تر روایتوں میں ہے کہ جب اس گروہ کے تمام افراد مارے گئے تو جو بھی اس جھنڈے کو اٹھانے کی غلطی کرتا' ذوالفقار کی زد میں آجاتا۔ یہ سلسلہ اس حد تک جاری رہا کہ کسی میں اس گرے ہوئے پرچم کو اٹھانے کی جرات نہ رہی۔ خوف و ہراس پورے لشکر پر چھا گیا۔ اور قریش کی عورتیں بھی مسلمان فوجوں کی دسترس میں آگئیں البتہ انہوں نے صنف نازک پر ہاتھ اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔

نہج البلاغہ کی شرح میں واقدی کے یہ کلمات نقل کیے گئے ہیں "وہ کامیابی جو خداوند عالم نے احد کی جنگ میں مسلمانوں کو عطا کی تھی شاید وہ کسی اور جنگ میں انہیں نصیب نہ ہوتی لیکن بدقسمتی سے انہوں نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کی اور مال غنیمت کی طرف لپک گئے۔"

ادھر ان تیر اندازوں نے جب قریش کے سپاہیوں کو فرار ہوتے اور اپنے بھائیوں کو مال غنیمت کی طرف دوڑتے دیکھا تو انہوں نے بھی خلاف ورزی کا یہ سلسلہ جاری رکھا اور مورچے خالی کر دیئے۔ اور آٹھ نو افراد کے علاوہ وہاں کوئی باقی نہ بچا۔

قریش کو شکست ہو چکی تھی۔ وہ واپس ہو رہے تھے کہ اچانک ان میں سے ایک تجربہ کار جرنیل خالد بن ولید کی تند و تیز نگاہ اس چوٹی پر پڑی اور خلاف معمول اس نے ان چند افراد کے سوا اسے خالی پایا۔ اس نے موقع مناسب جان

---

[1] یہی چیز تاریخ ابن اثیر' ارشاد مفید' تاریخ طبری اور تفسیر قمی میں بھی ملتی ہے۔

کر دو سو سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا ارادہ کرلیا۔ ادھر جب ان لوگوں نے دشمن کو حملہ کرتے اور اپنی طرف آتے دیکھا تو پہلے تو انہیں خوب تیرباران کیا اور جب وہ لوگ بالکل نزدیک آگئے تو تلواریں نکال لیں اور جنگ کرتے ہوئے عزت کے ساتھ موت کی نیند سوگئے۔ خالد نے ان سے فارغ ہوکر جب پیٹھ پیچھے سے ان لوگوں پر حملہ کیا جو دنیاوی چیزیں سمیٹنے میں مصروف تھے تو چاروں طرف سے دشمن کو آتا دیکھ کر وہ گھبراگئے اور تمام قدریں طاق نسیاں میں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس دوران امیرالمومنین علیہ السلام کی تمام تر توجہات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مرتکز تھیں۔ ہر سمت سے ان پر حملے ہورہے تھے اور آپ کی انتھک کوششوں کے باوجود وہ کچھ زخم لگنے کے باعث بیہوش ہوگئے تھے۔

شیخ مفید اپنی کتاب "ارشاد" میں ابن مسعود کی یہ روایت رقم کرتے ہیں کہ صرف مولائے کائنات علیہ السلام' ابودجانہ اور سہل بن حنیف جنگ احد میں ثابت قدم رہے اور آخری وقت تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمراہی کرتے رہے۔ ان لوگوں نے جناب خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھیرے میں لے لیا تھا اور دشمن کے حملوں کو دفع کررہے تھے۔۔۔ جب جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوش آیا اور انہوں نے جناب امیر علیہ الصلوۃ والسلام سے لوگوں کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ انہوں نے اپنے کئے ہوئے وعدوں کا احترام نہ کیا اور جنگ کے میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور اسی انتشار کو دیکھ کر عرب کے بدو کبھی فرداً فرداً اور کبھی ٹولیوں کی صورت میں خدا کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملے کرتے تھے اور اگر اس وقت علیؑ بے جگری کا ثبوت نہ دیتے تو انہیں بچانا مشکل ہوجاتا۔

شیر خدا نے جان کی بازیاں لگاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اٹھنے والے ہر ہاتھ اور بڑھنے والی ہر تلوار کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ اور اس وقت جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا جب زیادہ تر مسلمان اور اصحاب ان سے مایوس ہوچکے تھے۔ آپ نے صرف بنی سفیان بن عوف کے واحد خاندان سے دس آدمیوں کو تہ تیغ کیا۔ اس بہادری اور

شجاعت کو دیکھ کر فرشتے بھی دنگ رہ گئے اور جبرئیل امین نے بارگاہ رسالت میں دست بستہ عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جانثاری اور فداکاری پر تو فرشتے بھی حیران ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ علیؑ کیونکر ایسے نہ ہوں جبکہ وہ ہم سے ہیں اور ہم ان سے۔ جبرئیل نے کہا کہ اور میں آپ دونوں سے ہوں۔"

اسی دن جب "لاسیف الاذوالفقار ولافتی الاعلی" کی آوازیں سنائی دیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ جبرئیل ہیں۔

یہ حدیث راویوں کی ایک جماعت سے موصول ہوئی ہے اور علماء کے نزدیک یہ مشہور احادیث میں سے ہے۔

اس بارے میں نہج البلاغہ کی شرح کے مصنف رقمطراز ہیں کہ' "میں نے مغازی بن اسحاق کے بعض نسخوں کا مطالعہ کیا اور اپنے استاد عبدالوہاب بن سکسینہ سے دریافت کیا کہ کیا یہ حدیث صحیح ہے۔۔؟ جب انہوں نے اقرار کرلیا تو میں نے مزید پوچھا کہ پھر کیوں صحاح ستہ میں اسے نقل نہیں کیا گیا۔۔؟

انہوں نے بھی سوالیہ انداز میں پوچھا کہ کیا صحاح ستہ میں تمام صحیح احادیث کو جمع کرلیا گیا ہے۔۔!!! پھر فرمانے لگے کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کتابوں کے لکھنے والوں نے بہت سی صحیح احادیث کو نظر انداز کیا۔"

صحاح ستہ کے برخلاف اہلسنت کی دوسری معتبر کتابیں جن میں ریاض النضرۃ (ج ۲)' مرقات علی بن سلطان' مناقب احمد' ہیثمی کی مجمع الزوائد اور تاریخ طبری وغیرہ شامل ہیں' اسے نقل کرتی ہیں۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لکھنے والے متفق ہیں کہ جو مثالی کردار علیؑ احد میں پیش کرگئے اس کی نظیر بھی انسانیت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ اپنی ذات کو بھلا کر خدا کے رسول کی حفاظت میں مگن تھے۔ ان کے شانے خون سے سرخ تھے اور تلوار میں بجلی کی سی تیزی تھی۔ جو پہلوان ان کے

نزدیک آتا جہنم کا ایندھن بن جاتا اور جو گروہ ان سے ٹکراتا پاش پاش ہو جاتا۔

اس جنگ میں حضرت حمزہ نے بھی تلوار کے کافی جوہر دکھائے۔ جہاں تک اور لوگوں کا تعلق ہے اس بارے میں مشہور مورخ طبری اپنی تاریخ میں ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ حضرت انس نے حضرت عمر اور طلحہ بن عبیداللہ سے پوچھا کہ تم لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہو۔؟

انہوں نے یہ جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید کر دیئے گئے ہیں۔ اس پر انس نے یہ کہا کہ جاؤ اسی راہ میں جان دے دو جس مشن کی تکمیل کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہوئے تھے۔ جب کسی نے بھی کوئی حرکت نہ کی تو وہ تنہا اٹھے ' میدان جنگ کی طرف بڑھے اور بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔

اس چیز کو خود طبری اپنی اسی تاریخ کی تیسری جلد کے ص ۲ پر مختلف اندز سے لکھتے ہیں۔ وہ اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ لوگوں میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرنے کی افواہ پھیل گئی تھی اور ڈر کے مارے وہ پہاڑیوں پر چڑھ گئے تھے۔ انہی لوگوں میں حضرت ابوبکر و عمر بھی تھے۔ ان میں سے کسی نے یہ جملہ کہا کہ ”اے کاش کوئی ہوتا جو عبداللہ بن ابی کے ذریعہ ابوسفیان سے ہماری وساطت کرا دیتا۔۔ اے لوگو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مارے جاچکے ہیں اور اس سے پہلے کہ دشمن تمہارا تہس نہس کرے ' واپس ہو جاؤ“۔

جب انس کے کانوں میں یہ آواز گئی تو انہوں نے لوگوں کے ضمیروں کو جھنجھوڑا اور انہیں رسالت کے مقصد پر مرمٹنے کی تاکید کی۔

تاریخ ضبط کرتی ہے کہ حضرت انس کے جسم پر ستر ضربیں وارد ہوئیں اور اگر ان کی بہن ان کی شناخت نہ کراتیں تو انہیں پہچاننا مشکل ہو جاتا۔

کچھ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیۂ شریفہ جنگ احد کے موقع پر نازل ہوئی۔

”محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو صرف رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت

سے انبیاء و مرسلین گزر چکے ہیں پس اگر وہ وفات پاگئے یا مار دیئے گئے تو تم لوگ پیٹھ کرلو گے اور جو ایسا کرے گا وہ خدا کا بال بھی بیکا نہ کرسکے گا۔"

جہاں تک حضرت ابوبکر کا تعلق ہے طبری کی روایت نہ یہ تصریح کرتی ہے کہ انہوں نے جنگ سے فرار کیا اور نہ رقم کرتی ہے کہ انہوں نے جنگ میں حصہ لیا۔ لیکن نہج البلاغہ کی شرح میں یہ مرقوم ہے کہ جب مشرکین کی طرف سے عبدالرحمن بن ابی بکر نے اپنا مد مقابل طلب کیا اور حضرت ابوبکرؓ نے جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مقابلہ کرنے کی اجازت چاہی تو انہوں نے یہ کہہ کر روک دیا کہ "بیٹھو، ہم تمہاری زندگی سے لطف اندوز ہورہے ہیں"۔ البتہ حضرت عثمان کے بارے میں یہی تاریخ طبری رقم کرتی ہے کہ وہ دو افراد کے ساتھ میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور خوف سے چہروں کو بھی چھپالیا تھا۔

بہرحال اس میں کسی کو تامل نہیں کہ کم و بیش زیادہ تر اصحاب میدان جنگ سے جاچکے تھے اور مولائے کائنات اور ایک دو اصحاب کے علاوہ کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ اور جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلانے پر بھی کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جواب نہیں دیا۔

قریش کے ساتھ اس دوسری جنگ میں سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے قریبی دوستوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ انہی میں حضرت حمزہ سرفہرست تھے۔ انہیں ایک ایسے سیاہ فام حبشی نے شہید کیا جسے خاص طور پر ابوسفیان کی بیوی نے اس کام کے لئے مامور کیا تھا۔

شہادت کے بعد بھی ان لوگوں نے اس وحشت گری کو جاری رکھا اور نہ تنہا ہندہ بلکہ ابوسفیان نے بھی حضرت حمزہ کے کلیجہ کو چبایا[۵۸] مصر کے مشہور دانشور استاد عبدالفتاح لکھتے ہیں کہ علیؑ اور اولاد علیؑ کی دشمنی و عداوت کا ثبوت نصف صدی کے گزرنے سے پہلے ہی مل جاتا ہے جب ابوسفیان کا پوتا یزید اپنے

---

[۵۸] استاد عبدالفتاح

دادا کے نیزے کی جگہ اپنے ہاتھ کی چھڑی سے سرور شہیداں حسین بن علیؑ کے مبارک ہونٹوں سے گستاخی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ دراصل یہ اس کے خاندان کی ساخت تھی۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ردعمل اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قہر آمیز تاثرات بڑی تفصیل سے قلمبند کرتی ہے۔

جب جنگ ختم ہوئی اور مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت امیرؑ کے ہمراہ واپس ہوئے تو جناب سیدہ نے دوسری خواتین کے ہمراہ آپ کا استقبال کیا[1]۔

البتہ شیخ مفید کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ پہنچنے پر انہوں نے آپ کا استقبال کیا۔

ابن اثیر نقل کرتا ہے کہ حضور والا مقام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسم زخمی تھا۔ مولائے کائنات پانی ڈال کر زخموں کو دھو رہے تھے اور خون کسی صورت نہیں رک رہا تھا۔ جناب سیدہ آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حالت دیکھ کر رونے لگیں۔ ان کا ہاتھ زخموں پر لگنا تھا کہ خون رک گیا۔

اسی طرح پیغمبر اکرم کے وارث اور وصی کا ہاتھ خونی تھا اور تلوار سرخ تھی۔ لیکن پھر بھی غزالی جیسے متعصب لوگ آپ کی جانثاری اور فداکاری کے اس مثالی کردار کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اور آپ کا نام لینا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اگر یہ گراں بہا خدمات نہ ہوتیں تو اسلام کا نام و نشان بھی مٹ جاتا۔

---

[1] واقدی کا ادعاء

امامؑ جنگ خندق میں

جنگ خندق جسے جنگ احزاب بھی کہتے ہیں، احد کی جنگ کے دو سال بعد ہوئی۔ ان دو سالوں کے درمیان بھی چھوٹے چھوٹے تصادم اور معرکہ ہوئے جن میں سے زیادہ تر کو امیرالمومنین حضرت علیؑ بن ابی طالب نے سر کیا۔ آپ ہر معرکہ میں بہادری و شجاعت کی ایک نئی مثال قائم کرتے اور ان تمام مشکل لحوں میں اسلام و مسلمانوں کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھتے۔

تاریخ اس جنگ کے بارے میں لکھتی ہے کہ سرزمین حجاز اور گردونواح کے تمام عرب قبیلوں اور مدینہ کے یہودیوں نے متفقہ طور پر مدینہ پر چڑھائی کا پروگرام بنایا تھا اور اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صفحہ ہستی سے مٹانے کا فیصلہ کیا تھا۔ بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ کے یہودی قبیلہ بنی قریظہ کے کچھ کہن سال سازشی افراد کو شہر سے نکال باہر کیا تھا۔ ان لوگوں نے قریش کے

پاس جا کر پناہ لی اور بہت جلد مکہ کے سرداروں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ زیادہ سے زیادہ قدرت و طاقت کے ساتھ مدینہ پر حملہ کیا جائے اور وہ کچھ حاصل کر لیا جائے جو بدر و احد میں نصیب نہ ہو سکا۔ اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے جگہ جگہ طبل جنگ بجایا اور پورے دھڑلے سے سرمایہ گذاری اور پبلسٹی کی یہاں تک کہ سر سے پاؤں تک اسلحہ میں ڈوبے ہوئے دس ہزار سپاہی تیار ہو گئے۔ ان میں سے چار ہزار صرف مکہ سے تھے جن کی سربراہی ابو سفیان کر رہا تھا۔ ادھر جب سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ان لوگوں کے ناپاک عزائم کی خبر پہنچی تو آپ نے تمام مسلمانوں کو مسجد میں جمع کر کے ان سے خطاب فرمایا۔ اس خطرے سے آگاہ کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انہیں جہاد کرنے اور اس اہم فریضہ میں صبر و پائیداری سے کام لینے کی تاکید فرمائی۔

دشمن سے مقابلہ کرنے کی تدابیر کے سلسلہ میں حضور والا مقام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مسلمانوں سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس بارے میں مختلف آراء سامنے آئیں لیکن ہر رائے میں کوئی نہ کوئی نقص پایا جاتا یا کسی کو اعتراض درپیش ہوتا۔ آخری نظریہ حضرت سلمان فارسی کا تھا اور وہ شہر کے اطراف میں خندق کھودنے کی تجویز تھی۔ سب نے اسے بے حد پسند کیا اور اتنی اچھی رائے پیش کرنے پر حضرت سلمان کو بہت سراہا گیا۔

اس تعریف و توصیف کے باعث کبھی مہاجروں نے انہیں اپنا کہا اور کبھی انصار نے انہیں اپنے سے منسوب کیا لیکن ان تعجب آمیز لمحوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سب کو مسحور کر دیا اور یہ تاریخی جملہ فرمایا۔

سلمان منا اهل البیت

سلمان ہم اہل بیت سے ہیں

ایک اور روایت کے مطابق حضور اکرمؐ نے مسلمانوں کو سلمان فارسی کہنے سے منع فرمایا اور سلمان محمدیؐ کہنے کی سفارش کی۔

شاید حضور والا مقام اس طرز گفتگو سے بتانا چاہتے تھے کہ ایمان اور کام

میں خلوص انسان کو بلندیوں تک پہنچاتا ہے نہ خاندان اور حسب و نسب اور اگر سلمان ؓ میں ایمان، اخلاص اور اسلام کی راہ میں مرمٹنے والا جذبہ نہ ہوتا تو ہرگز انہیں یہ رتبہ نہ ملتا۔

بہر حال حضرت سلمان کی اس تجویز پر عملدرآمد شروع ہوگیا اور شہر کے چاروں طرف کھدائی ہونے لگی تاریخ طبری میں مرقوم ہے کہ جناب ختمی مرتبت صلی علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو دس دس افراد کی ٹولیوں میں بانٹ دیا تھا اور ہرایک کو تقریباً چالیس گز زمین کا ٹکڑا سونپا گیا تھا تاکہ یہ کام نظم وضبط اور خوش اسلوبی سے انجام پائے۔

خود آنحضرتؐ بھی اور مسلمانوں کی طرح خندق کے کام میں مشغول رہتے۔ ان میں حضرت علیؑ بھی پیش پیش تھے البتہ کچھ ایسے بھی راحت طلب اور بے ایمان لوگ تھے جو بہانہ بناکر جناب رسولؐ سے اجازت لے گئے تھے اور اس انتہائی کٹھن اور صبر آزما لمحات کو ہنسی خوشی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بسر کر رہے تھے چنانچہ ان کی مذمت میں آنحضورؐ پر کچھ آیات نازل ہوئیں[۱]۔

مسلمانوں کی انتھک محنت کے نتیجہ میں کچھ ہی دنوں میں کھدائی کا کام مکمل ہوگیا اور ایک گہری اور چوڑی سی خندق مدینہ کے اطراف میں نظر آنے لگی۔ جس کے پیچھے مسلمان سپاہی مورچے لئے دشمن کا استقبال کررہے تھے۔

ادھر سے وہ لوگ چلے آرہے تھے جو اپنی قدرت و طاقت پر مغرور ہوچکے تھے اور مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن جب شہر سے نزدیک ہوئے تو اتنی بڑی اور گہری خندق دیکھ کر ان کے ہوش و حواس جاتے رہے یہ ایسی چیز تھی کہ ان کے جانوروں کو بھی اس سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ ناچار انہوں نے مدینہ کی پشت پر موجود یہودی قبیلہ بنی قریظہ سے مذاکرات کئے اور مسلمانوں سے توڑ کر انہیں اپنے ساتھ ملا لیا اب نتیجہ

---

[۱] تاریخ طبری اور دوسری تاریخیں۔

یہ نکلا کہ وہ مسلمان جو پہلے ہی غذا و خوراک اور دوسری ضروریات زندگی کی کمیابی کا شکار تھے وہ اب بالکل محروم ہوکر چاروں طرف سے گھر گئے تھے۔ انہوں نے بڑی محنت و مشقت کے بعد خندق کھودی تھی اور دن رات اس کی پہرہ داری میں لگے رہتے تھے لیکن اس پیمان کے بعد وہ اپنے گھر اور بیوی بچوں کی طرف سے بھی سخت پریشان رہنے لگے تھے اس لئے کہ یہودی اور منافق آزادانہ انداز سے مدینہ کے گلی کوچوں میں دندناتے پھرتے اور اس طرح پورے مدینہ میں خوف و خطرے کا احساس بھوک و پیاس کی شدت کے ساتھ امنڈ آیا تھا۔

قرآن مجید میں ان لمحات کی تصویریوں کھینچی گئی ہے۔

"اس وقت کو یاد کرو جب وہ چاروں طرف سے تم پر ٹوٹ پڑے تھے، جب تمہاری بینائی جاتی رہی تھی، جانیں شہ رگ میں اٹک گئیں تھیں اور تم خداوند پاک کے بارے میں شکوک و شبہات کرنے لگے تھے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب مومنوں کو آزمایا جاتا اور ان کا کٹھن امتحان لیا جاتا ہے اور انہی لمحات میں منافق اور بیمار دل لوگ یہ افواہیں اڑاتے تھے کہ خدا و رسولؐ نے ہمیں صرف دھوکہ دیا ہے[۵۵]۔"

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام مشکلات کا مقابلہ اپنی حسن تدبیر اور استقامت سے کیا۔ آپ نعیم بن مسعود نامی شخص کے ذریعہ (جو اسی دن مسلمان ہوا تھا) بنی قریظہ اور حملہ آور اتحادیوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس ٹوٹ پھوٹ کے بعد اتحادی پیغمبر اسلام کی حکمت عملی سے خوفزدہ ہوگئے لہٰذا اس ڈر سے کہ کہیں آپس میں بھی اختلافات نہ ہوجائیں انہوں نے اپنے پہلوانوں کو حملہ کے لئے آگے بڑھایا۔ اتفاقاً کچھ لوگ خندق عبور کرنے میں کامیاب بھی ہوگئے۔ انہی میں عربوں کا وہ مانا ہوا کار آزمودہ پہلوان عمرو بن عبدود بھی تھا جو تاریخ شناس

---

۵۵ سورۂ احزاب آیۂ نمبر ۱۰

لوگوں کی نظر میں ہزار سپاہیوں کے برابر تھا یہ بات اس نے جنگ کے میدان میں ثابت کر دکھائی تھی اور اس کی شہرت اور اس کا رعب کسی سے پنہاں نہ تھا۔

اس نے آتے کے ساتھ ہی جنگ کا نعرہ مارا اور مسلمانوں کو لڑنے کی دعوت دی یہ سنتے ہی شیر خدا کھڑے ہوئے اور جناب رسولؐ خدا سے اجازت چاہی۔ آنحضرتؐ نے انہیں بٹھا دیا اور مسلمانوں کو اس کے مقابلہ پر جانے کا حکم دیا لیکن کوئی کھڑا نہ ہوا[۱] عمر نے دوسری مرتبہ آواز دی۔ جناب امیر پھر کھڑے ہوگئے لیکن جناب ختمی مرتبتؐ نے انہیں بٹھایا اور ایک بار پھر مسلمانوں کو اس سے لڑنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جو اس سے لڑنے کے لئے جائے گا میں اس کے لئے جنت کی ضمانت لیتا ہوں لیکن افسوس اس دفعہ بھی کسی نے جنبش نہ کی اور عمر کی ہیبت ان سب پر چھائی رہی۔ جب تیسری دفعہ اس دشمن خدا نے للکارا اور علیؑ کے سوا سب بت بنے رہے تو خدا کے حبیبؐ علیؑ سے نوجوان کو اس دیو ہیکل پہلوان کے مقابلہ پر بھیجنے کے لئے تیار ہوگئے۔ آنحضرت نے اپنے ہاتھوں سے آپ کو زرہ پہنائی، آپ کے سر پر عمامہ رکھا، اپنی خاص تلوار آپ کو عطا کی اور

---

[۱] تاریخ میں ملتا ہے کہ عمرو بن عبدود کے پکارنے پر جب مسلمانوں میں سے کوئی اس کے مقابلہ پر نہ آیا تو اس نے کہا کہاں ہے وہ تمہاری جنت جس میں جانے کی تم تمنا کرتے تھے۔ کیا کوئی نہیں جو اس میں جانا چاہے۔ آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو پھر پکارا لیکن کسی نے کوئی جواب نہ دیا ادھر عمر بلا بلا کر تھک گیا تو اس نے ایک شعر پڑھا سیرۃ الحلبیہ اور ارشاد مفید میں نقل ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

لقد بحبحت من النداء بجمعیم هل من مبازر
انی کذلک لم ازل مسرعا نحو الهز الهز
ان الشجاعه فی الفتی والجود خیر الغرائز

میں ان کے اجتماع میں پکار پکار کر تھک گیا اور میرا جبڑا دکھ گیا کہ کوئی ہے مقابلہ کرنے والا لیکن میرے لڑائی پر مستعد ہونے کے باوجود کوئی نہیں آیا حالانکہ بہادری اور شجاعت ہی انسان کی بہترین صفات ہیں۔

حضور اکرمؐ جناب امیرؑ کو عمر کے مقابلہ پر نہیں بھیجنا چاہتے تھے لیکن جب مسلمانوں میں سے کوئی تیار نہ ہوا تو پھر انہوں نے آپ کو بھیجا۔

روانہ کر کے دونوں ہاتھ بارگاہ ربوبی میں اٹھا دیئے پھر عرض کی'

"پالنے والے تو نے بدر کی سرزمین پر عبیدہ اور احد کے میدان میں حمزہ کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ اب یہ میرا بھائی اور چچا زاد علی ہے۔ اے خدا! مجھے تنہا نہ چھوڑ اور تو ہی سب سے اچھا وارث ہے۔"

ان دعاؤں کے سائے میں پیغمبر خدا نے اپنے چچا زاد بھائی کو رخصت کیا۔ جناب امیر دشمن کی طرف بڑھے چلے جاتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں قہر و غضب کی چمک اور دل میں اس دشمن خدا کو ختم کرنے کی تمنا تھی اور زبان پر وہ اشعار تھے جن میں وہ عمر سے خطاب فرما رہے تھے'

"جلد بازی سے کام نہ لو! تمہاری آواز کا جواب دینے والا اپنے اختیار وارادہ اور عقل و دانش کے ساتھ تمہاری طرف آ رہا ہے۔ اور اس سچائی و صداقت کو لئے جو کامیابی کا راز اور نجات کا دروازہ ہے۔ میری تمنا ہے کہ تم پر وہ ضرب پڑے کہ مردوں میں قرار پاؤ اور عورتیں تمہاری لاش پر مرثیہ کہیں"

عمر فاتحانہ انداز سے کھڑا آپ کو دیکھتا رہا پھر پیار و محبت سے بولا'

"میرے بھتیجے تمہارے علاوہ کسی اور کو مجھ سے لڑنے کے لئے آنا چاہیے۔ تمہارے چچاؤں میں ایسے ہیں جو تم سے زیادہ طاقتور ہیں پھر تم میرے محترم و عزیز دوست کے بچے ہو لہٰذا میں تمہاری جان نہیں لینا چاہتا۔"

امیرالمومنین نے بڑھ کر جوانمردی سے کہا'

اے عمر میں نے سنا ہے کہ تم تین باتوں میں سے ایک کو ضرور قبول کرتے ہو۔ اس نے کہا بولو جناب امیر علیہ السلام نے سب سے پہلے اسے اسلام کی دعوت دی۔ وہ سن کر ہنسنے لگا بولا کہ رہنے دو میں اپنے باپ دادا کا دین نہیں چھوڑوں گا۔

یہ سنکر آپ نے اس سے کہا جہاں سے آئے ہو وہیں واپس چلے جاؤ۔

اس نے جواب دیا کہ میں عربوں کے منہ سے خود کو فراری نہیں کہلوانا چاہتا۔ لہٰذا جب اس نے آپ کی دوسری تجویز بھی مسترد کر دی تو آپ نے اسے نیچے اتر کر جنگ کرنے کے لئے کہا۔ اس نے کہا "لیکن میں تمہیں قتل نہیں کرنا چاہتا"۔ آپ نے فرمایا "لیکن میں تو چاہتا ہوں"

یہ سننا تھا کہ غیض و غضب میں بپھرا ہوا وہ پہلوان نیچے اترا اور اس ملعون نے اترتے ہی مولائے کائنات کے سر پر زبردست وار کیا۔ آپ، نے ڈھال سے روکنا چاہا لیکن تلوار ڈھال کو چیرتی ہوئی آپ کے سر مبارک میں جا لگی۔ شیر خدا نے پھرتی سے اپنے کو اس خطرناک حملہ سے بچایا' اور بعد کے پے درپے حملوں سے محفوظ رکھا۔ اسی اثناء میں موقعہ پاکر آپ نے بجلی کی سی تیزی سے ذوالفقار اٹھائی اور اس کے کندھے میں پیوست کر دی اور اسے ذبح شدہ گائے کی طرح ڈھیر کر دیا۔

سیرت النبیؐ کی مستند کتابیں مشہور و محترم صحابی حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کے حوالہ سے اس واقعہ کو نقل کرتی ہیں۔ حضرت جابر فرماتے ہیں کہ جب جناب امیر علیہ اسلام عمرو کے مقابلہ پر گئے تو یہ دیکھنے کے لئے کہ کامیابی کسے نصیب ہوتی ہے وہ آگے بڑھے۔ لیکن گردوغبار اڑنے کی وجہ سے کچھ نہ دیکھ سکے کہ اچانک کسی نے تکبیر کا نعرہ مارا جس کے بعد مسلمانوں نے بھی خداوند عالم کی بزرگی کا اظہار کیا اور وہ سمجھ گئے کہ عمرو حرف غلط کی طرح مٹ چکا ہے۔ اسے مرتا دیکھ کر اس کے ساتھی ڈر کے مارے بھاگے۔ ان میں سے ورقہ بن نوفل خندق میں جاگرا اور آپ ہی کے ہاتھوں واصل جہنم ہوا[۱]۔ باقی افراد میں سے آپ نے ہبیرہ بن وہب پر حملہ کیا جبکہ وہ سوار تھا اور آپ پیادہ تھے۔ چنانچہ اس اثناء میں عکرمہ بن ابی جہل اور ضرار بن خطاب فرار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ البتہ منبہ بن عثمان مسلمانوں کے تیروں کی زد میں آکر زخمی ہو گیا اور مدینہ پہنچ کر اپنے انجام

---

[۱] تاریخ طبری بھی بعینہ اس روایت کو نقل کرتی ہے۔

کو پہنچا[1] ۔

شیخ مفید روایت کرتے ہیں کہ جب امیرالمومنین علیہ الصلوۃ والسلام اس مہم کو سرکر کے کامیاب و کامران جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت اقدس میں شرفیاب ہوئے تو ان کے نورانی چہرے پر مسرت و خوشی کے آثار دکھائی دیتے تھے ۔ ابھی پہنچے ہی تھے کہ جھٹ حضرت عمر نے سوال کیا کہ انہوں نے عمرو کی وہ قیمتی اور نادر زرہ کیوں نہ اتاری ۔ آپ نے جواب میں فرمایا'

"ہمیں شرم آئی کہ اس کی شرمگاہ کو نمایاں کریں"[2]

اسی دن کی مناسبت سے سرور کونین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے منقول ہے کہ' "خندق کے دن علیؑ کا عمرو بن عبدود سے جنگ لڑنا' قیام قیامت تک میری امت کے اعمال پر بھاری ہے"[3]

اسی طرح سیوطی[4] ذیل میں دی گئی آیۂ شریفہ کی تفسیر میں کہ

"کفی اللہ المومنین القتال"

خداوند عالم نے مومنوں کو جنگ سے بے نیاز کر دیا[5]

ابی حاتم' ابن مردویہ اور ابن عساکر سے نقل کرتے ہیں کہ خداوند عالم نے جناب امیر علیہ السلام کے توسط سے جنگ کا کام پایہ تکمیل کو پہنچایا اور مسلمانوں کو اس مہم سے باز رکھا۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام' تاریخ طبری۔
[2] کتاب الارشاد۔
[3] تاریخ بغدادی جلد نمبر ۱۳۔
۔ تفسیر فخر رازی (تفسیر کبیر۔ سورۃ قدر کے ذیل میں)
۔ فضائل الخمسہ من الصحاح الستہ (جلد دوم ص ۲۲۲)' یہ کتاب مستدرک الصحیحین سے سفیان ثوری کے حوالہ سے اس روایت کو نقل کرتی ہے۔
[4] در منثور (سیوطی)'
[5] سورۃ احزاب آیۂ ۲۵۔

شیخ مفید ہارون سعدی کی ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتا ہے کہ میں حذیفہ بن یمان کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ ہم جناب امیر کے فضائل بیان کرتے ہیں تو بصرہ کے لوگ ہمیں کہتے ہیں کہ تم علیؑ کے بارے میں زیادہ روی کرتے ہو۔ حذیفہ نے کہا خدا پاک کی قسم تم حضرت علیؑ کے بارے میں کیا پوچھتے ہو اگر آنحضرتؐ کی بعثت سے لے کر قیام قیامت تک امت مسلمہ کے اعمال ایک طرف ہوں اور صرف حضرت کے اعمال ایک طرف ہوں تو انہی کے اعمال بھاری ہوں گے۔ ہارون نے کہا، یہ چیز تو ممکن نہیں اور کیسے ہو سکتا ہے۔ حذیفہ نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا اے احمق اور پست انسان کہاں تھے فلاں و فلاں اور حذیفہ اور باقی اصحاب کرام جب عمرو بن عبدود انہیں بلا رہا تھا۔ اس دن صرف حضرت علیؑ ہی اس کے مقابلہ پر گئے اور اسے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ معبود کی قسم انکا یہ عمل اور کارنامہ مسلمانوں کے تمام اعمال پر بھاری ہے![1]

ہم جب گہرائی میں جا کر اور پوری دقت کے ساتھ اس واقعہ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں دکھائی دیتا ہے کہ تمام مسلمان مجاہد عمر بن عبدود کے آگے وحشت زدہ ہو گئے تھے اور آنحضورؐ کے ترغیب جہاد اور جنت کی ضمانت دینے کے باوجود بھی سوائے جناب امیرؑ کے کسی نے جناب رسالت مآبؐ کے حکم کی تکمیل نہ کی۔ اور جب علیؑ سامنے آئے تو کفار خوش ہو رہے تھے کہ وہ نوجوان جس نے بدر و احد کی جنگوں میں ہمارے پہلوانوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا آج عمرو کے ہاتھوں مارا جائے گا یہاں تک کہ مسلمانوں کے حوصلہ بھی پست ہو گئے تھے اور وہ بھی یہی سمجھنے لگے تھے کہ شیر خدا خندق کی قربانی بن جائیں گے۔ لیکن جب شیر خدا نے اس لعین کو واصل جہنم کیا تو کفار کی امیدیں خاک میں مل گئیں اور مسلمانوں کے دلوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اور ایک بار پھر وہ خدائی نصرت کا انتظار کرنے لگے۔

---

[1] کتاب الارشاد۔

لٰہذا جو کوئی بھی انصاف کے ساتھ اس واقعہ کے اطراف و جوانب پر نظریں دوڑائے گا تو بلاشبہ وہی نتیجہ نکالے گا جس پر حذیفہ بن یمان پہنچے تھے۔ (اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار آنحضورؐ نے کیا تھا۔)

یہ معرکہ اتنا حیرت انگیز تھا کہ جب عمر کی بہن کو خبر دی گئی کہ اس کا بھائی مارا گیا ہے تو اس نے جاننا چاہا کہ اسے کس نے مارا ہے؟ اور جب بتایا گیا کہ علیؑ بن ابی طالب نے تو اس نے یہ تاریخی جملہ کہا کہ ' "یقیناً اس نے بڑے بڑے پہلوانوں کو شکست دی اور اس کی موت بھی اس کی قوم کے ایک شریف انسان کے ہاتھوں ہوئی"۔ پھر فی البدیہہ کچھ اشعار کہے جن میں وہ اپنے بھائی سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ "اگر علی بن ابی طالبؑ کے علاوہ کسی اور کے ہاتھوں تمہاری موت ہوئی ہوتی تو میں تمام عمر تم پر آنسو بہاتی۔"

واقعاً" جناب امیر علیہ السلام نے عمرو کو مار کر بہادری کی وہ زندہ مثال قائم کی تھی جس کے آگے بڑے بڑے سورماؤں کے کارنامے بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ پورے جزیرۃ العرب میں آپ کی دھاک بیٹھ گئی اور یہی چیز سبب بنی کہ صحابہ آپ سے حسد کرنے لگے۔ انہوں نے بدر کی جنگ میں آپ کی تلوار کے جوہر دیکھے' احد میں آپ کی استقامت اور صبر و شکیبائی کی انتہاء کا کچھ اندازہ لگایا اور پھر خندق میں اس غیر معمولی قدرت و طاقت اور ذہانت کو آزمایا جس کی وجہ سے نہ صرف عمرو مارا گیا بلکہ پوری فوجوں میں ہلچل مچ گئی۔ مزید براں خود جناب رسالت مآبؐ بھی آپ کی تعریف و توصیف بیان کرنے اور آپ کی خوبیوں اور کمالات کو اجاگر کرنے میں کوئی کمی نہ آنے دیتے تھے۔

اسی ضمن میں نقل کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت زبیر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ سلم کے ساتھ جا رہے تھے کہ راستہ میں جناب امیر علیہ السلام دکھائی دیئے۔ آنحضرتؐ انہیں دیکھ کر مسکرائے تو انہوں نے تبسم کیا۔ لیکن زبیر سے جناب امیرؑ کی یہ منزلت نہ دیکھی گئی اور وہ رسول پاک پر اعتراض

کر کے کہنے لگے۔

"یا رسول اللہ آپ خواہ مخواہ علیؑ کو غلط فہمی اور غرور میں مبتلا کئے دیتے ہیں۔" آنحضرتؐ نے اس اعتراض کا (سچا اور منہ توڑ) جواب دیا'

"وہ ہرگز مغرور نہیں ہوں گے بلکہ تم ان پر ظلم کرو گے اور ناحق ان سے جنگ لڑو گے۔"

سالہا سال گذر گئے اور وہ وقت آگیا کہ صادق و امین پیغمبرؐ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے کلمات حقیقت کا روپ دھار لیں۔ جناب امیرؑ کی خلافت کا دور تھا اور طلحہ و زبیر نے حضرت عائشہ کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلیفہ کے خلاف اعلان بغاوت کیا تھا۔ لہٰذا جب قتل و غارتگری کے بعد فیصلہ کن معرکہ ہوا اور آپ دارالخلافہ چھوڑ کر ان کا مقابلہ کرنے آپہنچے تو عین لڑائی میں آپ نے زبیر کو مذکورہ حدیث یاد دلائی اور اگر ان کا بیٹا انہیں مجبور نہ کرتا تو وہ میدان جنگ چھوڑ دیتے۔

بہرحال عمرو بن عبدود کی موت جزیرۃ العرب کی متحدہ افواج (Allied Forces) کے لئے پریشان کن ثابت ہوئی۔ گو ان کے حوصلے جواب دے چکے تھے اور اب محاصرہ یا مقابلہ کی تواں نہ تھی۔ لیکن چارہ جوئی کے لئے وہ آخری اور فیصلہ کن حملے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ خداوند عالم نے ان پر آندھی طوفان بھیجے۔ ہوا کے تند و تیز جھونکے ان کے خیمے اڑا لے گئے ان کے مویشی بھاگ کھڑے ہوئے اور ان کے دلوں پر خوف و ہراس چھا گیا۔ اس طرح پورے لشکر کا شیرازہ بکھر گیا اور مجبوراً انہیں فرار کرنا پڑا۔

خداوند عالم نے اپنے حبیب پر آیۂ مبارکہ نازل کی اور اس خدائی نعمت کی نوید دی'

"اے ایمان والو اس وقت اپنے خالق کی نعمت کو یاد کرو جب متحدہ افواج نے تم پر حملہ کیا تھا۔ ہم نے آندھی طوفان سے ان کا مقابلہ کیا اور ایسے لشکر نازل کئے جنہیں تم نہ دیکھ سکے اور جو کام تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ

اس سے بخوبی واقف ہے[1]"۔

[1] سورۂ احزاب آیۃ نمبر ۹۔

امامؑ حدیبیہ میں

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ہجرت کئے چھ سال گذر چکے تھے۔ کچھ دن پہلے ذیقعدہ ۶ ھ کا چاند مدینہ کے افق پر طلوع ہوا تھا۔ اس عرصہ میں مسلمان قریش اور یہودیوں جیسے نہ جانے کتنے عفریتوں سے نبرد آزما ہوئے اور کتنے ہی معرکہ انہیں لڑنے پڑے لیکن زیادہ تر انہیں کامیابی اور ان کے دشمنوں کو رسوائی ہوئی۔ وہ جزیرۃ العرب کی ایک مضبوط، مستحکم اور ناقابل تسخیر انقلابی طاقت میں تبدیل ہو چکے تھے اور اس جزیرے کے زیادہ تر قبیلے ان کے دین کے گرویدہ ہو چکے تھے۔

لیکن اب خانہ کعبہ کی یاد انہیں شدت سے ستا رہی تھی اور طواف بیت کے لئے ان کے دل بیتاب ہو رہے تھے وہ جب بھی اس قبلہ گاہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تو ان یادوں میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا۔

اسی سال جب خالق کائنات کے حکم سے جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس پاک و مقدس گھر کے طواف کا ارادہ کیا تو یہ خبر بجلی کی سی

تیزی سے پھیلتی چلی گئی اور ان کی مرادیں بر آئیں۔ انہوں نے ایک مقدس درخت کے نیچے خدا کے حبیب سے آخری دم تک اسلام و پیغمبر اسلام کی نصرت کا عہد کیا۔ یہی وہ وعدہ تھا جس پر خالق نے اپنی خوشنودی کا اظہار ان لفظوں میں کیا۔

لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم و انزل السکینہ علیھم و اثابھم فتحا "قریبا"[۱]۔

"اے پیغمبر خداوند عالم مومنوں سے اسی وقت خوش ہو گیا تھا جب انہوں نے آپؐ سے اس خاص درخت کے نیچے بیعت کی تھی۔ پس وہ ان کے دلوں کے حال جانتا ہے۔ اس نے انہیں تسکین و اطمینان کی دولت سے نوازا اور ایک قریبی اور زود رس کامیابی عطا فرمائی"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس سفر کے تمام حفاظتی اقدامات مکمل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک طرف تو آپ نے غیر مسلمانوں کی ایک جماعت کو اپنے ساتھ لیا اور دوسری طرف کچھ سفیر عرب قبیلوں کی طرف دوڑائے جو انہیں سمجھا سکیں کہ قریش نے لات و منات کی وجہ سے اسلام کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی بلکہ یہ ساری مخالفت اس سبب سے ہے کہ اسلام ظلم و استکبار کی بساط جمانے اور محروموں و نادار لوگوں کا خون چوسنے کے خلاف ہے اور برابری و مساوات کا خواہاں ہے۔

اسی احتیاط کے پیش نظر رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان ایام میں اپنے سفر کا آغاز کیا جن دنوں میں عرب جنگ کرنے کو ممنوع و ناجائز سمجھتے تھے۔

سیرت النبی کے مصنفین لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے ساتھ لباس عمرہ میں ملبوس چودہ سو مسلمان تھے جن کے اس سفید پوش لباس میں نیام کی ہوئی

---

[۱] سورۂ فتح آیۂ نمبر ۱۸۔

تلواروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اپنی روانگی سے پہلے انہوں نے اپنی یہ آواز جگہ جگہ پہنچا دی تھی کہ۔

"ہم خون خرابا یا جنگ نہیں چاہتے"۔

تشیع کے مشہور دانشور شیخ مفید لکھتے ہیں کہ[1] جناب رسالت مآبؐ نے اس مہم میں بھی قافلہ سالاری کا اعزاز جناب امیر علیہ الصلوۃ والسلام کو بخشا جس طرح سے زیادہ تر جنگوں اور غزوات میں آپ کا دستور تھا۔ قافلہ میں مسلمانوں کے علاوہ ستر اونٹ بھی تھے جنہیں سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قربانی اور ہدیہ عقیدت کے لئے ساتھ لائے تھے۔

جب مسلمانوں کی مکہ آمد کی خبر قریش تک پہنچی تو انہوں نے اجلاس بلایا جس میں یہ طے پایا کہ کسی قیمت پر بھی مسلمانوں کو سرزمین مکہ میں قدم نہ رکھنے دیں گے۔ لہٰذا خالد بن ولید کی سرکردگی میں پچاس سواروں کا ایک دستہ بھیج کر انہوں نے مکہ میں داخلہ کا راستہ بند کر دیا[2]۔

قریش کے اس فوجی دستہ نے مسلمانوں کو نہتا دیکھ کر ان پر دست درازی شروع کر دی تھی لیکن رزم کے شہسوار حضرت علیؑ اور دوسرے کار آزمودہ مسلمانوں نے با آسانی انہیں گرفتار کر لیا اور پھر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کیا۔ حضور والا مقامؐ نے گو انہیں آزاد کر دیا لیکن قریش کے اس منفی رویہ کی سخت مذمت کی اور آخری سانس تک اس نیک مقصد پر قائم رہنے کا عزم بالجزم کیا۔

بہرحال جب کسی صورت سے مسئلہ حل ہوتا دکھائی نہ دیا تو بات مذاکرات پر ٹلی اور مذاکرات کے بھی کئی دور ہوئے۔ قریش کی طرف سے کئی لوگ آئے جن میں سہیل بن عمرو نمایاں تھا۔

---

[1] کتاب الارشاد۔
[2] ابن اسحاق کی روایت۔

تاریخ و سنت کے موضوع پر اہلسنّت کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذاکرات صرف مکہ میں داخلہ تک محدود نہ تھے بلکہ بات چیت دوسرے باہمی امور تک بھی پہنچ گئی تھی[1] - چنانچہ امیرالمومنین علیہ الصلوٰۃ والسلام سے روایت ہے جسے ترمذی میں ربعی بن خراش کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے،

جب حدیبیہ کے دن مشرکوں میں سے کچھ لوگ ہماری طرف آئے جن میں سہیل بن عمر بھی تھا تو انہوں نے حضور اکرمؐ سے خطاب کرتے ہوئے کہا،

"اے محمدؐ! ہمارے بھائی، بچوں اور دوستوں میں سے ان لوگوں نے تم سے پناہ لی ہے جو دین میں ذرا سوجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ بلکہ انہوں نے ہمارے مال و جائیداد سے جان چھڑانے کی خاطر تمہاری طرف ہجرت کی ہے، لہٰذا تم انہیں لوٹا دو"۔

حضور گرامی قدر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا اگر واقعی ایسا ہے تو کوئی بات نہیں ہم انہیں دین کی بصیرت دے دیں گے۔ پھر آنحضرتؐ نے فرمایا،

"اے گروہ قریش اس قسم کی باتوں سے باز آ جاؤ ورنہ خداوند عالم تم پر ایسے شخص کو مسلط کرے گا جو شمشیر سے تمہاری گردنیں اڑا دے گا جبکہ اس کا دل ایمان کی روشنی سے مالا مال ہو گا"۔

حضرت ابوبکر و عمر نے فوراً پوچھا یا رسول اللہ وہ کونسا شخص ہے۔ آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا"وہی جو جوتی ٹانک رہا ہے"۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جناب امیر علیہ السلام کو اپنی نعلین دے چکے تھے اور وہ اس میں پیوند لگا رہے تھے۔

یہی چیز بعینہ امام نسائی اپنی خصائص اور حاکم اپنی مستدرک میں لکھتا ہے۔ یہ دونوں اس پر مزید یہ بھی اضافہ کرتے ہیں کہ جب قریشی ٹولہ نے حضور اکرمؐ

---

[1] صحیح ترمذی، کنز العمال، خصائص نسائی، تاریخ بغدادی۔

سے یہ تقاضائے جاہلانہ کیا تو انہوں نے حضرت ابو بکر سے دریافت کیا کہ وہ کیا کہتے ہیں۔

اور جب انہوں نے سہیل بن عمر کے کہے کی تصدیق کر دی تو جناب رسالت مآبؐ کا رنگ فق ہو گیا اور انہوں نے وہی فرمایا جسے پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ان کی گفتگو سن کران دونوں نے باری باری سوال کیا۔

"یا رسول اللہ کیا میں ہی وہ شخص ہوں"

آنحضرتؐ نے فرمایا نہیں بلکہ وہ جو جوتی ٹانک رہا ہے۔ لہٰذا جب نگاہ اٹھائی تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ میں خاتم الانبیاء کی نعلین مبارک ہے۔ اور آپ اس میں ٹانکہ لگا رہے ہیں۔

مشہور دانشور فیروز آبادی اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ محدثین و مورخین کی ایک بڑی تعداد نے اسے روایت کیا ہے۔ضمناً وہ ان حوالوں اور اسناد کی نشاندہی بھی کرتے ہیں[1]۔

بہرحال جب کافی جر و بحث اور ردوکد کے بعد اتفاق رائے ہوا تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جناب امیرؑ سے صلح نامہ کی قرارداد یں لکھنے کے لئے کہا۔

فرمایا لکھو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"

سہیل نے فوراً اعتراض کیا کہ ہم رحمٰن و رحیم کو نہیں پہچانتے لہٰذا اس کے بجائے "باسمک اللھم" لکھو[2]۔

آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے موافقت کی پھر فرمایا لکھو کہ مندرجہ ذیل معاملات محمد رسول اللہ اور سہیل بن عمر کے درمیان طے ہوئے ہیں۔

---

[1] رجوع کریں فضائل الخمسہ من الصحاح الستہ صفحہ نمبر ۳۲۸- ۳۲۷-

[2] یہ طریقہ زمانہ جاہلیت میں بھی مرسوم تھا اور اس کے معنی ہیں تیرے نام سے شروع کرتا ہوں اے پروردگار۔

سہیل اس وقت بھی خاموش نہ رہا۔ اس نے کہا کہ اگر ہم آپ کو خدا کا نمائندہ اور رسول مان لیتے تو کبھی آپ کے خلاف تلوار نہ اٹھاتے۔

اس اعتراض کے بموجب آنحضرتؐ نے جناب امیرؑ سے کلمہ "رسول اللہ" مٹانے کے لئے کہا۔ جناب امیر نے جب ایسا کرنے سے معذرت چاہی تو قلم لے کر آنحضرتؐ نے خود اسے مٹا دیا اور اس جگہ اپنا نام بمع ولدیت کے تحریر کیا[1]۔

خصائص نسائی کے مطابق آنحضورؐ نے جناب امیر سے یہ بھی فرمایا

تمہارے ساتھ بھی اس جیسا واقعہ پیش آئے گا اور تم ایسا کرنے پر مجبور ہو گے۔

اس جملہ کو ابن ابی الحدید معتزلی نے بھی نقل کیا ہے۔ اور یہ پیشنگوئی آنحضورؐ کی نبوت کے منجملہ دلائل میں سے ہے۔

ابھی تقریباً پینتیس سال گذرے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب جناب امیرؑ اور باغی معاویہ کے درمیان ایک خونی جنگ ہو چکی تھی اور بات مذاکرات پر ختم ہوئی تھی۔ چنانچہ جب انہوں نے صلحنامہ میں لفظ امیرالمومنین لکھنے سے انکار کر دیا تو آپ نے ابن عباس سے اسے مٹانے کے لئے کہا اور ابن عباس نے آپ سے معافی چاہی۔ آپ نے خود بڑھ کر اس کلمہ کو مٹایا اور ابن عباس کو بتایا کہ مجھے اس واقعہ کی خبر سرکار رسالتمآبؐ کی زبانی پینتیس سال قبل مل گئی تھی جب صلح حدیبیہ کی قرارداد لکھی جا رہی تھی۔

بہرحال حدیبیہ کے مقام پر مسلمانوں اور قریش کے درمیان بہت سے امور پر توافق ہو گیا اور طے پایا کہ مسلمان اس سال مکہ میں داخل نہیں ہوں گے چنانچہ اگلے سال آ سکیں گے اور قریش تین دن کے لئے اس مقدس شہر کو خالی کر دیں گے۔

---

[1] صحیح بخاری، خصائص نسائی۔

ان مسائل کو نپٹانے کے بعد مسلمان حضور مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زیر قیادت واپس مدینہ جا رہے تھے۔ شرف زیارت حاصل نہ ہونے کے سبب انہیں ایک ظاہری شکست کا احساس تھا۔ لیکن اس صلح میں نہ جانے کتنی کامیابیاں اور فتوحات پنہاں تھیں۔ چنانچہ دوران سفر ہی سورہ فتح کی کچھ آیات نازل ہوئیں اور ایک زود رس کامیابی کی نوید دے گئیں۔

انا فتحنا لک فتحا " مبینا "

"بے شک ہم نے آپ کو فتح مبین (مسلم الثبوت کامیابی) سے نوازا"

مشہور مورخ ابن ہشام امام زہری کا یہ مقولہ نقل کرتا ہے کہ صلح حدیبیہ اسلام کی ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس صلح کے بعد لوگ اس ذوق و شوق سے خدا کے دین کے گرویدہ ہوئے کہ ابتدائے بعثت سے لے کر اب تک نہ ہوئے تھے۔ نیز قریش نے اسلام کو جزیرۃ العرب کے ایک دین و آئین کی حیثیت سے تسلیم کر لیا اور یہ اعتراف بھی کیا کہ اسلام ایک ناقابل تسخیر قوت بن چکا ہے۔

امامؑ قلعہ خیبر میں

اس میں شک نہیں کہ صلح حدیبیہ کے بعد سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قریش اور عربوں کی طرف سے خاصے مطمئن اور پرسکون ہوگئے تھے۔ خود صلح کرنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ میدان رزم میں زبردست چوٹ کھانے کے بعد قریش نے بزم مذاکرات کا رخ کیا تھا۔ اور مورخین کے بقول اسلام کو بہت سے فائدے اور کامیابیاں ہوئیں تھیں۔ لیکن ان کامیابیوں کے باوجود جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم شہر سے باہر کے یہودیوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں سے ہرگز غافل نہ ہوئے تھے۔ آنحضرتؐ ان کی تمام حرکات و سکنات پر کڑی نگاہ رکھتے تھے اور اس بات کا پورا احتمال دیتے تھے کہ کسی لمحہ بھی یہ قوم بغاوت کر بیٹھے اور اطراف کی سپرپاورز کو اسلام کی نوخیز تحریک کے خلاف اکسائے جیسا کہ ان کی ہزاروں سال کی تاریخ سے ثابت ہے۔ گویا دھوکہ دہی اور وعدہ خلافی ان کی گھٹی میں پڑی ہے اور انہیں وراثت میں ملی ہے۔

سیرت النبی کی زیادہ تر تصنیفات لکھتی ہیں کہ ابھی حدیبیہ سے واپس ہوئے ایک مہینہ بھی نہ گذرا تھا کہ آنحضرتؐ نے خیبر پر چڑھائی کی تیاریوں کا حکم دیا۔ چند ہی دنوں میں تیاریاں مکمل ہو گئیں اور جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک ہزار چھ سو مسلمانوں کی فوج لئے خیبر کی طرف روانہ ہو گئے۔ حسب معمول پرچم یہاں بھی جناب امیر علیہ السلام کے پاس تھا۔ مسلمان خیبر کے نزدیک پہنچ چکے تھے کہ رات کی سیاہی چاروں طرف پھیلنے لگی۔ حضور مقبولؐ نے رات بسر کرنے کا فیصلہ کیا اور پیشقدمی کے لئے صبح کا انتظار کرنے لگے۔

سپیدہ صبح طلوع ہوا تو خدا کے حبیبؐ نے مسلمانوں سے خطاب فرمایا۔ اور انہیں صبر و اخلاص سے کام لینے کا وعظ کیا۔

خیبر ایک سرسبز و شاداب شہر تھا جسے یہودیوں کی فنکاری اور دفاعی استعداد نے مضبوط و مستحکم قلعوں میں بدل دیا تھا۔ خیبر کے یہودی حسب معمول باغوں اور کھیتوں میں کام پر نکلے تو چاروں طرف مسلمان فوج کو دیکھ کر ان کی جان نکل گئی۔ وہ دوڑے دوڑے گئے اور اپنی قوم کے بزرگوں کو اس خطرے سے آگاہ کیا۔

کچھ تاریخیں لکھتی ہیں کہ انہیں اس حملہ کا انتظار تھا لہذا احتیاطاً انہوں نے قبیلہ غطفان سے اتحاد کر لیا تھا لیکن بہرحال اس اتحاد کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔

اتنا تو ثابت ہے کہ طاقت و توانائی، فنون جنگی اور کار آزمودہ پہلوانوں کے لحاظ سے خیبر کے یہودی اس خطہ میں سب سے نمایاں اور ممتاز تھے۔ ان کی اسی قدرت و طاقت کو دیکھ کر قریش یہ امید کرتے تھے کہ ان سے جنگ کر کے مسلمان کمزور ہو جائیں گے۔

مسلمانوں کی آمد کی اطلاع ملی تھی کہ انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو سب سے زیادہ محفوظ قلعہ میں منتقل کر دیا اور خود مقابلہ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ لڑائی کئی دن تک جاری رہی لیکن یہ قلعے فتح نہ ہو سکے۔

سیرہ ابن ہشام کے مطابق جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہر روز لشکر کی قیادت مسلمانوں میں سے کسی ایک کے سپرد کرتے لیکن وہ ناکام لوٹتا۔

ابن ہشام ابن اسحاق سے نقل کرتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت ابو بکر کو لشکر کا پرچم دے کر خیبر کے قلعوں کی طرف بھیجا لیکن وہ کچھ کئے بغیر ہی واپس ہو گئے۔ دوسرے دن یہ امارت حضرت عمر کو دی گئی لیکن وہ بھی ناکام ہی لوٹے[13]۔

علامہ طبری بریدۃ الاسلمی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جب حضور اکرمؐ نے حضرت عمر کو پرچم دیا اور وہ مسلمانوں کو لے کر نکلے تو انہیں اور ان کے ساتھ موجود لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے لہٰذا دونوں ایک دوسرے کو بزدلی کے طعنے دیتے ہوئے آنحضرتؐ کے پاس واپس پہنچے۔ کئی دن تک اسی طرح ہوتا رہا جو جاتا بغیر کچھ کئے واپس آ جاتا یہاں تک کہ مسلمانوں کا زور ختم ہونے لگا اور وہ عاجز آنے لگے تو ایک دفعہ جناب رسالت مآبؐ نے باآواز بلند ایک جملہ کہا جسے زیادہ تر مسلمان سن رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا۔

"خدا کی قسم! کل اس شخص کو پرچم دوں گا جو خدا اور رسول کو (دل و جان سے) چاہتا ہے اور خدا و رسولؐ بھی اس سے محبت کرتے ہیں"[14][15]۔

بس کیا تھا کہ ہر ایک گردن اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا اور ہر دل میں یہ تمنا پروان چڑھنے لگی کہ یہ عزت یہ افتخار انہیں ہی نصیب ہو۔

---

[13] سلمہ بن اکوع کی روایت (سیرۃ ابن ہشام)۔

[14] مصنف لکھتے ہیں کہ علامہ حلی اپنی کتاب "نہج الحق" میں لکھتے ہیں کہ جناب امیر علیہ السلام کے بارے میں اس حدیث نبوی کو مسند احمد، صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں نقل کیا گیا ہے اور مجموعاً" صحاح الستہ میں عبداللہ بن بریدہ کے ذریعہ روایت کیا گیا ہے۔ فضل بن روز بہان اس پر اضافہ کرتے ہیں کہ یہ صحیح حدیث ہے اور جناب امیرؑ کے ان بے شمار فضائل و امتیازات میں سے ہے جس میں انکا کوئی شریک نہیں۔

[15] تاریخ طبری۔

حضرت عمر فرماتے ہیں کہ سوائے اس دن کے میں نے کبھی صدارت کی ہوس نہ کی تھی اور آنحضرتؐ کے کلمات سننے کے بعد دل یہ چاہتا تھا کہ پرچم مجھے ہی ملے[۹۵]۔

جناب امیر علیہ السلام ان نازک لمحات میں سوزش چشم سے نڈھال تھے لہٰذا کہا جاتا ہے کہ درد کی شدت کے باعث آپ مدینہ ہی میں رہ گئے تھے اور ان مشکل لمحات میں خیبر پہنچے جبکہ درد بدستور باقی تھا حالانکہ صحیح مقولہ یہ ہے جسے زیادہ تر مورخین بھی نقل کرتے ہیں کہ آپ مسلمانوں کے ساتھ نکلے تھے اور بعد میں اس تکلیف میں مبتلا ہوئے۔

بہرحال جب مسلمان بہت دن تک خیبر کے یہودیوں سے لڑ کر تھک گئے اور آپ کی آنکھیں آئی ہوئی تھیں تو آنحضرتؐ نے اپنے دست مبارک آپ کی آنکھوں سے مس کئے اور آپ کے لئے دعا فرمائی۔ اسی وقت وہ تکلیف جاتی رہی۔ انہوں نے پرچم آپ کو دیتے ہوئے یہ ہدایات دیں۔

"اے علیؑ اسے مضبوطی سے تھام لو اور کامیابی سے پہلے واپس نہ پلٹنا۔ اور ہاں ان سے جنگ کرتے رہنا یہاں تک کہ وہ خدا کی وحدانیت اور تمہارے رسولؐ کی رسالت کا اقرار نہ کرلیں اور اگر ایسا کرلیں گے تو پھر تم پر ان کے جان و مال حرام ہوجائیں گے۔"

سلمہ بن اکوع لکھتا ہے کہ (آنحضرتؐ کے یہ فرامین سننے کے بعد) جناب امیر رواں دواں خیبر کے قلعوں کی طرف بڑھے۔ جب وہ قلعوں سے نزدیک ہوئے تو پرچم کو پتھروں میں پیوست کردیا۔ ابھی ہم پہنچے ہی تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہودیوں کی ریجمنٹ اپنی تمام تیاریوں اور خاص نظم و ضبط سے پیشقدمی کرنے لگی۔ شروع میں ماہرین جنگ تھے جن میں ان کا مشہور و معروف پہلوان اور ان کے سردار کا بھائی حارث بھی تھا۔ جب انہوں نے حملہ کیا تو شیر خداؑ نے بڑھ کر مقابلہ کیا اور بہت جلد اسے حرف غلط کی طرح مٹا دیا اور پھر اپنے ساتھیوں کی

---

[۹۵] البدایہ والنہایہ۔ (ابن کثیر)۔

مدد سے یہودیوں پر وہ حملہ کیا کہ ان کے پاؤں نہ جم سکے اور وہ فرارا کر گئے۔

بھائی کی موت اور یہودیوں کی شکست ان کے سردار مرحب پر بڑی گراں گزری۔ لہٰذا تمام تیاریوں کیساتھ وہ خود ہی میدان کارزار میں کود پڑا۔ وہ سر تاپا ہتھیاروں میں غرق اور اسلحہ سے لیس تھا اور اپنی شجاعت اور بہادری کا ترانہ بھی پڑھ رہا تھا۔

"خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں"

ہتھیار سے لیس تجربہ کار پہلوان ہوں

جب تلواریں تلواروں سے ٹکراتی ہیں'

تب اپنی مہارت دکھاتا ہوں۔

جناب امیر علیہ السلام کے پاس صرف ایک زرہ تھی کہ اسے بھی آپ اتار کر آئے تھے اور ہاتھ میں ایک تلوار سے زیادہ کوئی چیز نہ تھی۔ انہوں نے مرحب کا جواب ان لفظوں میں ادا کیا۔

انا الذی سمتنی امی حیدرہ

کلیث غابات شدید قسورہ

اکیلکم بالکیل کیل السندرہ[۱]

"میں وہ ہوں کہ جس کی ماں نے اسے شیر کے خطاب سے نوازا۔ ان نیستاں کے شیروں کی مانند جو مضبوط و طاقتور ہوتے ہیں۔ ابھی تلوار سے تمہارا حساب صاف کئے دیتا ہوں"

---

[۱] کہتے ہیں کہ مرحب کی ماں نے نجومیوں سے مرحب کا حال دریافت کرنے کے بعد اسے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ کامیاب رہے گا مگر یہ کہ حیدر نامی شخص سے کبھی مواجہ نہ ہو لہٰذا جناب امیرؑ نے ان اشعار میں اس نکتہ کی طرف توجہ دلائی اور مرحب کو اس کی ماں کی کہی ہوئی بات کی یاد دہانی کرائی۔

یہ کہہ کر آپ آگے بڑھے۔ ایک مرتبہ آپ کی تلوار اس کی تلوار سے ٹکرائی اور دوسری مرتبہ آپ نے بجلی کی سی تیزی سے اتنا زبردست اور نپا تلا وار کیا کہ تلوار سے اسے برابر سے دو ٹکڑے کر دیا۔ جب یہودیوں نے اپنے سردار کا یہ حال دیکھا تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور خیبر کے یہ قلعے فتح ہوگئے۔

ابن ہشام ابن اسحاق سے اور مستند حوالہ سے آنحضرتؐ کے خادم ابو رافع سے نقل کرتے ہیں کہ ہم حضرت علیؑ کے ساتھ تھے جب جناب ختمی مرتبتؐ نے انہیں پرچم عطا کیا تھا اور وہ نکل چلے تھے۔ پھر مقابلہ کے دوران ایک یہودی نے ان پر حملہ کیا جس سے ڈھال آپ کے ہاتھ سے گر پڑی آپ نے باب خیبر کو اکھاڑ لیا اور ڈھال کے طور پر استعمال کرتے رہے یہاں تک کہ خداوند عالم نے آپ کو کامیابی سے نوازا اور آپ نے اسے واپس زمین پر پھینک دیا۔

واقعہ نگار کہتا ہے کہ سات آدمیوں نے جن میں آٹھواں میں تھا اسے ہلانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے[1]۔

محمد حسین ہیکل مزید برآں یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت علی درِ خیبر کو ڈھال کے طور پر استعمال کرتے رہے یہاں تک کہ یہودیوں کو شکست ہوئی۔ انہوں نے قلعہ کے آگے خندق کھودی ہوئی تھی لہٰذا آپ نے دروازہ اس گڑھے پر ڈال دیا جسے عبور کر کے مسلمان قلعوں کے اندر جا پہنچے[2]۔

سیرت النبیؐ کے زیادہ تر مصنفین اعتراف کرتے ہیں کہ جناب امیر ہی نے باب خیبر کو اکھاڑا اور مرحب کو مارا تھا۔ اس ضمن میں

ابن دحلان

---

[1] سیرۃ ابن ہشام۔
[2] حیاۃ محمدؐ (محمد حسین ہیکل)۔

علامہ طبری

ابن سعد

سیرۃ الحلبیہ کے مصنف

ابن عبدالبر (استیعاب میں)

ابن کثیر (بدایہ میں)

اور یعقوبی (تاریخ یعقوبی میں)

مانتے ہیں کہ درِ خیبر کی لمبائی اسی (۸۰) بالشت تھی اور انہوں نے اپنے ہاتھوں ہی سے اسے اکھاڑا تھا۔

اسی طرح فیروز آبادی فضائل خمسہ[۵] میں

صحیح مسلم

صحیح بخاری

صحیح ترمذی

سنن ابن ماجہ

سنن نسائی

اور دوسرے مصادر کے حوالہ سے پرچم ملنے کی حدیث کو جناب امیر سے منسوب کرتے ہیں۔ احادیث کے اصلی دفاتر کا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مورخین کو ان تینوں احادیث کی صحت میں نہ شک و شبہ ہے اور نہ ہی ان کے درمیان کوئی اختلاف ہے سوائے ابن ہشام کے جو واقدی کی مغازی اور سیرہ ابن اسحاق پر تکیہ کرتے ہوئے مرحب کی موت کو محمد بن مسلمہ

---

۵ فضائل خمسہ۔

سے نسبت دیتے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اس مسئلہ میں موسیٰ بن عقبہ اور عبداللہ بن سہل کی روایت پر تکیہ کرتی ہیں۔

جہاں تک عبداللہ بن سہل کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں خود ابن حجر کا کہنا ہے کہ اس کی زیادہ تر روایتیں حضرت عائشہ سے ہیں تقریباً" تنہا حضرت عائشہ ہی اس کی روایات کا سرچشمہ ہیں[1] اور ظاہر ہے کہ جناب امیرؑ کے بارے میں حضرت عائشہ کے خیالات سے کون واقف نہیں۔

البتہ موسیٰ بن عقبہ، زہری سے روایات نقل کرتا ہے اور زہری بنی امیہ کا قریبی خدمت گزار تھا اور جناب امیرؑ سے باغی تھا[2]۔ مزید یہ کہ ابن حجرہ وغیرہ کہ جنہوں نے محمد بن شہاب کا شرح حال لکھا ہے انہوں نے ذکر کیا ہے کہ زہری کی اکثر روایات سند کے لحاظ سے ناقص ہیں۔ اور ایک طرح سے مرسلہ روایات کے ذیل میں آتی ہیں۔

پھر اسماعیلی کتاب العتق میں لکھتا ہے کہ موسیٰ بن عقبہ نے زہری سے روایات کو بالمشافہ نہیں سنا[3]۔

بہرحال خلاصہ کلام یہ کہ ان راویتوں کے کمزور ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ انہیں سوائے محمد حسین ہیکل کے کسی نے نقل نہیں کیا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ امیرالمومنین سے منسوب روایتوں کو محدثین نے تواتر و کثرت سے نقل کیا ہے اس نے انہیں یکسر نظر انداز کیا اور ان جیسے متعصب لوگوں سے یہ کچھ بعید نہیں۔

استاد عبدالرحمٰن بدوی بھی بڑی خوبی سے تمام واقعات اور حقائق کو نقل کرتے ہیں اور دل کھول کر جناب امیرؑ کی شجاعتوں کا تذکرہ کرتے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں مسلمان کامیاب ہوئے۔

---

[1] تہذیب التہذیب، تہذیب ابن حجر جلد ۱۲۔
[2] اس چیز کو ہم نے اپنی کتاب موضوعات میں ثابت کیا ہے۔
[3] تہذیب التہذیب جلد نمبر ۱۰ اور ۱۲۔

مسلمان اتنے دنوں کی مسلسل لڑائیوں اور مقابلوں کے بعد خیبر کے یہودیوں کو تسلیم ہونے پر مجبور کر چکے تھے۔ گو کہ ان یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے لیکن محسن انسانیت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خاص شرائط طے کر کے انہیں وہیں آزادانہ زندگی کا آغاز کرنے کی اجازت دیدی تھی۔

خیبر سے نکل کر مسلمان مدینہ واپس ہو رہے تھے کہ ٹکراؤ ایک یہودی بستی سے ہوا یہ لوگ بہرحال طاقت و تعداد کے لحاظ سے خیبر کے یہودیوں کی طرح تو نہ تھے لیکن انہوں نے تسلیم ہونے سے انکار کر دیا اور سخت مزاحمت کی۔ یہاں بھی شیر خدا نے انہیں اسلام کی دعوت دی اور جب انہوں نے مذاق اڑایا تو آپ نے انہیں صفحہ ہستی سے مٹادیا۔ اس معرکہ میں بھی صرف آپ نے گیارہ مانے ہوئے یہودی پہلوانوں کے غرور و نخوت کو مٹی میں ملایا یہاں تک کہ یہ لوگ بھی تسلیم ہوگئے اور جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان سے بھی وہی معاہدہ کیا جو خیبر کے یہودیوں سے کیا تھا۔

اس طرح یہودیوں سے ہونے والے یہ معرکے اختتام کو پہنچے اور مسلمانوں کو مادی و معنوی اور دینی و دنیاوی فوائد نصیب ہوئے۔ اسلام شرک پر اور حق کفر پر غالب آگیا۔ ان کامیابیوں کا سہرہ پہلے آنحضرتؐ کی صحیح حکمت عملی کے سر ہے اور پھر جناب امیرؑ کی اس بے مثال اور ناقابل شکست شجاعت کے سر کہ جس کے سامنے بڑے بڑے سورما بھی نہ ٹھہر سکے۔

فتح مکہ میں حضرت کے کارنامے

حدیبیہ کے مقام پر مسلمان اور قریش بہت سے مسائل میں مفاہمت کر چکے تھے۔ اس صلح کا قرارداد نامہ بھی جناب امیرؑ نے لکھا تھا اور اس کی ایک کاپی قریش کو دی تھی اور دوسری جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں پیش کی تھی۔ یوں تو آنحضرتؐ اپنے آپ کو اس صلح کی تمام قراردادوں کا پابند سمجھتے تھے لیکن قبیلہ قریش اسے توڑنا چاہتا تھا۔ پھر جب غزوہ موتہ میں مسلمانوں کو ظاہری طور سے شکست ہوئی تو وہ اور سرچڑھ گئے اور انہوں نے بنوبکر کے ایک قبیلہ بنودول کو بنوبکر کے دوسرے قبیلہ بنو خزاعہ کے خلاف اکسایا جو مسلمانوں کا ہم پیمان تھا۔

ایسا ہی ہوا اور بنودوٴل نے باآسانی قریش کی مدد سے بنو خزاعہ کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ جب یہ خبر پیغمبر اکرمؐ تک پہنچی تو انہوں نے ایک جملہ ارشاد فرمایا جو ظالم اور آمرانہ طاقتوں کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کو واضح کرتا ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا۔

''اگر خزاعہ کی مدد نہ کی تو گویا ہم نے کسی کی مدد بھی نہ کی۔''

یہ جملہ نہ صرف اسلام میں عہد و پیمان کی اہمیت اجاگر کرتا ہے بلکہ تجاوز گروں کے مقابلہ میں اسلام کی حکمت عملی کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

چنانچہ آنحضرتؐ نے قریش کو اس پیمان شکنی اور وعدہ خلافی کی بھرپور سزا دینے کا تہیہ کرلیا تھا۔ حضور والا مقامؐ تمام احتیاط اور پوری رازداری سے مصروف عمل بھی ہوگئے تھے لیکن بدقسمتی سے حاطب بن بلتعہ نامی نافہم مسلمان کو اس منصوبہ کی اطلاع مل گئی۔ اس نے فوراً قریش سے دیرینہ دوستی برقرار رکھنے کے لئے انہیں ایک تفصیلی خط لکھا جس میں مسلمانوں کے عزائم پر سے پردہ ہٹایا۔

یہ خط اس نے ایک ماہر اور تجربہ کار عورت کے سپرد کیا تاکہ بحفاظت اسے اہل مکہ تک پہنچادے۔

ادھر وہ خط کو لئے شہر کی حدود سے باہر بھی نہ نکلی تھی کہ وحی الہٰی نازل ہوئی اور آنحضرتؐ کو اس پورے ماجرے کی اطلاع مل گئی۔

آنحضرتؐ نے جناب امیر علیہ الصلوۃ والسلام اور حضرت زبیر کو اس مہم پر مامور کیا اور تفصیلات سے آگاہ کرنے کے بعد یہ بھی بتادیا کہ خط اس کے پاس ہے جب یہ دونوں تعاقب کرتے اس تک پہنچ گئے تو مولائے متقیان ٹھہر گئے اور حضرت زبیر اس کے پاس گئے اور اس سے خط کے متعلق پوچھا۔ خط کا نام سنا تھا کہ وہ رو پڑی اور اپنی معصومیت اور لاعلمی کا اظہار کرنے لگی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر حضرت زبیر کا دل پسیج گیا اور انہوں نے آپ سے واپس چلنے کے لئے کہا۔

جناب امیرؑ کو زبیر کی سادگی پر خاصا تعجب ہوا آپ نے انہیں سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ کیونکر ممکن ہے کہ سچے اور امین پیغمبرؐ فرمائیں کہ خط اس کے پاس ہے جبکہ خط اس کے پاس موجود نہ ہو؟

یہ کہہ کر آپ نے تلوار نکال لی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا ''خط

نکالتی ہو یا تمہاری تلاشی لی جائے"۔

اس نے جب فاتح بدر و خندق کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تلوار اور چہرے پر طیش کے آثار دیکھے تو فوراً" جوڑے میں چھپے ہوئے خط کو نکال کر آپ کے حوالے کیا اور آپ نے اسے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت اقدس میں پیش کیا۔ آنحضرتؐ نے تمام مسلمانوں کو جمع کیا اور پھر اس خط کے لکھنے والے کو طلب فرمایا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی خوف سے کانپتا اور ڈر سے لرزتا آرہا ہے۔ آنحضرتؐ نے حاطب کو تنبیہہ کی اور آئندہ اسے اس کام سے باز رہنے کی نصیحت فرمائی۔ نیز خداوند متعال نے اسی مناسبت سے یہ آیہ شریفہ نازل کی،

یا ایھا الذین آمنوا لاتتخذو اعدوی وعدو کم اولیاء o تلقون الیھم بالمودہ وقد کفروا بماجاء کم من الحق

"اے ایمان لانے والوں میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست قرار نہ دو۔ تم ان پر دوستی اور محبت کے پھول نچھاور کرتے ہو حالانکہ وہ اس حق (و ہدایت) کے منکر ہیں جو تمہارے پاس آچکی ہے۔"

جب عسکری تیاریاں مکمل ہوگئیں تو آنحضرتؐ دس ہزار کی سپاہ کو لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے۔ یہاں بھی ان کے خاص دستے (ریجمنٹ) کا پرچم جناب امیرؑ کے ہاتھ میں تھا اور دوسرے دستوں کے پرچم قبیلوں کے سرداروں میں تقسیم کردیئے گئے تھے۔ حضور اکرمؐ نے مکہ کا یہ سفر جاری رکھا۔ ابھی گذر ظہران نامی مقام سے ہوا تھا کہ عباس بن عبدالمطلب اور ابوسفیان ملاقات کی غرض سے آپؐ کے پاس حاضر ہوئے۔

ابوسفیان مسلمانوں کی خبرگیری کے لئے مکہ سے باہر نکلا تھا کہ عباس شفاعت کیلئے اسے آنحضرتؐ کے پاس لے گئے تھے۔ محسن انسانیتؐ نے عباس کی سفارش کے بموجب اس کے تمام جرائم اور خباثتوں کو نظرانداز کیا یہاں تک کہ اس کی بدسلوکی اور وحشی گری سے بھی درگذر فرمایا جو اس نے حضرت حمزہ کے لاشہ سے کی تھی۔ داعی اسلام نے اسے اسلام کی دعوت دی پھر فرمایا۔

"وائے ہو تجھ پر ابو سفیان کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تو جان سکے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔"

ابو سفیان نے کہا "ماں باپ کی قسم آپ انتہائی بردبار' بے حد شریف اور حد سے زیادہ درگذر کرنے والے ہیں لیکن جہاں تک اس مسئلہ کا تعلق ہے تو ابھی اس سے متعلق میرے ذہن میں بہت سے شکوک و شبہات رہ گئے ہیں۔"

عباس نے اس کے یہ جملے سن کر تلخی سے کہا'

لا الہ الا اللہ کہتے ہو یا تمہارا کام تمام کیا جائے۔![1]

عباس کو مصمم اور سنجیدہ پاکر مجبوراً اس نے زبان تو ہلادی لیکن یہ حقیقت ہے جسے اس کی زندگی کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد معلوم کیا جاسکتا ہے کہ زندگی کے آخری دم تک اس کے دل میں آنحضرتؐ کی نبوت کے بارے میں نہ جانے کتنے سوالات اور شبہات باقی رہ گئے تھے۔ لہٰذا اظہار کے اس لمحہ سے لے کر مرتے دم تک اس نے جو کچھ بھی کیا وہ اس بات کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔

ظہران سے گذر کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عظیم الشان لشکر کے ساتھ مکہ میں پہنچے تھے کہ جس کی مکہ کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ انہوں نے فاتح عظیم ہونے کے باوجود سوائے گیارہ لوگوں کے جن میں سات مرد اور چار عورتیں تھیں' تمام شہر والوں کے لئے کھلی معافی اور عام بخشش کا اعلان کیا تھا۔

جناب امیر علیہ السلام ان ناسوروں کی تلاش میں تھے۔ آپ نے ان میں سے کچھ کو پاکر ان کے انجام تک پہنچادیا تھا اور باقی کو تلاش کرتے ہوئے ام ھانی کے گھر تک آپہنچے۔ اس سے پہلے انہی مجرموں میں سے عبداللہ بن ربیعہ اور حرث بن ہشام نے آپ کی ہمشیرہ ام ھانی کے گھر پناہ لے لی تھی۔ پھر جب

---

[1] تاریخ طبری اور دوسری تاریخیں۔

آپ تشریف لائے تو زرہ میں چھپے ہونے کے باعث وہ آپ کو پہچان نہ سکیں اور فرمانے لگیں کہ میں رسول اللہ کی بھتیجی اور علی بن ابی طالب کی بہن ہوں۔ آپ نے چہرہ نمایاں کیا تو وہ بڑھ کر گلے لگ گئیں اور خوشی سے ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے پھر جب آپ نے چاہا کہ ان دو افراد کو ڈھونڈ نکالیں تو وہ مانع ہوئیں اور کہنے لگیں کہ بھائی ہوکر بھی وہ ایسا کرتے ہیں۔ اگر انہیں مارنا ہی مقصود ہے تو پہلے ان کا کام تمام کریں۔ چنانچہ ان کے شدید اصرار پر آپ نے ان دونوں افراد سے تعرض نہ کیا اور آگے بڑھ گئے۔

اس کے برخلاف واقدی کی روایت کے مطابق ام ھانی نے ان دونوں افراد کو گھر میں پناہ دینے کے بعد دلاسہ دیا اور گھر کا دروازہ بند کرکے بطحاء میں آنحضرتؐ کے پاس تشریف لے گئیں۔ آنحضرتؐ موجود نہ تھے۔ انہوں نے دختر گرامی رسول اکرمؐ سے تذکرہ چھیڑا تو انہیں حضرت علیؑ سے بھی زیادہ سخت پایا۔ لیکن آنحضرتؐ کے تشریف لانے پر جب انہوں نے آنحضرتؐ کو حقیقت حال سے آگاہ کیا تو جناب رسالت مآبؐ نے ان سے فرمایا'

"جس کو آپ نے پناہ دی اسے ہم نے پناہ دی اور جسے آپ نے امان دی' اسے ہم نے امان دی'

اگرچہ آنحضرتؐ نے اہل مکہ کو معاف کردیا تھا اور ان سے فرمایا تھا

"جاؤ تم آزاد ہو"

لیکن اس سب کے باوجود کعبہ کے اندر و باہر موجود تمام بتوں کو ان ہی کے سامنے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔

زمخشری اس آیہ شریفہ کے ذیل میں کہ'

قل جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا"

"کہو حق آگیا اور باطل مٹ گیا بے شک باطل ہمیشہ سے مٹنے والا تھا' لکھتا ہے کہ جبریل نے حضور اکرمؐ سے کہا تھا کہ وہ عصا تھام لیں اور تمام بتوں کو

گرادیں۔ آنحضرتؐ نیچے سے عصا کے ذریعہ بتوں کی طرف اشارہ کرتے اور وہ خانہ کعبہ کی چھت سے گرتے چلے جاتے یہاں تک کہ مستحکم بندوں سے بندھا ہوا ایک بڑا بت باقی رہ گیا۔ آنحضرتؐ نے جناب امیرؑ سے اسے گرانے کے لئے کہا۔ پھر حضورؐ نے آپ کو اتنا اوپر اٹھایا کہ آپ خانہ کعبہ کی چھت تک پہنچ گئے۔ آپ نے عصا مار کر اسے گرایا اور توڑ ڈالا۔

اہل مکہ یہ سب دیکھ کر دنگ رہ گئے اور کہنے لگے کہ انہوں نے محمدؐ سے زیادہ بڑا جادوگر نہیں دیکھا۔

بنی جذیمہ کے ساتھ

شہر مکہ کو فتح ہوئے ابھی کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے اور جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم امن و عافیت کے اس پاک شہر میں تشریف فرما تھے کہ انہوں نے خالد بن ولید کی سرکردگی میں ساڑھے تین سو مسلمانوں پر مشتمل ایک سریہ مکہ کے اطراف میں بھیجا۔ اس سریہ میں عبدالرحمٰن بن عوف بھی شامل تھا۔ خالد مکہ سے نکلتے ہی مسلمانوں کی ہمراہی میں سفر کرتا رہا یہاں تک کہ وہ علاقہ آگیا جہاں بنی جذیمہ کے پانی کے ذخیرے تھے اس نے یہیں آکر دم لیا۔

اسلام سے پہلے بنی جذیمہ نے بنی مغیرہ پر ظلم و تشدد کیا تھا۔ ان کی کچھ عورتوں کو ہوسرانی کا نشانہ بنایا تھا اور ان کے دو اشخاص کو قتل کر ڈالا تھا جو یمن سے تجارت کے لئے آئے ہوئے تھے اور ان کے مہمان تھے۔ ان میں ایک عبدالرحمٰن کا والد عوف تھا۔ عبدالرحمٰن نے جو کہ سفر میں والد کے ہمراہ تھا اپنے والد کے قاتل کو مار کر ان کا انتقام لے لیا تھا۔

لہٰذا جب اسلام اور فتح مکہ کے بعد حضور اکرمؐ نے بنو جذیمہ کے لئے خالد کی سرکردگی میں سریہ بھیجا تو انہوں نے مسلح ہوکر مسلمانوں کا استقبال کیا۔ خالد نے انہیں ہتھیار پھینکنے کے لئے کہا تو وہ تسلیم ہوگئے اور اپنے ہتھیار پھینکنے لگے۔ لیکن انہی میں ایک باہوش اور تجربہ کار بزرگ نے ہتھیار پھینکنے سے انکار کیا اور اپنی قوم کے لوگوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"وائے ہو تم پر کیا نہیں جانتے کہ یہ خالد ہے۔ خدا کی قسم ہتھیار پھینکنے کے بعد قید کرلئے جاؤ گے اور قید کئے جانے کے بعد تمہاری گردنیں اڑادی جائیں گی۔"

اس سن رسیدہ اور جہاندیدہ شخص کے مضبوط و مستحکم موقف پر سب نے اس کی طعن و تشنیع کی یہاں تک کہ اس نے ہتھیار پھینک دیئے اور بنو جذیمہ نے رسمی طور پر تسلیم ہونے کا اعلان کردیا۔ لیکن بدقسمتی سے وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا چنانچہ خالد نے تسلیم ہونے کے بعد انہیں دھوکہ دیا اور کچھ کو قتل کرڈالا۔ جب یہ خبر رحمت عالمؐ کو پہنچی تو ان کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ گئے'

"اے خدا! میں خالد کے کئے سے اپنی بھرپور بیزاری کا اظہار کرتا ہوں" پھر رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جناب امیر علیہ الصلوۃ والسلام کو بلوا کر ان سے فرمایا'

"اے علی تم ان لوگوں کے پاس جاکر اس مسئلہ کو حل کرو اور جاہلیت کے جھگڑوں اور اختلافات کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالو۔"[1]

یہ فرماکر آنحضرتؐ نے خالد کے کئے دھرے کا مداوا کرنے کے لئے آپ کو ڈھیر سا پیسہ دیا۔

مولائے متقیان نے وہاں پہنچ کر خالد کے اس اقدام کو سراسر غلط قرار دیا اور مقتولین کے لواحقین کو خون بہاء عطا کیا اور جن جن کے مال چھینے گئے تھے

---

[1] ابن اسحاق وغیرہ کی روایت۔

انہیں پوری قیمت ادا کرنے کے بعد ان سے دریافت کیا کہ کیا اب بھی خون بہاء اور ان کے اموال میں سے کوئی حق باقی رہ گیا ہے۔ جب ان سب نے ایک زبان ہوکر نہیں کہا تو آپ نے ان کے دل جیتنے کے لئے باقی اموال بھی انہی میں تقسیم کر دیئے اور واپس آکر آنحضرتؐ کو اپنی کارکردگی سے آگاہ کیا۔

سرکار رسالت مآبؐ نے آپ کو تحسین و آفرین کہا اور پھر ایک مرتبہ رو بہ قبلہ کھڑے ہوکر دونوں ہاتھ اٹھائے اور بارگاہ ربوبی میں مسلسل تین مرتبہ خالد کی اس غلطی سے اپنی شدید بیزاری اور نفرت کا اظہار کیا۔

امامؑ وادی حنین میں

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ابھی مکہ میں قیام پذیر تھے کہ ھوازن کے قبائل کی سرگرمیاں بڑھنے لگی تھیں۔ فتح مکہ اور قریش پر مسلمانوں کے غلبہ نے انہیں ہلادیا تھا اور وہ ڈرتے تھے کہ یہی سپاہ جس نے قریش کے غرور و نخوت کو خاک میں ملادیا تھا خود ان کی اپنی تباہی کا باعث نہ بنے۔ چنانچہ اگر ایسا ہوجاتا تو پھر مسلمانوں کے لئے میدان صاف تھا اور پورے جزیرۃ العرب میں کوئی ایسی طاقت نہ تھی جو ان کا مقابلہ کرسکتی۔ اب تک تو اس قسم کے قبائل اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ مسلمان ہرگز قریش پر غالب نہ آسکیں گے اور کبھی ان پرچڑھائی کی غلطی نہ کریں گے۔

بہرحال ھوازن و ثقیف اور ان کے ہم پیمان قبیلوں نے مسلمانوں کو شکست دینے کیلئے ایک عظیم الشان سپاہ تشکیل دی جو اسلحہ کی برتری کے علاوہ تعداد میں بھی مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھی۔ وہ لوگ اس سپاہ کو لے کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

ادھر جب سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے مسلمانوں کو تیاری کا حکم دیا اور بارہ ہزار کی فوج کے ساتھ شہر مکہ کو وداع کیا۔ ان بارہ ہزار میں کچھ لوگ مکہ سے بھی تھے۔ ان اہل مکہ میں کچھ نے تو اب تک اسلام کی تمازت کو محسوس نہ کیا تھا اور کچھ نے نفاق کے لباس میں شرک و بت پرستی کی گندگی کو چھپا رکھا تھا اور بظاہر وہ اسلام لے آئے تھے جیسا کہ ابوسفیان وغیرہ۔ بہرحال مسلمان ہوازن و ثقیف کے تعاقب میں مکہ سے روانہ ہو رہے تھے۔ یہاں بھی مہاجروں کے لشکر کے پرچمدار جناب امیر علیہ الصلوۃ والسلام تھے۔

ہوازن و ثقیف اور ان کے دوستوں کو خبر پہنچ چکی تھی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان سے جنگ کے لئے مکہ سے روانہ ہو چکے ہیں لہٰذا انہوں نے مسلمانوں پر چھپ کر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے تہامہ کی وادیوں کا انتخاب کیا اور ان میں سے ایک تنگ وادی میں کمین کر کے مسلمانوں کا انتظار کرنے لگے۔

ادھر جب مسلمان تمام راستوں کو طے کرتے ہوئے تہامہ کی وادیوں میں پہنچے تو جو کچھ ان پر گزری اس کے بارے میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری روایت کرتے ہیں۔

ہم صبح کے تڑکے میں وادی حنین پہنچے اور تہامہ کی وادیوں کو طے کرتے ہوئے اسی سلسلہ کی ایک وادی میں نیچے جا پہنچے۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہمارے آنے سے پہلے ہی دشمن اس میں کمین کر چکا تھا۔ اور اس کی فوجوں نے دروں اور تنگ راستوں میں مورچے لے لئے تھے۔ لہٰذا جیسے ہی ہم داخل ہوئے تو ہوازن و ثقیف کے مخصوص دستوں نے چاروں طرف سے ایسا اچانک اور زوردرس حملہ کیا کہ ہم سب کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ انہوں نے ہمیں اتنی مہلت نہ دی کہ لشکر کو دشمن کے وجود سے خبردار کر سکتے اور ایسے حملے اور وار کئے کہ ہم پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ پوری فوج میں بھگدڑ مچ گئی، دوست دشمن کی تمیز نہ رہی اور تمام مسلمانوں پر اس وقت ایسا خوف و ہراس

طاری ہوا کہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور خدا کے رسولؐ کو بے یار و مددگار چھوڑ گئے۔ البتہ خود جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثابت قدم رہے۔ ان کے ساتھ گنتی کے چند لوگ تھے۔ یہ جناب امیرؑ، عباس بن عبد المطلب، ابو سفیان بن حرث اور اسامہ بن زید تھے[1]۔

شیخ مفید لکھتے ہیں کہ اس انتہائی مشکل وقت میں دس افراد آنحضرتؐ کے حلقہ بگوش تھے۔ ان میں سے نو بنی ہاشم سے تھے اور دسواں ایمن بن ایمن تھا جو شہید کر دیا گیا۔ لہٰذا بنی ہاشم کے نو افراد باقی رہ گئے تھے۔ ان لوگوں کے علاوہ بقیہ مسلمان بھاگ چکے تھے۔ حضور اکرمؐ بار بار انہیں پکارتے اور خطاب کر کے فرماتے،

لوگو! میں خدا کا رسول محمدؐ بن عبد اللہ ہوں

لیکن کوئی جواب نہ دیتا![2]

مشہور مورخ یعقوبی شیخ مفید کی ذکر کردہ روایت پر تکیہ کرتے ہیں اور اسے ہی نقل کرتے ہیں[3]۔

حلبی لکھتے ہیں کہ مسلمان جب وادی حنین میں آنحضرتؐ کو تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے اور میدان جہاد سے فرار کر گئے تو اس وقت حضور والا مرتبتؐ کے ہمراہ صرف چار اشخاص تھے۔ جناب امیرؑ اور ابن عباس دونوں طرف سے ان کا دفاع کر رہے تھے۔ ابو سفیان بن حرث کے ہاتھ میں حضورؐ کے مرکب کی افسار تھی اور ابن مسعود بائیں جانب تھے۔ نیز اسی دن کی مناسبت سے یہ آیۂ شریفہ نازل ہوئی تھی۔

"ویوم حنین اذاعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شئیا" وضاقت علیکم

---

[1] زیادہ تر مورخین حضرت جابر کی روایت پر تکیہ کرتے ہیں۔
[2] کتاب الارشاد۔
[3] تاریخ یعقوبی دوسری جلد۔

الارض بمارحبت ثم ولیتم مدبرین، فانزل الله سکینته علی رسوله و علی المومنین "[1]

"خداوند کریم نے حنین کے دن بھی (تمہیں اپنی یاری و نصرت سے محروم نہ کیا) جبکہ سپاہ کی کثرت سے تمہارے دماغ سرچڑھ گئے تھے۔ اور تم خوش فہمی اور عجب میں مبتلا ہو گئے تھے حالانکہ یہ اژدہام تمہارے کسی کام نہ آ سکا۔ زمین اپنی تمام گشادگی کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم بری طرح میدان جنگ چھوڑ کر بھاگے۔ اللہ تعالیٰ نے (اس موقعہ پر) اپنے رسول اور مومنوں کو سکون اور اطمینان خاطر بخشا۔"[2]

شیخ مفید دعویٰ کرتے ہیں کہ آیۂ شریفہ میں مومنوں سے جناب امیرؑ اور بنی ہاشم کے وہ سرکردہ لوگ مراد ہیں کہ جو اس لمحہ بھی ثابت قدم رہے کہ جو آنحضرتؐ کے لئے انتہائی مشکل اور سخت دشوار گذار لمحہ تھا[3]۔

بہرحال اہل نظر کو اس میں کلام نہیں کہ جناب امیر علیہ السلام اور بنی ہاشم کے زیادہ تر لوگ آخری وقت تک آنحضرتؐ کے ساتھ رہے۔ اور جناب امیر علیہ السلام نے اللہ کے پیارے نبی کی بھرپور حفاظت کی اور تلوار کے وہ جوہر دکھائے کہ حضور کی طرف بڑھنے والے ہرہاتھ کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ اور جیسا کہ شیخ مفید دعویٰ کرتے ہیں کہ چالیس پہلوانوں کو تہہ تیغ کیا۔

مورخین کو اس میں بھی کوئی تامل نہیں کہ ابو سفیان اور شیبہ بن ابی طلحہ نے خود اپنے چہرے بے نقاب کر دیئے تھے اور کھلم کھلا اپنی اسلام دشمنی کا اظہار کیا تھا۔ ابو سفیان نے تو نہ صرف زبان سے بلکہ عملاً بھی اپنے مشرک ہونے کا ثبوت دیا اور وہ بت نمایاں کر دیئے جو چھپا کر وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ شیبہ نے بھی یہی رویہ روا رکھا حالانکہ کل اس کے بھائی عثمان کو خانہ کعبہ کی

---

[1] سورۃ توبہ آیۂ نمبر ۲۵۔
[2] سیرۃ الحلبیہ۔
[3] کتاب الارشاد۔

چابیاں لوٹا کر آنحضرتؐ نے اسے خانہ کعبہ کی نگہداشت کا اعزاز عطاء کیا تھا۔

ان دونوں سے تو وہ مشرک صفوان بن امیہ ہی بہتر تھا کہ جس نے ان دونوں کے اس منفی رویہ پر ان کی خوب طعن و تشنیع کی۔

گو یہ دشمنان خدا مسلمانوں کی اس شکست کو دیکھ کر امید کر رہے تھے کہ یہ لوگ سمندر تک بھاگتے چلے جائیں گے اور کبھی واپس نہ ہوں گے۔ لیکن ان کی امیدیں خاک میں مل گئیں جب وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ پانسہ پلٹ رہا تھا۔ صبح کی روشنی پھیلتی جا رہی تھی اور مسلمان ایک ایک کر کے واپس ہو رہے تھے۔ ایک طرف سے عباس انہیں پکار رہے تھے اور بیعت و رضوان کے وعدے یاد دلا رہے تھے اور دوسری طرف آنحضرتؐ اپنے مخصوص اور باوفا اصحاب کے ساتھ قدم جما کر لڑ رہے تھے اور جہاد کر رہے تھے۔ لہٰذا جب مسلمان کچھ تعداد میں جمع ہو گئے اور انہوں نے مل کر اپنے نیزوں اور تلواروں سے دشمن پر حملہ کیا تو لڑائی کا دائرہ وسیع ہو گیا اور ایسی گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ پوری وادی خونی ہو گئی۔

اسی اثناء میں دشمن کی طرف سے ''جرول'' نامی شخص سامنے آیا۔ یہ ھوازن و ثقیف کا نامور پہلوان اور پرچمدار تھا۔ طبری لکھتا ہے کہ یہ جو چاہتا تھا کر دکھاتا تھا لیکن لوگوں نے اسے روکے رکھا تھا۔ جناب امیر علیہ السلام نے آگے بڑھ کر اس طرح سے جرول کو واصل جہنم کیا کہ دشمن کی تمام فوجوں پر ایک عجیب خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کے دل مضبوط و مستحکم ہو گئے اور وہ ایک بار پھر بہادری و شجاعت کے ترانے گانے لگے مخصوصا" جبکہ انہوں نے یکہ و تنہا خدا کے حبیب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دشمن کی صفوں پر حملہ کرتے دیکھا تھا۔ آنحضرتؐ بڑھ بڑھ کر تلوار سے حملہ کرتے اور ساتھ ہی اپنی صداقت و شجاعت کا احساس بھی دلاتے'

انا النبی لاکذب انا ابن عبدالمطلب

جھوٹا نہیں نبی ہوں میں فرزند عبدالمطلب ہوں میں

اس طرح زیادہ تر مسلمان میدان جنگ کی طرف پلٹ آئے تھے سوائے کچھ لوگوں کے کہ جنہیں جب تک مسلمانوں کی کامیابی کا یقین نہ ہوا انہوں نے واپسی کا نام نہ لیا۔

اب سورج کی کرنیں آہستہ آہستہ وادی حنین میں پھیل رہی تھیں اور پوری وادی خونی دکھائی دینے لگی تھی۔ لڑائی جاری تھی کہ جناب امیرؑ نے اپنی مشت میں زمین سے خاک اٹھائی اور اسے جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو پیش کیا۔ آنحضرتؐ نے اسے مشرکوں کی طرف پھینکتے ہوئے فرمایا۔

"ان (مشرکوں) کی صورتیں خراب ہوں" [1]

یہ فرما کر حضور والا مرتبتؐ آگے بڑھے اور آپ کے ساتھ جناب امیرؑ اور بنو ہاشم کے وہ باوفا اور مخلص لوگ تھے کہ جنہوں نے رات کی سیاہی میں آپ کا ساتھ دیا اور بلا شبہ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ ابھی کچھ گھنٹہ ہی گذرے تھے کہ ہوازن و ثقیف اور ان کے اتحادیوں کی عظیم الشان فوج دیکھتے دیکھتے میں فرار ہوگئی اور اپنے ذخیروں' مویشیوں یہاں تک کہ بیوی بچوں کو بھی مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ گئی۔ اس طرح وہ وعدہ پورا ہو گیا جو خداوند عالم نے اپنے پیارے نبیؐ سے کیا تھا۔ اور آنحضرتؐ پوری شان و شوکت اور عزت کے ساتھ اس معرکہ سے عہدہ برا ہوئے لیکن اس کامیابی سے چھ گھنٹہ قبل وہ حالت تھی کہ مسلمانوں کے کلیجے منہ کو آ گئے تھے موت انکے سروں پر منڈلا رہی تھی۔ اور ان میں سے ضعیف الایمان لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمان ہو گئے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیابی سے نوازا اور اس طرح ابو سفیان اور اس کے حواریوں کی آرزوؤں کا جنازہ نکل گیا جب ہوازن اس بری طرح بھاگے کہ ان کی شکست کا دائرہ کوسوں دور سمندر تک پھیل گیا۔

---

[1] جامع ہیثمی' تاریخ بغدادی۔

امامؑ اور غزوۂ تبوک

ماہ رجب ۹ ھ تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خبر موصول ہوئی کہ سلطنت روم کہ جس کی سرحدیں سرزمین حجاز سے ٹکراتی ہیں' مسلمانوں پر حملہ کے لئے ایک زبردست سپاہ تشکیل دینے میں مصروف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خبر ملنے کے بعد آنحضرتؐ کو روم کی سلطنت سے مقابلہ کرنے میں تردد نہ ہوا۔ البتہ انہوں نے چاہا کہ ایسا لشکر ترتیب دیں جو اتنی بڑی قوت سے ٹکر لینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ چنانچہ انہوں نے پورے جزیرے میں عرب قبائل کی طرف اپنے سفیر روانہ کئے اور انہیں دشمن سے مقابلہ کرنے کی دعوت عام دی اور ان سے کہا کہ وہ نہ صرف روم کی سرحدوں تک ان کی ہمراہی کریں بلکہ سفر کے اخراجات اور لشکر کی تنظیم و ترتیب میں بھی بھرپور حصہ لیں۔

ان پاک باطن اور صاف طینت لوگوں نے کہ جن کے دل ایمان سے سرشار تھے اور جنہیں خدائی وعدوں پر پورا بھروسہ تھا' آنحضرتؐ کی دعوت کا کھلے دل سے استقبال کیا تھا۔ وہ قحط و خشک سالی کے سال اور گرمی و لو کے

موسم میں آنحضرتؐ کے ساتھ ایک سخت مہم پر روانہ ہو گئے تھے اور اس سال کی پیداوار کا ایک محدود حصہ اپنے بیوی بچوں کے لئے چھوڑ کر باقی سب اس لشکر پر فداء کر چکے تھے۔

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی حسن تدبیر سے مدینہ میں موجود منافقوں اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کے منفی رجحانات اور غلط سرگرمیوں کو محدود کر دیا تھا اور جیسا کہ کچھ مفسرین دعوی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہی دنوں میں سورۂ توبہ نازل کی تھی۔ یہ سورۂ مبارکہ مسلمانوں کو جہاد کی مسلسل ترغیب دیتی ہے اور منافقوں اور جنگ سے جی چرانے والوں کے چہروں کو بے نقاب کر کے انہیں عذاب اخروی سے ڈراتی دھمکاتی ہے۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی مجبور تھے کہ ان لوگوں کی طرف شک کی نگاہ سے دیکھیں جو ہمیشہ سازشوں کا جال بچھانے اور عامتہ الناس کو آنحضورؐ کے متبرک وجود سے دور کرنے میں مصروف رہتے۔ انہوں نے آپ کو یہاں تک مجبور کر دیا تھا کہ آپ ایک مرتبہ اس گھر کو نذر آتش کر دیں جس میں بیٹھے وہ منصوبہ بنا رہے تھے کہ کس طرح لوگوں کی روحانی و معنوی زندگی کو خاتمہ دیا جائے، انہیں آنحضرتؐ سے متنفر کیا جائے بہرحال سخت تگ و دو اور کافی زحمتوں کے بعد آنحضرتؐ صرف تین ہزار کا لشکر جمع کر پائے تھے۔

ابن سعد اور ابن ہشام دونوں لکھتے ہیں کہ ابتداء میں عبداللہ بن ابی اپنے ہم پیالوں کو لئے (جو کہ تعداد میں مسلمانوں سے کم نہ تھے) آپ کے ساتھ مدینہ سے نکلا تھا اور مدینہ کے باہر ڈالے گئے کیمپ میں اس نے مسلمانوں کے ساتھ قیام کیا تھا لیکن جب آنحضرتؐ روم کے لئے روانہ ہوئے تو وہ اپنے ساتھیوں کو لئے آپ سے بچھڑ گیا اور مدینہ واپس ہو گیا[۱]۔

اس غزوہ میں آنحضرتؐ نے جناب امیر علیہ السلام کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور یہی وہ واحد غزوہ ہے کہ جس میں مولائے متقیان شرکت نہ کر

---

[۱] طبقات کبریٰ اور سیرۂ ابن ہشام (عبداللہ ابن ابی منافقوں کا سردار تھا)۔

پائے تھے۔

جب ہم مدینہ کے حالات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں اور اسلام کا دم بھرنے والوں کے منافقانہ رویوں اور عبداللہ بن ابی کی سازشوں پر غور کرتے ہیں تو بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اسلام ہی کی مصلحت تھی کہ جس نے شیرخدا اور حیدرکرار کو مدینہ میں قیام کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیونکہ ان منافقوں اور کچھ مسلمانوں کے منفی رجحانات کے بعد بھی اگر جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدینہ کو مضبوط اور توانا ہاتھوں میں نہ دیتے' اور وزیر باتدبیر کا تقرر نہ کرتے تو ان ناسوروں کے ہوتے ہوئے اسلامی تحریک کا یہ دارالخلافہ خطرے سے خالی نہ تھا۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ جب مسلمان آنحضرتؐ کی قیادت میں روم کی مہم پر روانہ ہو چکے تو مدینہ میں حضرت علیؑ کی خلافت منافقوں اور اسلام دشمنوں پر گراں گذری۔ انہیں یقین ہو گیا کہ آپؑ کے ہوتے ہوئے وہ کچھ نہ کر سکیں گے۔ لہٰذا انہوں نے محفلوں اور مجلسوں میں یہ افواہ اڑانی شروع کر دی کہ آنحضرتؐ علیؑ کو اس لئے مدینہ میں چھوڑ گئے ہیں کیونکہ انہیں ناپسند کرتے ہیں۔ یہ افواہیں بہت جلد مدینہ کے گلی کوچوں میں پھیل گئیں۔ اور جب اڑتے اڑتے خود آپ کے کانوں تک پہنچی تو آپ نے جوش میں آکر تلوار اٹھائی اسلحہ سے خود کو لیس کیا اور آنحضرتؐ کے پیچھے ہو لئے۔ پھر جب "جرف" نامی منزل پر ان سے جا ملے تو ان کے حضور میں عرض کیا'

"یا رسول اللہ! منافق سمجھتے ہیں کہ چونکہ میرا وجود آپ پر ناگوار گذرتا تھا لہٰذا اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر آپ مجھے مدینہ میں چھوڑ گئے ہیں۔"

آنحضرتؐ نے جو یہ سنا تو فرمایا'

"میں نے تمہیں اپنے بعد کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ مدینہ کی اصلاح یا مجھ سے ہو سکتی ہے یا تم سے۔ تم ہی میرے اہل خانہ' میری قوم اور ہجرت کے اس دیار میں میرے خلیفہ ہو۔ کیا خوش نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو

ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں!"[1]

بظاہر مورخین کو یہاں تک کوئی اختلاف اور شک و شبہ نہیں کہ حضور اکرمؐ نے جناب امیرؑ کی شان میں یہ کلمات کہے تھے۔ البتہ امام احمد اس سب کو نقل لرنے کے بعد حضور اکرمؐ کا یہ جملہ بھی نقل کرتے ہیں کہ'

"میرے لئے جانا کسی طرح مناسب نہیں مگر اس صورت میں کہ تم میرے خلیفہ ہو"[2]

"فضائل الخمسہ من الصحاح الستہ" امام احمد کی حدیث پر تبصرہ کرتے ئے رقم کرتی ہے کہ یہ حدیث بعینہٖ'

☆ خصائص نسائی"

☆ موافقات حافظ دمشقی

☆ مجمع الزوائد ہیثمی

اور دوسری معتبر کتابوں میں نقل کی گئی ہے[3]

بے شک رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب امیر علیہ السلام کی شان میں یہ کلمات ارشاد فرمائے ہوں گے۔ اور ان اسباب کی بنیاد پر جو بیان کئے جا چکے ہیں انہیں مدینہ میں اپنا جانشین بنایا ہو گا اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ جناب امیر علیہ السلام نے شوق شہادت' آنحضرتؐ کی راہ میں مر مٹنے اور آخری سانس تک ان کا دفاع کرنے کی خاطر جنگ میں شرکت کا تقاضا کیا ہو گا۔ جیسا کہ وہ اب تک کرتے آئے تھے اور اس مرتبہ تو دشمن کی تعداد اور اس کے اسلحوں کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ لہٰذا آنحضرتؐ نے جواباً" وہ کلمات فرمائے کہ جنہیں محدثین و مورخین پورے اتفاق سے نقل کرتے ہیں اور وہ

---

[1] طبری' ابن ہشام' ابی الفداء اور یعقوبی کی روایت۔
[2] مسند امام احمد۔
[3] ملاحظہ کریں فضائل خمسہ صفحہ ۲۲۹ اور اس کے بعد۔

بھی کہ جنہیں صرف امام احمد، امام نسائی، حافظ دمشقی، ہیثمی اور شیعہ محدثین نے اپنے آئمہ معصومین سے نقل کیا ہے۔

آنحضرتؐ اس طرح مسلمانوں پر واضح کرنا چاہتے تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں علیؑ ہی ان کے خلیفہ ہیں چاہے وہ اس دنیا سے کوچ ہی کر جائیں۔

البتہ جہاں تک ان باتوں کا تعلق ہے کہ منافقوں کی باتوں کو سنکر خلیفہ رسول طیش میں آگئے اور اسلحہ اٹھاکر آنحضرتؐ کے پیچھے چل دیئے۔ ہمیں ان باتوں میں شبہ ہے اور مولائے کائنات کی شان اس سے کہیں بلند ہے کہ دشمن کی زبان سے نکلی ہوئی معمولی سی بات کو وہ اتنی اہمیت دیں کہ اس مہم میں آنحضرتؐ سے جا ملیں۔

ذات السلاسل کے سریے

اب تک لڑی گئی تمام جنگوں اور معرکہ آرائیوں کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی کامیابیاں اور فتوحات روز افزوں ہو رہی ہیں اور جزیرہ نما عرب میں کفر و شرک کا ستارہ ماند پڑتا جا رہا ہے۔ اور اگر کچھ جنگیں باقی نہ رہ جائیں تو نزدیک تھا کہ یہ ڈوب ہی جاتا گویا ابھی شیر خدا کے لئے میدان باقی تھا کہ اپنی شجاعت کی ایک اور جھلک دکھائیں اور اپنے جہاد و جوانمردی کی تاریخ کا ایک نیا ورق الٹ دیں۔

محدثین کی ایک جماعت لکھتی ہے کہ عرب بدوؤں کی کثیر تعداد ایک سنگلاخ اور دشوار گذار وادی میں جمع ہو گئی کہ جسے وادی رمل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس وادی میں بیٹھے مسلمانوں پر شب خون مارنے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ ایک عربی بدو نے جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ان کے ناپاک عزائم سے آگاہ کیا۔ آنحضرتؐ نے ان لوگوں کا سدباب کرنے کے لئے مسلمانوں کی ایک مسلح جماعت کو حضرت ابو بکر کی سرکردگی میں وادی رمل بھیجا۔

راستوں کو طے کرتے ہوئے یہ لوگ جب وادی کے نزدیک جا پہنچے تو انہیں اندازہ ہوا کہ یہ انتہائی پتھریلی اور دشوار گذار وادی ہے۔ دوسری طرف دشمن وادی کے نشیبی حصوں اور پہاڑوں کے دامن میں مورچے لئے بیٹھا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کے پہنچتے ہی اس نے خاموشی سے وہ حملہ کیا کہ چشم زدن میں بہت سے مسلمان درجہ شہادت کو پہنچ چکے تھے۔ حضرت ابوبکر نے جو یہ حال دیکھا تو فوراً جنگ سے پسپائی کی اور باقی مسلمانوں کو لئے مدینہ واپس ہو گئے۔

حضرت ابوبکر کے ناکام لوٹنے پر آنحضرتؐ نے اس مہم کی قیادت حضرت عمر کے سپرد کی لیکن وہ بھی کچھ نہ کر سکے۔

روایات کے مطابق اس کے بعد آنحضرتؐ نے یہ ذمہ داری عمر بن عاص کو سونپی لیکن ان دونوں کی طرح عمر بن عاص سے بھی مایوسی ہوئی۔ لہٰذا اب جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ جناب امیر علیہ السلام کو لشکر کی قیادت عطا کرتے۔ چنانچہ انہوں نے مہاجر و انصار کی ایک جماعت کو کہ جس میں یہ تینوں حضرات بھی شامل تھے، آپ کے ہمراہ کیا اور پھر مدینہ سے باہر موجود کچھ مسلمانوں کو اس میں ضم کر کے آپ کو رخصت کیا اور آپ کے حق میں دعا فرمائی۔

جناب امیر علیہ السلام نے ان تمام لوگوں کی ہمراہی میں اپنے سفر کا آغاز کیا۔ آپ راتوں کو سفر اور دن کو استراحت و آرام میں بسر کرتے وادی کے نزدیک جا پہنچے۔

محدثین لکھتے ہیں کہ عمر بن عاص جانتا تھا کہ فتح کا عقدہ مولا مشکل کشا علیؑ ہی کے ہاتھوں کھلے گا لہٰذا اسے خراب کرنے کے لئے حضرت ابوبکر کے پاس آ کر کہنے لگا،

"مجھے اس زمین کے بارے میں علی بن ابی طالب سے زیادہ معلومات ہیں۔ یہ وحشی حیوانات اور درندوں کی سرزمین ہے جو کسی صورت دشمن سے کم نہیں۔ لہٰذا آپ علیؑ سے اسے چھوڑنے کے بارے میں گفتگو کریں۔ شاید وہ اس جگہ کو ترک کر دیں"

چنانچہ حضرت ابوبکر آپ کے پاس آئے اور مذکورہ سبب کی وضاحت کے بعد اس جگہ کو چھوڑنے کا تقاضا کرنے لگے لیکن آپ نے ان کی بات کا کوئی اثر نہ لیا۔ پھر حضرت عمر آئے اور انہوں نے بھی یہی تقاضا کیا لیکن آپ نے کوئی التفات نہ کیا یہاں تک کہ رات ڈھل گئی اور فجر کا وقت آ پہنچا۔

ابھی سپیدہ صبح نمودار ہوا تھا اور قوم غافل تھی کہ آپ نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر ان پر شدید حملہ کیا اور ان میں سے بہت سوں کو تہ تیغ کر کے بہت سوں کو قید کر لیا۔ وہ اس حملہ کی تاب نہ لا سکے اور تسلیم ہو گئے اور اس طرح یہ وادی آپ کے ہاتھوں فتح ہو گئی۔

کچھ روایات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے سورۂ عادیات نازل کر کے اپنے پیارے نبی کو اس فتح و ظفر کی نوید سنا دی تھی جو زور حیدرؑ سے حاصل ہوئی تھی۔ اور مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ اس فاتح لشکر کا بھرپور استقبال کریں۔

کچھ دنوں بعد مسلمان شہر سے باہر کھڑے ان غازیوں کو خراج عقیدت پیش کرنے اور ان پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کرنے کے لئے ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔انہی میں خود جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی موجود تھے۔ جب وہ لشکر جرار آ پہنچا جس کی قیادت جناب امیر علیہ السلام کر رہے تھے تو مسلمانوں نے انتہائی گرمجوشی سے انہیں خوش آمدید کہا اور ان سب کا پرتپاک استقبال کیا۔ جناب امیر علیہ السلام جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتے ہی تعظیماً گھوڑے سے اتر پڑے۔ آنحضرتؐ نے جو یہ دیکھا تو بے اختیار آگے بڑھے اور فرمانے لگے،

"اے علیؑ سوار ہو، خداوند عالم اور اس کا حبیب تم سے راضی ہیں"

جناب امیر علیہ السلام اس وقت اتنے مسرور ہوئے کہ فرط مسرت سے نہ جانے کتنے آنسو بہہ گئے۔

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

اگر میں اپنی امت کے ایک گروہ سے خائف نہ ہوتا کہ وہ تمہارے بارے

میں بھی وہی کچھ کہیں گے جو نصرانیوں نے عیسیٰ بن مریم کے بارے میں کہا تھا تو تمہاری شان میں وہ کچھ کہتا کہ تم جہاں سے گزر جاتے لوگ تمہاری خاک پا کو چومتے اور دل سے لگاتے۔

(مشہور مفسر) علامہ طبری امام صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں جس میں صادق آل محمدؐ فرماتے ہیں۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علی کو ذات السلاسل کی مہم پر روانہ کیا اور وہ دشمن پر غالب آگئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پر رات میں سورۂ عادیات نازل فرمائی اور اس واقعہ کی خبر دی۔ آنحضرتؐ نے جب فجر کی نماز میں اسے تلاوت کیا تو مسلمانوں نے پوچھا کہ یہ کونسی سورہ ہے ابھی تک تو انہوں نے تلاوت نہ کی تھی آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا کہ کل رات جبریل نازل ہوئے تھے اور انہوں نے یہ بشارت دی تھی کہ علی دشمنوں پر غالب آگئے ہیں[۵۱]۔

روایت کرنے والے اسی سریہ کے ضمن میں مشہور شاعر اور ادیب سید حمیری کے کچھ اشعار بھی نقل کرتے ہیں[۵۲]۔

کچھ مورخین شہر طی کی جانب بھی آپ کے ایک سریہ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس وقت قبیلہ طی بڑی شد و مد کے ساتھ شرک و بت پرستی پر قائم تھا اور

---

[۵۱] مجمع البیان طبری

[۵۲] وفی ذات السلاسل من سلیم — غداۃ اتاھم الموت المبیر
وقدھزموا الحفص و عمروا — وصاحبہ مرارا فاستطیروا
وقد قتلوا من الانصار رھطا — فحل النذر ووجبت النذور

ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ قارئین کرام کی خدمت میں سورۂ عادیات کی ان آیات کو بمعہ ترجمے کے پیش کریں جو ان دنوں آنحضورؐ پر نازل ہوئی تھیں۔

والعادیات ضبحا، فالموریت قدحا، فالمغیرات صبحا، فاثرن بہ نقعا، فوسطن بہ جمعا،
(سورۂ عادیات)

"(مجاہدوں کے) ان گھوڑوں کی قسم جو سرپٹ دوڑے جاتے ہیں اور ٹاپیں مار کر چنگاریاں نکالتے ہیں۔ وہ صبح (کے تڑکے) میں جنگ کرتے ہیں اور غبار اڑا کر دشمن کے قلب میں جا گھستے ہیں۔"

فلسر نامی قلعہ میں اپنے بتوں کی پوجا کرتا تھا۔ آنحضرت نے کچھ مسلمانوں کے ہمراہ آپ کو اس مہم پر روانہ کیا۔

آپ نے وہاں پہنچ کر کئی زبردست حملے کئے اور انہیں فرار کرنے پر مجبور کردیا۔ اس طرح آپ بہت سا مال غنیمت اور جنگی قیدی لئے آنحضرتؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوئے۔ انہیں قیدیوں میں حاتم طائی کی بیٹی سفانہ بھی تھی۔ اس کا بھائی عدی بن حاتم فرار کرگیا تھا اور سرزمین حجاز سے باہر بھاگ نکلا تھا۔

مشہور مورخ ابن سعد لکھتا ہے کہ حضرت علیؑ دو مرتبہ یمن کی مہم پر بھیجے گئے۔ پہلی مرتبہ سنہ ۸ ھ میں جبکہ ان سے پہلے آنحضرتؐ خالد بن ولید کو بھیج چکے تھے اور وہ کامیاب نہ ہوسکے تھے۔ پھر جب آپ کو بھیجا تو آپ نے وہاں پہنچ کر لوگوں سے خطاب کیا انہیں اسلام کے بارے میں وضاحت سے بہت کچھ بتایا۔ پھر اسلام لانے کی دعوت دی تو وہ سب کے سب اپنی خوشی سے اسلام لے آئے۔ آپ نے آنحضرتؐ کو خط لکھ کر ان کے اسلام لانے کی خبر دی اور خود ہمدان کی طرف بڑھ گئے۔

دوسری مرتبہ ماہ رمضان ۱۰ ھ میں آپ یمن تشریف لے گئے۔ اہل یمن نے اس مرتبہ بھی کافی مزاحمت کی۔ آپ نے پہلے حملہ میں ان کا مقابلہ کیا اور دوسرے حملہ میں انہیں منتشر کردیا پھر دوبارہ حملہ کرکے انہیں تسلیم ہونے پر مجبور کردیا۔ آپ نے ان کے بیس پہلوانوں کو تہ تیغ کیا۔ تسلیم ہونے کے بعد انہوں نے اسلام قبول کیا اور آپ سے کہا،

یہ سب ہمارے صدقات ہیں آپ ان میں سے اللہ تعالیٰ کا حق نکال لیجئے۔ آپ نے مال غنیمت بھی جمع کیا اور اس میں سے خمس نکالنے کے بعد اسے مجاہدوں میں تقسیم کردیا اور مدینہ واپس ہوگئے[1]۔

کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ آپ اس مہم کو سر کرنے کے بعد مکہ کی طرف

---

[1] الطبقات الکبریٰ ابن سعد۔

بڑھے جہاں سرور کونین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حجتہ الوداع کے لئے نکل چکے تھے اور حج کی ادائیگی کے لئے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔

یوں تو کچھ مورخین مذکورہ معرکوں کے علاوہ بھی بہت سے سریوں اور مہموں میں آپ کی شرکت اور نمایاں کارکردگی کے تذکرے کرتے ہیں لیکن اختلاف نظر اور مستند روایت نہ ہونے کے سبب ہم ان کا ذکر کرنے سے قاصر ہیں اور بہر حال اگر یہ فضائل علم کی وادیوں اور عقل کی حدود سے قدم باہر نہ نکالیں تو کچھ بعید نہیں کہ آپ سے متعلق ہوں۔

سورۂ برائت

مسلمانوں کے سرایا جناب امیر علیہ السلام اور دوسرے اصحاب کی زیر قیادت کفر و شرک کے آثار مٹاتے جارہے تھے کہ ہجرت کا نواں سال شروع ہوگیا۔ اس سال کے شروع ہوتے ہی جزیرہ نمائے عرب میں جنگ و جہاد اور معرکہ آرائیوں کا یہ طویل دور اپنے اختتام کو پہنچا۔ اسی سال کے آخری مہینہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسولؐ پر مشرکوں کے بارے میں کچھ قوانین نازل کیے جو مشرکوں کے بارے میں آنحضرتؐ کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے تھے اور مشرکوں کے ساتھ ان کے عہد و پیمان کی حدود معین کرتے تھے۔ چنانچہ سورہ برائت کی ابتدائی آیات اس امر کی شاہد ہیں۔

ان اوامر کے پیش نظر جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو میر کارواں بناکر اور مسلمانوں کے ساتھ حج کرنے بھیج دیا۔ اس زمانے میں حج کے دنوں میں مسلمانوں کے ساتھ مشرکین بھی مسجد حرام میں جمع ہوتے تھے لہذا آنحضرتؐ نے انہیں مشرکوں پر سورۂ برائت کی ابتدائی آیات تلاوت

کرنے کے لئے کہا۔

حضرت ابوبکر اس کاروان حج کو لئے مکہ سے روانہ ہوئے اور سفر کرتے ہوئے ذی الحلیفہ نامی مقام تک جا پہنچے جو "مسجد شجرہ" کے نام سے بھی مشہور ہے۔

ادھر ابھی وہ راستے ہی میں ہوں گے کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر وحی نازل ہوچکی تھی اور جبریل امین اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام پہنچا چکے تھے کہ'

"اس ذمہ داری کو آپ یا آپ میں کا کوئی شخص ہی ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس امر کے بموجب جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جناب امیر علیہ السلام کو بلوایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ فوراً حج کی مہم پر روانہ ہوں اور سورۂ برائت کی آیات کو حضرت ابوبکر سے لے کر خود ان کا ابلاغ کریں۔ ابھی یہ کاروان حج مسجد شجرہ ہی میں ٹھہرا ہوا تھا کہ جناب امیر علیہ السلام آپہنچے۔ آپ نے آیات مبارکہ کو حضرت ابوبکر سے لیا اور مسلمانوں کے ساتھ ادائیگی حج کے لئے آگے بڑھ گئے جبکہ حضرت ابوبکر مدینہ واپس ہوگئے۔ وہ بہت نگراں تھے کہ کہیں ان کے بارے میں کوئی چیز نازل ہوئی ہو چنانچہ انہوں نے آنحضرتؐ سے جب اس کے بارے میں دریافت کیا تو آنحضرتؐ نے فرمایا۔

"نہیں تمہارے بارے میں کوئی چیز نازل نہیں ہوئی البتہ مجھے یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس فریضہ کو خود میں یا میرے اہل سے کوئی شخص ادا کرے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے سفر جاری رکھا یہاں تک کہ مکہ جا پہنچے۔ پھر جب تمام لوگ مناسک حج کے لئے جمع ہوئے تو آپ نے سورۂ برائت کی ابتدائی آیات کی تلاوت فرمائی[1] اور اس انبوہ کثیر و جم غفیر میں ندا دی'

اے لوگو! اس سال کے بعد کوئی مشرک شہر مکہ میں قدم رکھے گا نہ کوئی

---

[1] البدایہ والنہایہ ابن کثیر۔

برہنہ طواف کرے گا۔ اور اگر کسی کے اور رسول اللہ کے درمیان کوئی عہد و پیان ہو تو وہ اپنی مدت تک باقی رہے گا۔

ایک اور روایت کے مطابق آپ نے سورۂ برائت کی ابتدائی آیات کی تلاوت جاری رکھی یہاں تک کہ سلسلہ کلام اس آیۂ شریفہ تک جا پہنچا‘

انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامہم ھذا و ان خفتم عیلہ فسوف یغنیکم اللہ من فضلہ ان شاء ان اللہ علیم حکیم[1] —

مشرکین تو بس نجس ہیں۔ پس اس سال کے بعد وہ مسجد الحرام کے قریب بھی نہ جائیں اور (اے مسلمانوں) اگر تم فقر و فاقہ اور تنگدستی سے گھبراتے ہو تو (یاد رکھو کہ) خداوند عالم اگر چاہے تو بہت جلد اپنے فضل و کرم سے تمہیں بے نیاز کر سکتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا دانا اور حکیم ہے۔

اس آیۂ شریفہ کو تلاوت کرنے کے بعد آپ نے ندادی اور مذکورہ احکام کو بیان کیا۔

مشرکوں نے ان احکام و قوانین کو بڑی بے دلی سے قبول کیا تھا اس لئے کہ ان کے دلوں میں خوف و ہراس اور بغض و کینہ تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اسلام کے سامنے نہ صرف قریش بلکہ عربوں کے بڑے بڑے قبائل ڈھیر ہوگئے تھے لہٰذا ان احکام کو ماننے اور اس دین و آئین کو قبول کرنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا کہ جسے عام لوگوں نے قبول کرلیا تھا۔ لہٰذا چند ماہ نہ گزرے تھے کہ اس قسم کے زیادہ تر مشرکین اسلام لے آئے تھے۔

احادیث کے مجموعوں اور تاریخ کے دفتروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حضرت ابوبکر اور پھر جناب امیرؑ کو اس مہم پر بھیجا گیا تھا۔ اور جب انہوں نے حضرت ابوبکر کے گوشزد کردیا کہ‘ وحی نازل ہوئی تھی کہ اس فریضہ کو آنحضرتؐ یا آنحضرتؐ کا کوئی اہل ادا کرے اور میں ان کا اہل ہوں تب ہی

---

[1] سورۂ برائت۔ آیۂ نمبر ۲۸۔

مولائے متقیان ان سے سورہ برائت لے سکے تھے۔ یہاں تک تو مورخین و محدثین کو کوئی اختلاف نہیں اور ان تمام چیزوں کے صحیح ہونے میں رتی برابر شبہ نہیں۔ تنہا چیز جس میں انہیں اختلاف ہے وہ یہ کہ حضرت ابوبکر نے اس امر کے واضح ہوجانے کے بعد بھی عام مسلمانوں کی طرح حج کیا جبکہ حضرت علی سورۂ برائت کی آیات کی تبلیغ میں مصروف تھے یا یہ کہ وہ مدینہ واپس پلٹ گئے؟۔

اس کے بارے میں زیادہ تر اہلسنّت کا نظریہ یہ ہے کہ انہوں نے اور مسلمانوں کے ساتھ حج کیا جبکہ وصئی رسول تلاوت آیات کے فریضہ کو انجام دے رہے تھے۔

امام حجتہ الوداع میں

۲۵ ذیقعد ۱۰ھ کو جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خانہ کعبہ کا حج کرنے کے لئے مدینہ سے روانہ ہوئے تو مسلمانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ان کے ساتھ تھا۔ گو یہ لوگ قابل شمار نہ تھے لیکن پھر بھی کچھ مورخین انہیں نوے ہزار اور کچھ ایک لاکھ سے اوپر بتاتے ہیں یہ سب حضرات اس اجتماع اور اس سفر سے بیحد مسرور تھے جو نہ صرف عربوں کی تاریخ میں ایک بے مثال اور یادگار حیثیت کا حامل تھا بلکہ اس نے انہیں مختلف علاقوں اور شہروں سے لاکر ایک پرچم تلے جمع کر دیا تھا۔ ان سب کا ایک ہی ہدف اور مقصد تھا اور یہ لوگ ایک ہی قسم کے کلمات دہراتے اور زمزمہ کرتے تھے'

لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک

ان الحمد و النعمتہ لک و الملک لاشریک لبیک

اے خدا میں تیرے در پر جواب دینے کے لئے حاضر ہوں'

میں دل و جان سے حاضر ہوں' بے شک تیرا کوئی شریک نہیں میں تیرے حکم و تیری دعوت کو لبیک کہتا ہوں' تمام تعریفیں' ساری نعمتیں اور سب سلطنتیں تجھے ہی سزاوار ہیں۔ اے خدا میں جان و دل سے حاضر اور اطاعت کے لئے تیار ہوں

شیخ مفید لکھتے ہیں کہ ان وجد آور لمحات میں جناب امیر علیہ السلام موجود نہ تھے۔ انہیں آنحضرتؐ نے یمن کی مہم پر بھیجا ہوا تھا۔ لہٰذا روانگی سے کچھ دن قبل آنحضرتؐ نے انہیں خط لکھ کر مکہ پہنچنے کی تاکید کی۔

ابھی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے نزدیک تھے کہ جناب امیر علیہ السلام باقی مسلمانوں کے ہمراہ مال غنیمت لئے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے چنانچہ آپ کو دیکھ کر وہ بیحد خوش ہوئے اور آپ سے پوچھا کہ'

اے علی تم نے کون سے حج کی نیت باندھی ہے؟ [۵ا]۔

آپ نے فرمایا کہ یارسول اللہ چونکہ آپ نے اس سے متعلق کچھ نہ لکھا تھا لہٰذا میں نے آپ کی نیت پر اپنی نیت باندھی تھی اور یہ سوچا تھا کہ جو خدا کے حبیب کی نیت ہوگی وہی ہماری بھی ہوگی اور میں اپنے ساتھ چونتیس اونٹ لایا ہوں۔

آنحضرتؐ نے جو یہ سنا تو فرمایا'

تم حج اور مناسک حج میں میرے ساتھ شریک ہو۔ لہٰذا لباس احرام پر باقی رہو اور اپنے لشکر کو لیکر جلد مکہ پہنچو تاکہ مکہ میں یکجا ہوسکیں۔

اس سال حضور مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمان الٰہی کے بموجب

۵ا دراصل پیغمبر اکرمؐ جاننا چاہتے تھے کہ جناب امیر قربانی ساتھ لائے ہیں یا نہیں اور جب انہوں نے احرام پہنا تھا تو کیا نیت کی تھی تاکہ اس کی مطابقت سے ان پر احکام خداوندی واضح کرسکیں جیسا کہ جناب سیدہ نے لباس احرام اتار دیا تھا کیونکہ وہ قربانی ساتھ نہ لائیں تھیں۔

ان لوگوں کو احرام اتارنے کا حکم دیا تھا جو قربانی ساتھ نہ لائے تھے البتہ ان لوگوں کو جو قربانی کا جانور ساتھ لائے تھے قربانی کرنے تک احرام پر باقی رہنے کے لئے کہا تھا۔

اس سنت الٰہی کو قبول کرنے کے سلسلہ میں مسلمانوں کے درمیان کافی شور شرابہ ہوا وہ اسے اپنے لئے باعث تذلیل سمجھ رہے تھے لیکن آنحضرتؐ نے انہیں سمجھایا کہ اگر وہ خود بھی قربانی کا جانور ساتھ نہ لاتے تو احرام اتار دیتے اور حج کو عمرہ مفردہ میں بدل دیتے[1] ۔

یہی ان دو سنتوں میں سے ایک سنت تھی جو پیغمبر اسلام کے نزدیک صحیح اور نافذ العمل تھی لیکن حضرت عمر نے اسے اپنے زمانہ میں ممنوع قرار دیا تھا۔ وہ اس بات کا اعتراف خود بھی کرتے ہیں۔

دو سنتیں عہد نبوی میں رائج تھیں جو میری نظر میں حرام ہیں اور ان کے بجالانے والے مستحق سزا ہیں۔

اس سال آنحضرتؐ بار بار مسلمانوں کو مورد خطاب قرار دیتے اور انہیں حج اور دوسری عبادتوں کے احکام تعلیم دیتے۔ ساتھ ہی اشارہ کنایہ میں اپنی سرنوشت سے آگاہ کرتے اور انہیں احساس دلاتے کہ وہ اسی سال ان کے مہمان ہیں۔ یہ باتیں سن کر مسلمانوں کو آنحضرتؐ کی زندگی کے بارے میں

---

[1] یہ واقعہ وسائل الشیعہ (اقسام حج۔ دوسرا باب چوتھی حدیث) میں بھی ایک بڑی روایت کے ضمن میں نقل کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق سرور کونینؐ ابھی صفا و مروہ کے درمیان سعی فرمارہے تھے اور مروہ میں تھے کہ جبریل امین اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام لے کر نازل ہوئے کہ جو لوگ قربانی ساتھ نہیں لائے ہیں وہ عرفات جانے تک احرام اتاردیں آنحضرتؐ نے جب اس حکم ربوبی کو لوگوں تک پہنچایا تو روایت کے مطابق ایک شخص نے آپؐ پر طنزیہ جملہ کسا تو آنحضرتؐ نے فرمایا تم ہرگز اس دین پر ایمان نہ لاسکو گے۔ روایت میں مزید یہ بھی ملتا ہے کہ جناب امیرؑ یمن کی مہم سے پلٹے تھے اور یہ کہ جناب سیدہ نے آنحضرتؐ کے حکم کے بموجب احرام اتار دیا تھا۔
مذکورہ حکم ان لوگوں سے مخصوص ہے جو مکہ سے اڑتالیس میل کے فاصلہ پر نہ ہوں۔ لیکن اگر کوئی اڑتالیس میل یا اس سے زیادہ دور ہو تو وہ حج تمتع کی نیت کرتا ہے جس کے الگ احکام ہیں۔ تفصیل کے لئے توضیح المسائل کی طرف رجوع کریں۔

تشویش لاحق ہوگئی تھی خاص کر اس وقت جب وہ حضرت علی علیہ السلام سے فرما رہے تھے کہ'

اس سال کے بعد تم لوگوں سے نہ مل سکوں گا یا فرماتے کہ نزدیک ہے کہ میرا بلاوا آجائے اور میں لبیک کہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم لوگوں تک دین کے احکام پہنچانے میں حد درجہ شائق تھے لہٰذا بار بار مسلمانوں سے خطاب فرماتے۔ کبھی عرفات میں کبھی منیٰ اور کبھی کسی اور مقام پر غرض ہر مناسب موقعہ پر مسلمانوں کو اسلامی اخلاق و آداب سے آشنا کرتے اور انہیں پابندی سے ان چیزوں کو انجام دینے اور ان خطوط پر آگے بڑھنے کی تاکید کرتے جو انہوں نے ان کے لئے ترسیم کئے تھے۔

اس الوداعی حج سے فارغ ہوکر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک بار پھر اسی انبوہ کثیر کے ساتھ مکہ سے رخصت ہو رہے تھے۔ ابھی مختلف علاقوں کے رہنے والوں کی راہیں الگ نہ ہوئی تھیں اور گذر حجفہ کی خشک اور ویران زمینوں سے ہو رہا تھا کہ اچانک آنحضرتؐ نے یہاں قیام کرنے اور منبر تیار کرنے کا حکم دیا۔

ایک ایسی سرزمین پر قیام کرنے سے کہ جہاں اب تک کسی قافلہ اور قبیلہ نے ٹھہرنا گوارا نہ کیا تھا' مسلمانوں کو خاصا تعجب ہوا۔ اور اگر واقعی رب العزت پردہ وحی سے اس سخت اور نامانوس لہجہ میں خطاب نہ فرماتا تو وہ ہرگز یہاں قیام نہ کرتے۔

یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس ۝[1]

اے رسول اس پیغام کو پہنچا دو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا

---

[1] مائدہ ۶۷۔

گیا تھا۔ اور اگر تم نے اسے نہیں پہنچایا تو حق رسالت ادا نہ کیا اور اللہ تعالیٰ تمہیں لوگوں (کے شر) سے مصون و محفوظ رکھے گا۔

لہٰذا ان آیات کے نازل ہونے کے بعد جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر لازم ہوگیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو نافذ کرتے۔ خاص طور پر اب تو انہیں بغض و عداوت کرنے والوں اور حاسدوں کے شر سے نجات کی ضمانت بھی دیدی گئی تھی۔

ابن کثیر مشہور صحابی جناب زیدبن ارقم سے روایت کرتے ہیں کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے الوداعی حج سے واپسی پر غدیر خم میں قیام فرمایا تھا اور اونٹوں کو جمع کرکے منبر تیار کرنے کے لئے کہا تھا۔ پھر جب منبر تیار ہوگیا تو آنحضرتؐ اس پر تشریف لے گئے۔ انہوں نے لوگوں سے خطاب کیا اور اس دار فانی سے کوچ کرنے کے بارے میں فرمانے لگے'۔

بہت جلد میرا بلاوا آنے والا ہے اور میں اسے قبول کرلوں گا۔ بے شک میں تم میں دو گرانقدر اور نایاب چیزیں چھوڑے جارہا ہوں ایک خدا کی کتاب اور دوسری میری عترت اور میرے اہل بیت۔

ہاں ! اب دیکھنا یہ ہے کہ تم ان دونوں میں کس طرح میری پیروی کرتے ہو۔ بلاشبہ یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں گے۔

پھر فرمانے لگے'

"اللہ تعالیٰ میرا مولیٰ ہے اور میں ہر مومن مرد و عورت کا ولی و سرپرست ہوں۔" یہ کہہ کر جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علی کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا۔

"من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ اللھم وال من والاہ وعادمن عاداہ"

میں جس جس کا مولیٰ ہوں یہ علی بھی اس اس کے مولیٰ ہیں۔ اے خدا ان

کے چاہنے والوں اور دوستوں پر اپنی محبت و رحمت کا سایہ رکھ اور ان کے دشمنوں کو خوار و زبوں کر۔

ابن کثیر اس روایت کو عدی بن ثابت سے بھی روایت کرتے ہیں جسے عدی بن ثابت براء بن عازب سے نقل کرتے ہیں۔ اس روایت کے مطابق جناب امیر علیہ السلام کی ولایت کا اعلان ہونے کے بعد سب سے پہلے حضرت عمر نے انہیں خراج تحسین پیش کیا اور یہ جملہ کہا'

زہے نصیب کہ اب تم ہمارے اور سب مومن مرد و عورت کے مولیٰ اور پیشوا بن گئے ہو۔

ابن کثیر حدیث غدیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صدر حدیث یعنی حدیث کا ابتدائی حصہ (من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ) متواتر و یقینی ہے اور اس میں کسی قسم کا شک و شبہ روا نہیں البتہ دعائیہ کلمات (اللھم وال ...) گو متواتر نہیں لیکن مضبوط و مستحکم حوالوں سے نقل ہوئے ہیں۔ تائید کے طور پر وہ رباح بن حارث سے روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ جناب امیر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے مولیٰ کا خطاب دے کر آپ کو سلام عرض کیا۔ آپ نے پوچھا'

میں کیسے تمہارا مولیٰ بن گیا۔؟ تو انہوں نے کہا کہ انہوں نے غدیر خم کے دن سرکار رسالت مآب کی زبانی سنا تھا۔ راوی کہتا ہے کہ جب اس نے کسی سے ان لوگوں کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ قبیلہ انصار کے کچھ لوگ تھے جن میں ابوایوب انصاری بھی تھے۔

ابن کثیر ابو ہریرہ سے بھی اس ضمن میں دو روایتیں نقل کرتے ہیں پہلی روایت میں ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ وہ مسجد میں گئے تھے کہ کچھ لوگ ان کے گرد جمع ہوگئے۔ اتنے میں ایک نوجوان کھڑا ہوا اور پوچھنے لگا کہ کیا انہوں نے غدیر خم میں جناب رسالت مآبؐ کو من کنت مولاہ ... کہتے سنا تھا تو انہوں نے کہا ہاں۔ دوسری روایت میں ابو ہریرہ تصدیق کرتے ہیں کہ آیۂ اکمال

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا[1]

آج کے دن ہم نے تمہارے دین کو کامل کیا تم پر اپنی نعمت تمام کردی اور تمہارے لئے اسلام کو دین و آئین کی حیثیت سے قبول کرلیا' غدیر کی مناسبت سے سرکار رسالتمآبؐ پر نازل ہوئی تھی۔

ابن کثیر مزید لکھتے ہیں کہ جناب امیر علیہ السلام نے رحبہ کے مقام پر کچھ تعداد میں ان صحابہ کو جمع کیا جو حجتہ الوداع میں موجود تھے۔ چنانچہ ان میں سے ستر افراد نے جو کہ اصحاب بدر بھی تھے گواہی دی کہ غدیر خم میں سرور کونین نے حضرت علی کا ہاتھ پکڑ کر مسلمانوں سے اقرار لیا تھا'

الست اولی بالمئومنین من انفسھم

کیا میں مومنوں کے نفسوں پر ان سے زیادہ حقدار نہیں ہوں۔

لہٰذا جب لوگوں نے اثبات میں جواب دیا اور اقرار کرلیا تب آنحضرتؐ نے فرمایا من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ۔

آخر میں ابن کثیر غدیر کے موضوع پر طبری کی دو جلدی کتاب کا تذکرہ بھی کرتے ہیں جس میں اس نے حدیث کی مختلف نقلوں اور متعدد اسناد اور حوالوں کو جمع کیا لیکن یہ نتیجہ نکالا کہ گو حدیث غدیر ناقابل انکار اور متواتر ہے لیکن شیعوں کے کام کی نہیں[2]۔

بہر حال واقعہ غدیر ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اسی انداز اور انہی لفظوں میں جنہیں ہم ذکر کرچکے ہیں تمام مورخین و محدثین اس حدیث کو نقل کرتے ہیں۔ اس زمرہ میں'

---

[1] مائدہ ۳۔
[2] بدایہ ونھایہ ابن کثیر۔

مسند احمد

تفسیر رازی

ذخائر العقبیٰ

ریاض النضرہ

فیض الغدیر

اور دوسری معتبر اور اہم کتابیں آجاتی ہیں۔ ان تمام کتابوں کے مصنفین بڑی صراحت سے اس مبارکباد کا تذکرہ بھی کرتے ہیں جو اعلان ولایت کے بعد حضرت عمر نے جناب امیر علیہ السلام کو پیش کی تھی۔ جبکہ حضرت ابوبکر کی طرف سے دی گئی مبارکباد کو اور اسی طرح آیۂ اکمال کے غدیر کے موقعہ پر نازل ہونے کو مورخین کی ایک خاص جماعت لکھتی ہے۔

شیخ مفید غدیر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم میں حضرت علی علیہ السلام کے لئے ایک خیمہ مخصوص کر دیا تھا اور مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ وہ گروہ در گروہ جائیں اور مسلمانوں کے امیر اور مولیٰ بننے پر انہیں خراج تحسین پیش کریں۔ چنانچہ سب نے اس حکم کی تعمیل کی یہاں تک کہ عورتیں اور ازواج رسولؐ بھی ان میں شامل تھیں[1]۔

شیخ محمد یعقوب کلینی اس ضمن میں علی بن ابراہیم اور دوسرے ثقہ و مورد اعتماد راویوں کے سلسلہ سے امام محمد باقرؑ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں۔

اس روایت میں پانچویں امام علیہ السلام فرماتے ہیں'

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو جناب امیر علیہ السلام کی خلافت کے تعین کا حکم دیا اور یہ آیۂ شریفہ نازل کی'

---

[1] کتاب الارشاد۔

انما ولیکم اللہ و رسولہ الذین آمنوا الذین یقیمون الصلوۃ ویوتون الزکوۃ وھم راکعون ○[1]

تم لوگوں کے ولی و سرپرست تو صرف اللہ تعالیٰ، اس کا رسولؐ اور وہ مومنین ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکوۃ دیتے ہیں۔

لیکن جب لوگ اس آیۂ مبارکہ سے صحیح مفہوم اخذ نہ کرسکے اور باری تعالیٰ کے مقصود و مراد تک نہ پہنچ سکے تو اس نے اپنے حبیب کو اس آیۂ مبارکہ کی تفسیر و توضیح کرنے کے لئے کہا۔ دوسری طرف سے جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے خائف تھے کہ اگر وہ من و عن مفہوم کو واضح کر دیں تو لوگ اسے جھٹلائیں گے اور دین سے منہ پھیرلیں گے اور اس طرح اب تک کی گئی تمام زحمتوں پر پانی پھر جائے گا چنانچہ جب انہوں نے بارگاہ الٰہی میں راز و نیاز کیا تو اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ کی ۶۷ ویں آیۂ شریفہ نازل کی جس میں اس پیغام کو پہنچانے کے صریح حکم کے ساتھ دشمنوں کے شر سے رہائی کی گارنٹی بھی دی گئی تھی لہٰذا جب انہوں نے جرات سے کام لیتے ہوئے غدیر خم میں مولائے متقیان کے ولی و خلیفہ ہونے کا اعلان کیا تو باری تعالیٰ نے دین کے کامل ہونے کی نوید دی اور نعمت کے تمام ہونے کی خوشخبری سنائی چنانچہ آیۂ اکمال نازل ہوئی[2]۔

ابن جوزی غدیر خم کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

تمام سیرت نگار متفق ہیں کہ واقعہ غدیر ۱۸ ذی الحجہ کو حجتہ الوداع سے واپسی پر پیش آیا جبکہ تقریبا ایک لاکھ بیس ہزار کی تعداد میں صحابہ پیغمبر اسلامؐ کے حلقہ بگوش تھے۔ ان تمام حاضرین نے اشارہ کنایہ سے نہیں بلکہ خود آنحضرتؐ کی زبانی حدیث غدیر سنی تھی۔ مزید تائید کے طور پر وہ ابو اسحاق ثعلبی کی تفسیر سے ایک روایت نقل کرتے ہیں۔ روایت میں ملتا ہے کہ آنحضرتؐ نے جب غدیر

---

[1] مائدہ۔ ۵۵۔
[2] الکافی۔

خم میں یہ حدیث ارشاد فرمائی تو یہ قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں پھیل گئی یہاں تک کہ حرث بن نعمان فہری نامی شخص کو اس کی خبر ہوئی۔ وہ بھاگا دوڑا حضور اکرمؐ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا'۔

اے محمدؐ تم نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اپنی رسالت کا اقرار ہم سے لیا اور ہم نے اسے بسرو چشم قبول کیا پھر تم نے دن و رات میں پنج وقتہ نماز' رمضان میں روزے بھی فرض کر دیئے اور حج و زکوۃ کو بھی واجب الاداء قرار دے دیا۔ پھر اس پر بھی اکتفاء نہ کیا اور اپنے چچازاد بھائی کو ہمارے سروں پر مسلط کر دیا اور کہا۔ من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ کیا یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یا تمہاری اپنی طرف سے۔؟

یہ سن کر آنحضرتؐ کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہوگئیں۔

آپ نے فرمایا۔

اس ذات واحد کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا نہ کہ میری جانب سے۔

آنحضرتؐ نے قاطعیت کے ساتھ اس جملہ کو تین مرتبہ دہرایا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اے خدا اگر یہ حق ہے تو آسمان سے مجھ پر پتھر برسیں یا دردناک عذاب نازل ہو۔

راوی لکھتا ہے کہ وہ ابھی اپنی اونٹنی تک بھی نہ پہنچ پایا تھا کہ آسمان سے ایک پتھر آیا اور اسے حقارت آمیز انداز میں ہلاک کر گیا اور خداوند متعال نے اپنے حبیب پر یہ آیۂ شریفہ نازل کی'

سال سائل بعذاب واقع للکافرین لیس لہ دافع ٥[1] مانگنے والے نے عذاب مانگا اور بے شک کافروں کے لئے اس سے کوئی راہ فرار نہیں۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن جوزی حدیث غدیر میں موجود لفظ

---

[1] سورۂ معارج۔ ۱۔

مولا پر بحث کرتا ہے۔ لہٰذا تمام معانی بمع مثالوں کے بیان کرنے کے بعد انہیں رد کر دیتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ حدیث مذکور میں مولیٰ سے مراد وہ شخص ہے جو کسی چیز کا زیادہ حقدار ہو اور زیادہ سزاوار ہو جیسا کہ آیۂ ذیل میں لفظ مولیٰ انہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

فالیوم لایوخذ منکم فدیه ولامن الذین کفروا ماواکم النار هی مولا کم[۵۱]

اس دن تم لوگوں سے کوئی غرامت جنگی نہ لی جائے گی اور نہ ہی ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کو اختیار کیا' تم سب کی پناہ گاہ اور ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے اور یہی تمہاری مولیٰ ہے (یعنی تمہارے لئے زیادہ سزاوار ہے)۔

نتیجتاً" حدیث غدیر کے معنی یہ ہوں گے کہ'

میں جس جس کے نفس پر اس سے زیادہ حق رکھتا ہوں علی بھی اس کے نفس پر اس سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔

تائید کے طور پر ابن جوزی ابوالفرج اصفہانی کی لغت کی کتاب مرج البحرین کا حوالہ دیتے ہیں کہ انہوں نے بھی لفظ مولیٰ کے معنی ذکر کئے ہیں۔ پھر ان کا کہنا ہے کہ صدر حدیث میں آنحضرتؐ کا یہ جملہ کہ کیا وہ مومنوں کے جان و مال پر ان سے زیادہ سزاوار نہیں؟ اس بات کی مکمل تصدیق کر دیتا ہے۔ چنانچہ حدیث غدیر صراحت کیساتھ امیرالمومنین حضرت علی کی ولایت کا اعلان کرتی ہے

---

[۵۱] سورۂ حدید ۱۵.

اور انہیں واجب الطاعت قرار دیتی ہے[لہ] -

لہ تذکرۃ الخواص۔ صفحہ نمبر ۲۵ طباعت بیروت موسسہ اہل البیت۔ ابن جوزی حدیث غدیر کو امام احمد اور اہلسنت کے دوسرے بزرگان اور مشائخ سے نقل کرتے ہیں اور خاصے شواہد کی موجودگی میں حدیث پر تبصرہ کرتے ہیں۔ نیز آخر میں غدیر پر کہے گئے اشعار کو بھی نقل کرتے ہیں البتہ مصنف نے اختصاراً" صرف مذکورہ چیزوں کو نقل کیا ہے۔

نوٹ۔ حیرت ہے کہ حدیث غدیر جس کے بارے میں اہلسنت کے بزرگان یہ کہیں ان کا ایک بہت بڑا طبقہ جب اس کی صحت پر شبہ ڈالنے سے عاجز آجائے تو اس کی توجیہہ کرے اور کہے کہ آنحضرتؐ اس حدیث کے ذریعہ مسلمانوں پر واضح کردینا چاہتے تھے کہ علیؑ ان کے چچازاد بھائی یا دوست ہیں حالانکہ خود اہلسنت کی کتابوں میں ملتا ہے کہ جب علمائے اہلسنت نے یہ توجیہ مامون الرشید کے حضور میں کی تو اس نے اسے ماننے سے انکار کردیا اور کہا کہ تم اپنے دیوتاؤں کو سر پر نہ چڑھاؤ۔ (رجوع کریں غدیر خم۔ ابن حسن نجفی صفحہ نمبر ۴۳) روایات اہل بیت میں واقعہ غدیر کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔اور بقول امام خمینی یہ اس لئے نہیں کہ صرف جشن منالیا جائے اور مٹھائی تقسیم ہوجائے اور نہ ہی اس کے ذریعہ اس امامت کا اعلان کرنا مقصود تھا جو شیعوں کے اصول دین میں سے ہے بلکہ آنحضرتؐ اس طرح سیاسی طور پر جناب امیرؑ کی خلافت اور حکومت کو استحکام بخشنا چاہتے تھے۔

رخصت کے لمحات میں آنحضرتؐ کے ساتھ

جو پالیسی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جناب امیر علیہ السلام کو اپنا جانشین بنانے اور خلافت ان کے سپرد کرنے کے لئے اختیار کی تھی اس کا اختتام غدیر خم پر نہ ہوا تھا بلکہ دعوت ذوالعشیرہ، غزوہ تبوک اور خود غدیر خم کی طرح ابھی یہ سمجھانے اور واضح کر دینے کا ایک اور موقعہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ یہ سب کچھ جناب امیرؑ کی خلافت کے لئے کر رہے ہیں۔

تاریخ شناس لوگ پورے اتفاق سے لکھتے ہیں کہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت ابو بکر و عمر اور دوسرے مہاجر و انصار پر مشتمل ایک بڑا لشکر ترتیب دینے اور اسے سرزمین حجاز کی شمالی سرحدوں کی طرف روانہ کرنے کے علاوہ کچھ نہ کیا۔ اس لشکر کی قیادت آنحضرتؐ نے ایک ابھرتے ہوئے بہادر نوجوان، اسامہ بن زید کے سپرد کی۔ حالانکہ مسلمانوں کے درمیان اس سے زیادہ کار آزمودہ اور تجربہ کار لوگ موجود تھے۔ لہٰذا اسامہ جیسے نوجوان لڑکے کی قیادت میں ایک مہم پر روانہ ہو جانا صحابہ پر سخت ناگوار گذرا۔ چنانچہ سرگوشیاں ہونے لگیں اور ہر طرف یہ

مطالبہ زور پکڑنے لگا کہ اسامہ کے علاوہ کسی اور کو اس عہدہ پر منصوب کیا جائے۔

آنحضرتؐ شدید بیماری میں اٹھ کر لوگوں کے پاس آئے۔ ان کے چہرہ مبارک پر ناراضگی اور سختی کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے لوگوں سے خطاب کیا اور انہیں اسامہ کی زیر قیادت روانہ ہونے کی ہدایت دی۔ پھر فرمایا

"معبود کی قسم اگر تم آج اس کی قیادت کے بارے میں باتیں بنا رہے ہو تو کل کون سا اس کے باپ کی تقرری پر خاموش تھے؟ حالانکہ جس طرح اس کا باپ اس عہدہ کی لیاقت رکھتا تھا اس طرح وہ بھی اس کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔"

عین اسوقت جب آنحضرتؐ لوگوں کو اسامہ کے لشکر میں شامل ہونے اور اس کے ساتھ اس مہم پر نکل جانے کا حکم دے رہے تھے' لوگ بہانہ بازی اور ٹال مٹول میں مصروف تھے۔ لہٰذا آنحضورؐ نے فرمایا

"اسامہ کے لشکر کو نافذ و جاری رکھو اور اس کی پابندی کرو' خدا اس پر لعنت بھیجے جو اسامہ کے لشکر کی خلاف ورزی کرے"

ابن ہشام لکھتا ہے کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے لوگوں کو اسامہ کے لشکر میں شمولیت پر سست ٹھہرایا۔ اور باوجود یہ کہ درد پوری شدت سے ان پر حاوی تھا لیکن وہ باہر تشریف لائے۔ اس وقت ان کے سر پر کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ انہوں نے لوگوں کو جنگ و جہاد کی ترغیب دی اور فرمایا'

"اے لوگو بہت جلد میرا بلاوا آنے والا ہے اور میں اس دعوت پر ہاں کہوں گا۔ بے شک میں تمہارے درمیان خدا کی کتاب اور اپنی عترت و اہل بیت جیسی گراں بہا اور نایاب چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ خداوند لطیف و خبیر نے مجھے بتایا تھا کہ یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں گے۔ ہاں! اب دیکھنا یہ ہے کہ تم کس طرح سے ان دونوں میں میری پیروی کرتے ہو"

شیخ مفید اس پر آنحضرتؐ کے اس فرمان کا اضافہ کرتے ہیں۔

"اے لوگو میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے بعد تم دوبارہ کافر ہو گئے ہو اور ایک دوسرے کی گردن زنی اور خون بہانے میں مصروف ہو۔ پس اس دن تم مجھ سے اس حال میں ملو گے جبکہ ایک لشکر جرار میرے ساتھ ہو گا۔ آگاہ رہو کہ میرے بھائی و وصی میرے بعد قرآن مجید کی تفسیر و تاویل کے لئے جنگ کریں گے جیسا کہ انہوں نے قرآن کریم کے نازل ہونے پر جہاد کیا تھا۔"[1] یہ اور نہ جانے اس کے علاوہ کتنی ایسی احادیث اور اقوال جو حضور مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مقصود اور ان کے مورد نظر مطلب کو بخوبی واضح کرتے ہیں اور اس ضمن میں تھوڑا بہت ابہام بھی باقی نہیں رہنے دیتے۔ پھر یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ وہ چند دن کے مہمان ہیں، اسامہ کے لشکر کی روانگی پر تاکید اور خلافت پر نظریں جمانے والوں کی اس میں شمولیت پر اصرار صرف اس لئے تھا کہ وہ میدان کو جناب امیر علیہ السلام کے لئے خالی کرنا چاہتے تھے![2] لہٰذا جب انہی دنوں میں مسلمانوں کی ایک جماعت ان کی عیادت کے لئے آئی اور وہ مطمئن تھے کہ وہ دار فانی سے کوچ کیا چاہتے ہیں تو انہوں نے پچھلی صراحتوں سے قطع نظر کر کے جناب امیر علیہ السلام کی خلافت کو ایک خاص دستاویز میں قلمبند کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تاکہ کسی میں تحریف کی مجال اور انکار کی توان باقی نہ رہے۔ لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ چیزیں

---

[1] اس حدیث میں حضور اکرمؐ نے اپنی وفات کے بعد کے حالات کے بارے میں پیشنگوئی فرمائی ہے۔ وہ احساس دلا رہے ہیں کہ قیامت کے دن وہ یکہ و تنہا نہ ہوں گے بلکہ ایک عظیم الشان لشکر ان کے ہمراہ ہوگا۔ البتہ چونکہ انہوں نے فرمایا تھا کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہوں گے لہٰذا ایسے میں کس کا ساتھ دینا چاہئے یا یہ کہ کون حق پر ہوگا؟ چنانچہ آنحضرتؐ نے ان پر واضح کیا کہ جناب امیرؑ۔ تاویل و تفسیر پر لڑنے سے مراد یہ ہے کہ اس دور میں کوئی یہ نہ کہتا تھا کہ یہ کلام ربوبی نہیں ہے بلکہ اس کے مفاہیم اور معانی کو لوگ نہ مانتے تھے اور اس میں توجیہ و تحریف کرتے تھے لہٰذا آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جس طرح کہ حضرت علیؑ نے مشرکین سے اس بات پر جنگ لڑی تھی کہ یہ کلام مقدس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اور پیغمبرؐ کا کلام نہیں اسی طرح وہ ان لوگوں کے خلاف بھی جنگ کریں گے جو اس کی تفسیر اور معانی کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

[2] رجوع کریں شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید) ج ۳ صفحہ ۱۷۲۔

تھیں جن سے آنحضورؐ ڈرتے تھے لہٰذا بھرپور کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح جناب امیر علیہ السلام کو کرسی خلافت پر بٹھلا دیں۔ بہرصورت صاحبان روایت متفق ہیں کہ انہوں نے امت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گمراہی سے نجات دلانے کے لئے قلم و دوات چاہی تھی اور کچھ لکھنے کا اظہار کیا تھا۔ اور بظاہر کچھ لوگ اس حکم کی تعمیل کے لئے کھڑے بھی ہو گئے تھے لیکن حضرت عمر نے انہیں یہ کہہ کر بٹھا دیا تھا کہ یہ شخص ہذیان بک رہا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذلک)

صحیح بخاری اس کے بارے میں رقم کرتی ہے کہ جب کچھ لوگ رسول اللہؐ کے گرد جمع ہوئے جن میں حضرت عمر بھی تھے تو آنحضورؐ نے لوگوں سے کہا،

"جاؤ مجھے کچھ لا دو تاکہ تمہارے لئے وہ چیز لکھ دوں جس کے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے"

حضرت عمر نے اس پر کہا کہ نبیؐ پر بیماری غالب آگئی ہے اور ہمارے پاس قرآن ہے۔اور قرآن کریم ہی ہمارے لئے کافی ہے۔

ان کا یہ کہنا تھا کہ حاضرین میں اختلاف پھوٹ پڑا یہاں تک کہ حضور اکرمؐ نے ان سب کو چلے جانے کے لئے کہا[۱]۔

دوسری روایت کے مطابق جب لوگوں نے حضور اکرمؐ کی اس طرح مخالفت کر لینے کے بعد قلم و دوات لانے کی حامی بھری تو آنحضورؐ نے فرمایا۔

"نہیں! کیا اتنا کچھ کہہ لینے کے بعد بھی، لیکن میں تمہیں اپنے اہل بیت سے حسن سلوک اور نیکی کی وصیت کرتا ہوں"

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بیماری سے متعلق تمام روایات جو بہت سے ماجرا اور واقعات لئے ہوئے ہیں، کسی ایسی چیز کے لکھنے کے بارے میں آنحضورؐ کی رغبت کو بیان کرتی ہیں جو امت مسلمہ کو حق و

---

[۱] صحیح بخاری جلد چہارم (جز ہفتم)، کتاب المرضیٰ والطب باب ۲۵۷ صفحہ ۲۵۵ دارالقلم بیروت لبنان ۱۹۸۷ء ایڈیشن۔

ہدایت پر جمع کر دے اور سچی راہ دکھا دے۔ یہ تمام روایتیں قریب الاتفاق ہیں کہ حضرت عمر اس کار خیر میں حائل ہوئے اور بالائے ستم یہ کہ انہوں نے حضور انورؐ کی گفتگو کو بیکار و فضولیات سے تعبیر کیا۔ اگر اس لکھنے کا تعلق مسلمانوں کی آئندہ سرنوشت اور خلافت و ریاست کے مسائل سے نہ ہوتا تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتے۔ اور شاید آنحضرتؐ نے بھی جب ان لوگوں کے اس قسم کے یا اس سے ملتے جلتے رجحانات دیکھے تو اس دستاویز کے لکھنے سے گریز کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ با آسانی اس تہمت اور ناروا نسبت کی پوری تشہیر اور پبلسٹی کریں گے۔ اور اس طرح یہ تحریر اور دستاویز کالعدم اور بے اثر ہو جائے گی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد انہوں نے اس چیز کے لکھنے سے مطلقاً انکار کیا اور فرمایا۔

"کیا سب کچھ کہہ لینے کے بعد بھی ......!!"

یہ جملہ اس بات کا غماز ہے کہ اگر آنحضرتؐ ان کے لئے بیسیوں وصیتیں بھی لکھ کر چھوڑ جاتے تو وہ انکا انکار کرنے کے لئے تاویل و تحریف کے راستے ڈھونڈتے اور جب اس سے بھی عاجز آ جاتے تو یہ کہتے کہ اس تحریر کو قلمبند کرتے وقت آنحضرتؐ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ یہ جملہ کہہ کر انہوں نے آخری رسولؐ کی ان چیزوں کو شک و تردید کی نگاہ سے دیکھنے کی بنیاد ڈالی جنہیں جناب ختمی مرتبتؐ اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھ کر لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ اس لئے کہ انہوں نے اس بات کا احتمال دے دیا کہ شاید آنحضورؐ مصروف گفتگو ہوں جبکہ ان کے ہوش و حواس بجا نہ ہوں (خاکم بدہن) لیکن جب لوگوں نے بہت اصرار کیا تو انہوں نے لوگوں کو تین چیزوں کی وصیت فرمائی۔ ایک مشرکوں کے جزیرۃ العرب سے اخراج کے بارے میں تھی اور دوسری وفود کی آمدورفت کو آزاد رہنے دینے سے متعلق تھی اور بقول راوی کے تیسری وصیت وہ بھول گئے۔ البتہ اہل بیت علیہم السلام سے موصول شدہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری وصیت حضرت امیرؑ کی خلافت کے بارے میں تھی۔

صحیح بخاری سعید بن جبیر کے حوالہ سے ابن عباس سے نقل کرتی ہے کہ

جمعرات کے دن رسول اللہؐ کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی اور درد میں شدت آگئی تھی لہٰذا انہوں نے فرمایا۔

"مجھے کوئی چیز لا دو تا کہ وہ کچھ لکھ دوں جس کے بعد تم ہمیشہ کے لئے گمراہی سے نجات پاسکو"

آنحضرتؐ کی گفتگو سن کر حاضرین میں بحثا بحثی شروع ہو گئی حالانکہ انہیں زیب نہ دیتا تھا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حضور لڑتے جھگڑتے کچھ نے کہا اس شخص کا کیا کہنا جو لغو اور بیہودہ باتیں بولتا رہتا ہے جاؤ اس سے پوچھو کیا کہتا ہے لہٰذا جب لوگ پوچھنے کے لئے گئے تو آنحضورؐ نے فرمایا'

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اس لئے کہ جس طرف تم کھینچ لے جانا چاہتے ہو اس سے بہتر یہ ہے کہ اسی حال میں رہوں۔ پھر آنحضرتؐ نے انہیں تین چیزوں کی وصیت فرمائی۔ پہلی وصیت جزیرۃ العرب سے مشرکین کے اخراج کے بارے میں تھی دوسری وفود کی آمدورفت سے متعلق اور تیسری کو راوی نے یا تو یکسر نظر انداز کر دیا یا یہ کہا کہ وہ بھول گئے ہیں جیسا کہ امام بخاری صحیح بخاری میں لکھتے ہیں"[1]

اہلسنّت کے مآخذ و مصادر اس حدیث کو بعینہٖ نقل کرتے ہیں۔ اس ضمن میں

☆ طبقات کبریٰ

☆ تاریخ طبری

☆ بدایہ و نہایہ ابن کثیر

☆ صحیح مسلم

اور دوسری کتابیں شامل ہیں۔ ان تمام نقل شدہ روایتوں میں صرف دو

---

[1] باب مرض النبی۔ مجلد الثالث (تیسری جلد)۔

وصیتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اور تیسری وصیت کو یا تو گوشہ تاریکی میں رہنے دیا ہے یا اس دور کے حکام و سلاطین کا دل جیتنے کے لئے اسے بھلا دیا گیا ہے۔حالانکہ یہ حادثہ اپنی نوعیت کا پہلا اور آخری حادثہ ہے۔کیونکہ اب تک کسی راوی نے کسی چیز کو بھلایا نہیں تھا۔ جن لوگوں نے جناب ختمی مرتبت کی مبارک زندگی کا ہر قول اور فعل لوح و قلم کے دامن میں سمیٹ لیا ہو یہاں تک کہ ان کی سانسوں کو بھی گن لیا ہو وہ کیونکر اتنی کثرت کے باوجود ان کی زندگی کے آخری لمحوں اور وداع کی قیمتی گھڑیوں میں اتنی بڑی غلطی کے مرتکب ہو سکتے تھے!!!

لہٰذا اگر یہ تیسری وصیت خلافت کے بارے میں نہ ہوتی اور اس بارے میں ان کی گذشتہ احادیث کی تاکید نہ کرتی تو اسے ہرگز فراموشی اور طاق نسیان کے سپرد نہ کیا جاتا۔

بہرحال ان حالات میں بیماری جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو نڈھال کئے دے رہی تھی' اور درد کی شدت بڑھتی جا رہی تھی لیکن وہ کبھی اسامہ کے لشکر میں شمولیت پر اصرار کرتے تو کبھی اسامہ کو جلد روانگی کا حکم صادر کرتے۔ اور باوجودیکہ ان کی صحت و سلامتی کی طرف سے مطمئن ہونے کیلئے اسامہ نے ان سے چند دن کی مہلت مانگی تھی لیکن انہوں نے اجازت نہ دی۔

وفات سے کچھ گھنٹہ قبل درد میں کمی واقع ہوئی تو وہ ایک طرف سے فضل بن عباس کا سہارا لئے اور دوسری طرف سے جناب امیرؑ پر تکیہ کئے باہر تشریف لائے۔ مسلمان انہیں دیکھ کر خیال کرنے لگے کہ آنحضورؐ کی حالت بہتر ہوتی جا رہی ہے لہٰذا وہ دوبارہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ابھی کچھ دیر نہ ہوئی تھی کہ پھر سے حالت بگڑ گئی اور وہ رفیق اعلیٰ اور محبوب حقیقی کو یاد کرنے لگے۔ اس دار فانی سے رخصت ہوتے دیکھ کر جناب امیر علیہ السلام نے انہیں اپنے سینے سے لگا لیا اور جب ان کے انفاس شریفہ اور پاک سانسوں کا سلسلہ منقطع ہوا تو وہ جناب امیرؑ کے سینہ پر تھے۔ اس وقت ماہ صفر کے ختم

ہونے میں ابھی دو راتیں باقی رہ گئیں تھیں جیسا کہ زیادہ تر مورخین نقل کرتے ہیں۔

بیس سال کی اس مسلسل تلاش و کوشش اور لگاتار جنگوں کے بعد کہ جن میں ایک لمحہ بھی آرام و آسائش کیلئے باقی نہ بچا تھا' انہوں نے اپنی مرضی سے خالق حقیقی کے وصال کو انتخاب کیا تھا اور دنیاوی زندگی کے عیش و نشاط میں فنا ہونے کے بجائے ہمیشگی کی زندگی کو اپنا لیا تھا تاکہ اپنے اصحاب کے دلوں میں ان قدروں کو مستحکم کر سکیں جن کی طرف ساری زندگی بلاتے رہے۔اور یوں یہ ورثہ آئندہ نسلوں میں منتقل ہو کر اس دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائے اور ہر دور اور ہر زمانہ میں محفوظ رہے۔انہوں نے بستر مرگ پر جبکہ وہ شدت درد سے کراہ رہے تھے مسلمانوں کو اس ورثہ کی پاسداری کا احساس دلایا اور ان پر واضح کر دیا کہ صرف قرآن حکیم اور اہل بیت علیہم السلام کے سائے میں رہ کر وہ اس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

آنحضرتؐ نے مزید چاہا کہ انہیں ہمیشہ کے لئے تباہی و ہلاکت سے نجات دلا دیں اور اس راز کو صفحہ قرطاس پر قلمبند کر دیں تا کہ کوئی اس میں تحریف نہ کر سکے لیکن جب انہوں نے خود آنحضرتؐ کے بارے میں ناروا باتیں شروع کر دیں اور ان کی سنہری گفتگو کو ہذیان و فضولیات سے تعبیر کیا تو وہ لوگوں سے مایوس ہو گئے اور اسی حال میں خالق حقیقی سے جا ملے اور انبیاء و اولیا کی صف میں جا پہنچے۔

اس وداع سے پہلے ہی انہوں نے مسلمانوں کے تاریک مستقبل کی پیش بینی کر دی تھی اور انہیں احساس دلا دیا تھا کہ آنے والے وقت میں فلاح پانے والوں کو انگلیوں پر گنا جائے گا جیسا کہ بخاری اور دوسرے محدث روایت کرتے ہیں۔

مورخین کو اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ آنحضورؐ کی وفات کے وقت حضرت ابوبکر شہر سے باہر تھے اور آنحضرتؐ کے گرد جناب امیرؑ سمیت بنی ہاشم تھے۔ جیسے ہی لوگوں کو ان کی وفات کا علم ہوا تو وہ دھاڑیں مار کر رونے لگے

، عورتیں چیخنے پکارنے لگیں اور مسجد نبوی اور اس کے اطراف میں لوگ کثرت سے جمع ہو گئے ۔ کوئی رو رہا تھا، کوئی پیٹ رہا تھا، کسی کی چیخیں اور کسی کی آہیں بلند تھیں اور کوئی پکار پکار کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

اس غم و اندوہ میں جبکہ لوگوں کا برا حال تھا حضرت عمر آنحضرتؐ کے جسد اطہر کے پاس آئے ۔ انہوں نے آنحضورؐ کے چہرہ مبارک پر سے چادر اٹھائی اور پھر لوگوں میں واپس پلٹ گئے ۔ پھر وہ مسلمانوں کے اس جم غفیر میں دوڑتے بھاگتے اور تلوار لہراتے ہوئے دیکھے گئے اور ان سے یہ سنا گیا کہ '

"منافق سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ مرگئے ہیں ۔ نہیں! ہرگز نہیں!! وہ مرے نہیں بلکہ حضرت موسیٰؑ بن عمران کی طرح اپنے پروردگار سے ملاقات کرنے گئے ہیں اور انہی کی طرح واپس آئیں گے اور منافقوں کے ہاتھ پاؤں قلم کریں گے ۔"

روایت میں یہ تفصیل بھی موجود ہے کہ جس کسی نے بھی اس وقت غلطی سے آنحضرتؐ کی وفات کی بات زبان سے نکالی حضرت عمر نے اسے بری طرح ڈرایا، دھمکایا اور اس گفتگو سے اس غریب کو دست بردار ہونا پڑا۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح مجمع پر چھائے رہے ۔ ابن سعد اور ابن کثیر کی روایتوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو یہ دلاسہ بھی دیتے رہے کہ آنحضورؐ حضرت موسیٰؑ کی مانند چالیس روز کے بعد واپس آجائیں گے ۔

حضرت عمر کی ان باتوں سے سیدھے سادے مسلمانوں کے دلوں میں یہ امید بندھ گئی کہ آنحضورؐ ضرور واپس آئیں گے ۔ لیکن ان کی یہی باتیں سنجیدہ لوگوں کے لئے باعث تشویش بنی تھیں۔ اور وہ پریشان تھے کہ حضرت عمر جیسے ذہین شخص کس طرح موت جیسی اٹل اور ناگزیر حقیقت کا انکار کر سکتے ہیں؟

بہرحال حضرت ابو بکر کے شہر پہنچنے تک حضرت عمر اسی نظریہ پر ڈٹے رہے ۔ وہ آئے تو حضرت عمر بھی اس مقام تک ان کے ساتھ آئے جہاں سرور کونین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا جسد اطہر رکھا تھا۔ انہوں نے آنحضورؐ کے چہرہ انور سے چادر اٹھائی ایک نگاہ ڈالی اور پھر لوگوں میں جاکر ان سے خطاب کیا۔

"اے لوگو! جو محمدؐ کی پرستش کرتا تھا وہ جان لے کہ محمدؐ مرگئے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو بے شک اللہ تعالیٰ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے ذیل میں دی ہوئی آیۂ شریفہ کی تلاوت کی'

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات اوقتل انقلبتم علی اعقابکم و من ینقلب علی عقبیه فلن یضر الله شئیا "[۱]

"محمدؐ تو بس خدا کے رسول ہیں ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر و مرسلین اس دنیا سے سدھار چکے ہیں۔ چنانچہ اگر وہ وفات پاگئے یا شہید کر دیئے گئے تو تم الٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے اور (دین الٰہی سے) پشت کر لو گے اور جو ایسا کرے گا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

حضرت ابوبکر کی یہ تقریر سن کر لوگوں کو کچھ اطمینان ہوا۔ ابن ہشام لکھتا ہے کہ اس موقعہ پر لوگ اس طرح مذکورہ آیۂ شریفہ کا زمزمہ کر رہے تھے گویا کہ اسی لمحہ نازل ہوئی ہو۔ اس طرح حضرت عمر کا پیش کردہ نظریہ بھی باطل ہو گیا اور خود وہ بھی اتنی جلدی اس سے دستبردار ہو گئے جیسا کہ انہوں نے مطلقاً کچھ نہ کہا تھا۔ تقریر کرنے کے بعد حضرت ابوبکر و حضرت عمر ابوعبیدہ کے ساتھ مسجد نبوی سے رخصت ہوئے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جسد اطہر کو جناب امیرؑ اور بنی ہاشم کے دوسروں سوگواروں کے حوالہ کر گئے کہ جنہیں اس مصیبت عظمیٰ اور آفاقی غم نے ہر فکر اور ہر سوچ سے یہاں تک کہ خلافت کے جھگڑوں سے بھی بے نیاز کر دیا تھا۔

البتہ اس سوال کے جواب میں کہ یہ لوگ کہاں گئے اور کس مقصد کے لئے؟؟ تاریخ خاموش ہے' لیکن آنحضورؐ کی وفات پر حضرت عمر کا وہ انوکھا

---

[۱] آل عمران۔ ۱۴۴' مذکورہ آیۂ شریفہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ انبیاء کی وفات اور ان کا اس دنیا سے کوچ کرنا دوسرے انبیاء کی طرح ایک سنت جاریہ ہے اس طرح اس نظریہ کی تردید ہوجاتی ہے جو حضرت عمر نے پیش کیا تھا اور دوسرے جملہ میں شاید لوگوں کے دین سے دل سرد ہوجانے یا بالکل پلٹ جانے کی طرف اشارہ ہے۔

نظریہ اور حضرت ابوبکر کی آمد پر اس سے باآسانی دستبردار ہو جانا اور پھر سب سے بڑھ کر وفات سے پہلے آنحضرتؐ کے ساتھ ان کا خاص رویہ' حضرت ابو بکر سے اسامہ کے لشکر میں عدم شمولیت پر اصرار اور بہت سے دوسرے شواہد و قرائن بخوبی اس سوال کا جواب دیتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ خلافت کے حصول کے لئے یہ لوگ' بہت عرصہ سے سوچ رہے تھے اور حضرت عمر کے یہ اقدامات اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں تھیں جس پر یہ لوگ بہت پہلے اتفاق کر چکے تھے۔

یہ وہ حقیقت ہے جس کا اظہار عرب مصنفین کی ایک جماعت اور مستشرقین کا ایک گروہ بھی کر چکا ہے لہٰذا ایک مشہور مستشرق لامینس[۱] اپنی کتاب میں لکھتا ہے'

"وہ جماعت جس کی سربراہی حضرت ابوبکر و عمر و ابو عبیدہ کو حاصل تھی' اچانک وجود میں نہ آگئی تھی بلکہ ایک گروہی سازش تھی جس کے اصول و ضوابط پورے استحکام و اتقان کے ساتھ مرتب کئے گئے تھے۔اس کے سرکردہ افراد حضرت ابوبکر و عمر و ابوعبیدہ تھے اور حضرت عائشہ و حفصہ اس کے اعضاء میں سے تھیں۔"

---

[۱] لامینس (Lammens) بیلجیم کا مشہور مستشرق (یسوعی) ہے۔ وہ عربوں کی جاہلیت اور عہد بنوامیہ کے بارے میں اپنی ابحاث سے کافی مشہور ہوا۔ اس کی متعدد تصنیفات ہیں "اسلام کا گہوارہ" مکہ ہجرت سے کچھ پہلے" "طائف ہجرت سے کچھ پہلے" "جزیرۃ عربی عرب ہجرت سے کچھ پیشتر" "اسلام" "خلافت معاویہ" وغیرہ وغیرہ۔ (منجد الاعلام)۔

سقیفہ بنی ساعدہ

اس بات کی تائید تاریخ و سیرت کے مستند حوالوں سے ہو چکی کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات پر جو انوکھا نظریہ حضرت عمر کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ وہ ان کے رفیق کار حضرت ابو بکر نے شہر آمد پر مسترد کر دیا۔ نتیجتاً" یہ نظریہ کالعدم ہو گیا۔ اسے مسترد کرنے کے بعد وہ حضرت عمر کے ساتھ ایک نامعلوم مقام کی طرف چلے گئے جو ہمارے اندازے کے مطابق ان لوگوں نے لازم تدابیر اختیار کرنے اور اہم فیصلے صادر کرنے کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔

اسی طرح انصار کے بارے میں بھی ہماری رائے یہ ہے کہ ان کی اکثریت بشمول ان کے بزرگ سعد بن عبادہ کے خلافت کو جناب امیر علیہ السلام کا اولین حق سمجھتی تھی اور عام مسلمانوں کی طرح انہیں بھی اس میں شائبہ نہ تھا کہ حقیقی خلیفہ حضرت علی علیہ السلام ہیں۔

لیکن جب ان پر واضح ہو گیا کہ مہاجروں کے سرکردہ شیوخ جناب امیر علیہ

السلام کو خلافت سے برکنار کرنے اور خود اس پر قابض ہونے کے لئے متحد ہوچکے ہیں۔ اور اس جاہ طلبی میں وہ نہ صرف آنحضورؐ کی تعلیمات و ہدایات سے منحرف ہوچکے ہیں بلکہ یہ پیمان درحقیقت گذشتہ تعصبات اور قبائلی جھگڑوں کی طرف پلٹتا ہے تو انہوں نے بھی سقیفہ بنی ساعدہ میں ایک اجلاس بلایا جس میں سعد بن عبادہ کو اپنی طرف سے خلافت کے لئے نامزد کیا۔ انہوں نے اسلام کے لئے وہ قربانیاں دی تھیں اور اس ایثار کا مظاہرہ کیا تھا جس کا تصور بھی مہاجر نہ کر سکتے تھے۔ اور یہ مہاجروں کی سیاست ہی تھی جس سے مجبور ہوکر انہیں یہ قدم اٹھانا پڑا تھا۔

جب انصار ہی میں سے کچھ لوگوں نے جو سعد بن عبادہ کے خلیفہ بننے کے مخالف تھے، یہ خبر مہاجروں تک پہنچائی تو وہ اس نامعلوم مقام کو چھوڑ کر سیدھے سقیفہ آئے۔ مہاجروں کی طرف سے ایک شخص نے انصار کے کارناموں اور ان کی طرف سے دی گئی قربانیوں پر ایک شاندار تقریر کی اور ان کی خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے مہاجروں سے درخواست کی کہ وہ خلافت کا کچھ حصہ انصاریوں کو بھی دیں۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر نے تقریر کی۔ انہوں نے قریش اور قریش کے آباء و اجداد کی تعریف و تحسین کے پل باندھ دیئے۔ اور اس طرح وہ ذہنوں کو ایک بار پھر عربوں کے فخر و مباہات اور قبائلی تعصبات کی طرف واپس لے گئے۔ انہوں نے کہا،

"ہم مہاجر اسلام لانے میں پیش پیش ہیں۔ ہمارے خاندان و قبیلے زیادہ پروقار و باعزت ہیں اور گھروں کی بناوٹ اور چیزوں کی وجاہت کے لحاظ سے ہم بہتر ہیں اور پھر حضرت رسول خداؐ سے بھی ہماری قرابتداری ہے۔"

انہوں نے انصار کو نصیحت کی کہ عرب قریش کے ان لوگوں کے علاوہ کسی اور کو قبول نہ کریں گے۔ لہٰذا جس امتیاز سے اللہ تعالیٰ نے ان کے مہاجر بھائیوں کو سرفراز کیا ہے اس میں انہیں ہرگز نہیں الجھنا چاہیے۔ پھر انہوں نے ابو عبیدہ بن جراح اور حضرت عمر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ انہوں نے ان

میں سے کسی ایک کا بیعت کیلئے انتخاب کر لیا ہے[۵۵]۔

ابھی ان کی تقریر ختم نہ ہونے پائی تھی کہ سعد بن عبادہ کے چچا زاد بھائی بشیر بن سعد خزرجی کی آواز ابھری اور حسد کے مارے اس نے حضرت ابوبکر کی بڑھ چڑھ کر حمایت کی'

"اے لوگو! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش سے تھے اوراس کام کے لئے انہی کی قوم زیادہ مناسب و موزوں ہے۔ خدا نہ کرے کہ میں کبھی اس مسئلہ میں ان کی مخالفت کروں۔"

انصار ہی میں سے ایک اور شخص حباب بن منذر نے بشیر کی بات کاٹتے ہوئے کہا'

"لگتا ہے کہ بشیر کواپنے چچا زاد بھائی سعد بن عبادہ کا خلیفہ بننا بہت برا لگتا ہے جب ہی اس قسم کی باتیں کرتا ہے کہ وہ خلافت کے مسئلہ میں کسی حقدار سے نہیں الجھے گا۔"

ابھی یہ بحثا بحثی جاری تھی کہ انصار میں سے قبیلہ اوس کے ایک سن رسیدہ شخص اسید بن حضیر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ اپنی تقریر میں زمانہ جاہلیت کے اختلافات کو ہوا دینے لگے اور اوس و خزرج کی ان باہمی رنجشوں پر تفصیلی روشنی ڈالنے لگے جسے اسلام نے مٹا دیا تھا۔ لہٰذا مذکورہ قبیلہ کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا'

"اے فرزند اوس! اگر تم نے سعد کو خلیفہ بنانے کی غلطی کی تو قبیلہ خزرج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تم پر حاوی ہو جائے گا اور خلافت میں تمہارے لئے کچھ نہ چھوڑے گا۔"

ان کا یہ جملہ ختم ہوتے ہی حضرت ابوبکر نے حضرت عمر اور ابو عبیدہ کا ہاتھ

---

[۵۵] عقد فرید کی روایت۔

تھام لیا اور لوگوں کو ایک بار پھر آواز دی

''اے لوگو یہ عمر اور ابو عبیدہ ہیں ان میں سے جس سے چاہو بیعت کر لو''

حباب بن منذر جوش میں آکر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے '

''اے جماعت انصار! اپنے ہاتھوں کو اپنے قبضہ میں رکھو اور ان لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرو کہ یہ تمہیں خلافت سے محروم کر دیں''

حباب کی یہ بات سنکر حضرت عمر کو غصہ آگیا۔ انہوں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا '

''ہم جو کہ آنحضرتؐ کی قوم و قبیلہ کے لوگ ہیں ہم سے صرف گمراہ کرنے والے ' عصیان کی طرف مائل اور ہلاکت میں غوطہ ور لوگ ہی آنحضورؐ کی ریاست و سلطنت میں الجھ سکتے ہیں''

حضرت عمر کے اس شدید حملہ پر حباب نے گروہ انصار کی طرف توجہ کر کے کہا '

''اگر یہ لوگ تمہاری درخواست مسترد کر دیں تو انہیں اپنے شہر و دیار سے نکال باہر کرو۔ خدا کی قسم تم اس کام کی ان سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہو۔ تمہاری ہی تلواروں سے بڑوں بڑوں کی گردنیں اس دین کی طرف جھکی ہیں۔''

پھر اس نے اپنی تلوار میان سے نکالی اور کہا '

''میں ہی وہ چھڑی ہوں جو خارش زدہ اونٹ کو درست کر سکتی ہے اور میں ہی وہ کھجور کا درخت ہوں جس کو سہارا دیا جا چکا ہو۔''[1]

یہ جملہ سن کر حضرت عمر کو طیش آگیا اور اگر ابو عبیدہ بن جراح بیچ بچاؤ نہ کراتے تو بات کہیں اور تک جا پہنچتی۔ انصار کو ٹھنڈا کرنے کے لئے انہوں نے

---

[1] یعنی حباب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اہل نظر اور صاحب رائے ہوں لوگ میرے محتاج ہیں اور میں اکیلا نہیں اس لئے کہ لوگ میرے ساتھ ہیں۔

انصار کی شان میں کئی قصیدے پڑھے اور دل بھر کر تعریف کی۔ حضرت عمر نے اسی موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور جھٹ سے حضرت ابوبکر کا ہاتھ پکڑ کر کہا'

"اے ابوبکر اپنا ہاتھ دیدو' کسی مائی کے لال میں یہ جرات نہیں کہ تمہیں اس مقام سے ہٹا سکے جس پر اللہ تعالٰی نے تمہیں فائز کیا ہے"

ابو عبیدہ نے اس پر شوشہ دیا'

"بے شک آپ مہاجروں میں افضل اور یار غار ہونے کے علاوہ نماز کی امامت میں آنحضورؐ کے خلیفہ ہیں"

حضرت ابوبکر نے ہاتھ دیا تھا کہ ان دونوں نے بیعت کر لی اور ان کے بعد بلا فاصلہ بشیر اور قبیلہ خزرج کے کچھ لوگوں نے بھی بیعت کر لی۔ ان کی دیکھا دیکھی اسید بن حضیر اوس کے کچھ لوگوں کو لئے اس بیعت میں شامل ہو گئے۔ اس طرح حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی گئی اور سقیفہ بنی ساعدہ سے فارغ ہو کر یہ لوگ حضرت ابوبکر کے حق میں نعرے لگاتے باہر نکلے۔ راستہ میں جس سے بھی ملاقات ہوتی اس کا ہاتھ پکڑ کر حضرت ابوبکر کے ہاتھ میں دے دیا جاتا اور بیعت لے لی جاتی چنانچہ اگر کوئی انکار کرتا تو حضرت عمر اس کے حساب کو پہنچتے اور طوعاًوکرہاً ہی اس سے بیعت لے لیتے۔ اس طرح حضرت ابوبکر خلیفہ بنا دیئے گئے اور اگرچہ عام لوگ اسے ایک حادثہ اور اتفاق سمجھتے تھے لیکن اگر ان لوگوں کے اقدامات کا دقت سے مطالعہ کیا جائے اور تمام حالات کا بھرپور جائزہ لیا جائے تو بخوبی واضح ہوجائے گا کہ جناب امیر علیہ السلام کو ہٹا کر خلافت پر مسلط ہونے کی یہ سازش صرف ایک گھنٹہ کی پیداوار نہ تھی بلکہ پس پردہ ایک قریشی جماعت تھی جس کے قائدین حضرت ابوبکر و عمرو ابو عبیدہ تھے جیسا کہ گذشتہ شواہد سے بھی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ البتہ انصار کا سعد بن عبادہ کو نامزد کرنا ایک زودرس اقدام تھا کہ قیادت کے بارے میں ان کا باہمی اختلاف اس بات کا کھلا ثبوت ہے۔ یوں تو مہاجرین انصار پر حاوی ہو گئے تھے لیکن انصار کو قائل کرنے کے لئے ان کے پاس دو دلیلوں سے زیادہ نہ تھیں۔

(۱) مہاجرین اسلام لانے میں انصار پر سبقت رکھتے ہیں۔

(۲) مہاجرین آنحضورؐ کے رشتہ دار اور ان سے زیادہ نزدیک ہیں۔

انہی دو دلیلوں کے بل بوتے پر وہ انصار پر غالب آ گئے تھے اور اگر واقعی یہی دو دلیلیں خلافت کا معیار تھیں تو اس لحاظ سے بھی خلافت صرف اور صرف جناب امیر علیہ السلام کو ملنی چاہیے تھی۔ اس لئے کہ اسلام لانے اور دل سے آنحضرتؐ کی رسالت کی گواہی دینے میں کوئی ان پر سبقت نہ لے جا سکا۔ مسلمان جانتے تھے کہ آنحضورؐ نے جب مکہ میں مہاجروں کے درمیان اخوت و برادری برقرار کی تو انہیں اپنا بھائی بنایا اور اسی طرح جب مدینہ پہنچ کر ایک ایک مہاجر و انصار کے درمیان یہ رشتہ قائم کیا تب بھی انہیں ہی اپنے لئے رکھ چھوڑا اور اپنے بھائی ہونے کے اعزاز سے نوازا۔ خونی رشتہ کے لحاظ سے بھی وہ جناب رسول خداؐ کے چچا زاد بھائی تھے اور اس میں کسی کو کلام نہیں کہ وہ آنحضورؐ کے جسم و جان سے سب سے زیادہ نزدیک تھے۔

حضرت ابو بکر نے خود اپنے آپ کو بے اعتبار کیا جب انہوں نے انہی دو نکات کو سامنے رکھ کر انصار کو قائل کرنے کی کوشش کی اور اسی بناء پر ابو عبیدہ اور حضرت عمر کو خلافت کے لئے پیش کیا۔ اس لئے کہ یہ دونوں حضرات ان دو نکات میں تو انصار سے آگے تھے لیکن وہ جناب امیر علیہ السلام کو نظرانداز کر گئے جن سے ابھی تین ماہ قبل ایک لاکھ مسلمان غدیر خم کے میدان میں بیعت کر چکے تھے۔ وہی علیؑ جن کے بارے میں مسلمان مورخین کا اجماع ہے کہ وہ آنحضورؐ کے سگے چچا زاد اور دینی بھائی تھے۔ انہی کی فدا کاریوں اور انہی کے جہاد نے اسلام کو استحکام بخشا اور شرک و بت پرستی اور اس قریش کو خوار و زبوں کر دیا جو حضرت رسول خداؐ کا انتقام آج علیؑ سے لے رہی تھی۔

حضرت ابو بکر کو اس طریقہ کار کی کامیابی پر پورا اطمینان تھا۔ اس لئے کہ ان کی جماعت بہت پہلے خلافت پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور مہاجر و انصار کی ایک جماعت کو اپنے ساتھ ملانے کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے دوسرے گروہ سے برسرپیکار تھی اور انہیں ہر طور پر قائل کرنے پر تلی ہوئی تھی

اگرچہ اس کے لئے انہیں غلط بیانی سے کیوں نہ کام لینا پڑتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر کا یہ جملہ جس میں انہوں نے حضرت ابوبکر سے کہا' کوئی انہیں اس مقام سے نہیں ہٹا سکتا جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے قرار دیا ہے[1]' اسی معاہدہ اور اتفاق کی نشاندہی کرتا ہے جو یہ لوگ کر چکے تھے' اس جملہ سے وہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال ڈالنا چاہتے تھے کہ آنحضورؐ نے حضرت ابوبکر کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ حالانکہ حضور اکرمؐ کی زندگی پر قلم اٹھانے والے نئے پرانے سیرت نگار اور ثقہ محدث جو احادیث کو سینوں میں محفوظ رکھ کر آئندہ نسلوں کو منتقل کر دیتے ہیں' اس مقام کے بارے میں کچھ نہیں لکھتے۔ ہاں! اس کے برخلاف بہت سی چیزیں نقل کرتے ہیں کہ خیبر میں ان کی ناکامی اور ذات السلاسل میں شکست کے سبب آنحضورؐ نے انہیں کوئی ایسا منصب عطا نہ کیا جو ان کے لئے باعث افتخار ہوتا۔ یہاں تک کہ آنحضورؐ نے یہ جان لینے کے باوجود کہ یہ ان کی زندگی کے آخری ایام ہیں' انہیں اور حضرت عمر کو ایک عام سپاہی کی حیثیت سے بیس سالہ نوجوان اسامہ کی زیر قیادت مدینہ سے باہر بھیجنے کا حکم دیا۔

جہاں تک نماز کی امامت کا تعلق ہے جس کی طرف ابوعبیدہ نے اشارہ کیا تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ نماز کی امامت چھوٹے بڑے سب ہی کر لیتے تھے اور یہ ایسی چیز نہ تھی جس کے سبب وہ دوسروں سے ممتاز ہو جاتے لیکن پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جب میدان صاف پاکر انکی بیٹی عائشہ نے انہیں نماز جماعت پڑھانے کے لئے بلا بھیجا اور یہ خبر آنحضورؐ تک پہنچی تو سخت بیماری میں بھی وہ جناب امیرؑ اور عباس کا سہارا لئے مسجد تشریف لے گئے اور محراب سے انہیں ہٹاکر خود امامت کے فرائض انجام دیئے۔

تعجب تو علماء و دانشوران اہلسنت پر ہوتا ہے کہ وہ دو رکعت نماز کو حضرت ابوبکر کی خلافت کے لئے دلیل کافی سمجھتے ہیں لیکن دعوت ذوالعشیرہ سے لے کر

---

[1] رجوع کریں۔ حیات الامام الحسنؑ القرشی ج ۱ صفحہ ۱۵۰۔

بستر مرگ تک ہر ہر میدان و معرکہ میں جناب امیرؑ کی شان میں کہی گئی احادیث اور مکہ و مدینہ میں ان سے برقرار کئے گئے رشتہ اخوت کو آپؑ کی خلافت پر دلیل نہیں سمجھتے بلکہ انہیں شائبہ بھی نہیں ہوتا کہ اتنا کچھ کہہ کر بھی شاید آنحضورؐ حضرت علیؑ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔

انصار کے بارے میں ہم نے جو نقطہ نظر پیش کیا اس کی دلیل کے طور پر ہمارے پاس زبیر بن بکار کی روایت موجود ہے وہ کہتے ہیں۔

جب لوگوں نے حضرت ابوبکر سے بیعت کرلی اور انہیں دلہن بنائے مسجد میں لے گئے تو غروب کے نزدیک کچھ مہاجر و انصار جمع ہوئے اور ان میں آپس میں جر و بحث ہونے لگی۔ عبدالرحمن بن عوف نے کہا'

"اے گروہ انصار! اگرچہ تم بھلائی اور دین کی مدد و نصرت میں ہم سے آگے ہو لیکن تمہارے درمیان ابوبکر' عمر' علیؑ اور ابو عبادہ جیسے لوگ نہیں"

انصار کی جانب سے زید بن ارقم نے عبدالرحمٰن کا جواب ان لفظوں میں دیا'

اے عبدالرحمٰن! جن لوگوں کا تم نے ذکر کیا ہم ان کی فضیلت کے منکر نہیں۔ لیکن ہمارے درمیان بھی انصار کے زعیم و بزرگ سعد بن عبادہ ہیں' ابی بن کعب ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کے ذریعہ سلام کہلوایا اور ان سے قرآن اخذ کرنے کے لئے کہا۔ اسی طرح معاذ بن جبل جو قیامت کے دن علماء سے آگے ہوں گے اور خزیمہ بن ثابت جن کی گواہی کو آنحضورؐ نے دو شہادتوں کا درجہ دیا۔ ہمیں معلوم ہے کہ اگر مذکورہ لوگوں میں سے حضرت علی بن ابی طالب خلافت سنبھال لیں تو ہم میں سے کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو گا[1]۔

اس ضمن میں طبری لکھتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر نے ابو عبیدہ اور حضرت

---

[1] زبیر بن بکار کی روایت۔
(زبیر بن بکار زبیر بن عوام کے پوتے ہیں۔ ان کی ولادت مدینہ میں اور وفات ۲۵۰ھ میں مکہ میں ہوئی۔ وہ مشہور راویوں میں سے شمار کئے جاتے ہیں اور انہوں نے موفق بن متوکل' عباسی خلیفہ پر موفقیات' نامی کتاب لکھی۔ "منجد الاعلام"۔

عمر کو خلافت کے لئے پیش کیا اور ان دونوں نے الٹا حضرت ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو انصار نے ایک جان ہو کر کہا کہ ہم علی بن ابی طالبؑ کے علاوہ کسی اور سے بیعت نہ کریں گے[۱]۔

انصار سے کیا مخصوص عام مسلمانوں کو بھی یہ بات باور ہو گئی تھی کہ خلافت صرف جناب امیر علیہ السلام کا حق ہے اور وہی اسے سنبھالنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ اس ضمن میں آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا قول و فعل اتنا واضح تھا کہ اب کسی اور چیز کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ یہاں تک کہ خود جناب امیر علیہ السلام کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ خلافت ان کے پاس سے کہیں اور نہیں جا سکتی۔

ابن ابی الحدید کی لکھی ہوئی نہج البلاغہ کی شرح میں ان سے نقل کی گئی روایتیں اس بات کی تصدیق کرتی ہیں[۲]

۔ جناب امیرؑ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جسد اطہر کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے کہ حضرت ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کئے جانے اور پھر مسجد نبوی میں ان کی آمد کی خبروں نے آپ کو چونکا دیا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے انصار کو قائل کرنے کے لئے اسلام لانے میں سبقت اور آنحضورؐ سے قرابتداری کا حوالہ دیا۔ اگر آپ چاہتے تو ان لوگوں سے بھی وہی کچھ کرتے جو انہوں نے انصار کے ساتھ کیا تھا اور دسیوں دلائل و براہین کی بھر مار کر دیتے۔ اس کے باوجود آپ نے صرف انہی دلائل پر اکتفا کیا جن کے ذریعہ وہ انصار پر حاوی ہو گئے تھے۔ آپ نے اس ضمن میں صرف آنحضورؐ کی وصیتوں اور گذشتہ لمحوں کی یاد دہانی کے ذریعہ اپنے حق کا مطالبہ کیا آپ کے ساتھ آپ کی اہلیہ جناب سیدہ نے آپ کی خلافت کے بارے میں وہ جاندار طرز العمل اپنایا کہ مسلمانوں کو خلافت و بیعت کے بارے میں اپنے رویہ سے

---

[۱] تاریخ طبری تیرا جز صفحہ ۱۹۸، شرح نہج البلاغہ ۲۔ ص ۲۲

[۲] ہمیں اس مقولہ کی صحت میں تردد ہے اس لئے کہ جناب امیر علیہ السلام کسی طرح بھی مخالفین سے غافل نہ تھے۔

پشیمان ہونا پڑا۔ ان کے دلوں میں جوش و ولولہ کی لہر دوڑ گئی اور لوگ آپ کے گھر میں جمع ہونے لگے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوبکر و عمر نے خطرے کا احساس کیا اور گھر کو مورد ہجوم قرار دیا۔ حضرت عمر کی سرکردگی میں کچھ لوگ آپ کے گھر کی طرف بڑھے ان کے ہاتھوں میں بہت سی لکڑیاں تھیں۔ نزدیک پہنچ کر حضرت عمر نے چیخ کر کہا جو بھی گھر میں ہے وہ باہر آ جائے۔ راوی نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر کے گوش زد کیا گیا کہ اس گھر میں دختر رسول حضرت فاطمہ الزاہرؑ ہیں لیکن انہوں نے بڑی لجاجت سے جواب دیا کہ،

"اگرچہ وہ ہی کیوں نہ ہوں"

انہوں نے یہ کہا تھا کہ حضرت زبیر بن عوام تلوار لئے ان کی طرف بڑھے۔ بدقسمتی سے وہ گر پڑے اور تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ حضرت عمر چیخے کہ اس تلوار کو اٹھا لو۔ لوگوں نے تلوار اٹھا لی اور انہیں پکڑ کر دیوار پر دے مارا[1]

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے گھر میں گھسنے کی کوشش کی لیکن جب جناب معصومہؑ نے مزاحمت کی تو انہوں نے ان کی حرمت کا پاس بھی نہ کیا اور ان کے ساتھ وہ کچھ کیا کہ ان کا حمل سقط کر گیا اور وہ بچہ جسے آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے "محسن" کے نام سے یاد کیا تھا اس حادثہ کی قربانی بن گیا۔ حالانکہ یہ لوگ رات دن جناب رسالتمآبؐ سے سنتے تھے

"اللہ تعالیٰ فاطمہ کی ناراضگی کے سبب ناراض اور فاطمہ کی خوشنودی کی خاطر راضی ہو جاتا ہے۔"

اور یہ کہ

"فاطمہ میرا جزو ہیں جس نے انہیں تکلیف دی اس نے ہمیں ایذا پہنچائی اور جس نے انہیں ناراض کیا اس نے ہمیں آزردہ کیا"

---

[1] طبری وغیرہ نقل کردہ روایت۔

یہ اور اس جیسی بے شمار احادیث جن سے اہلسنت کی صحاح اور ان کی احادیث کے مجموعے بھرے پڑے ہیں۔ شاعر نیل حافظ ابو ابراہیم بھی اس حادثہ پر کچھ اشعار کہتے ہیں۔ جن میں حضرت عمر کے کردار پر روشنی ڈالتے ہیں[5] ۔

خلافت و میراث کے بارے میں ہم جناب سیدہ کے نقطہ نظر کو گزشتہ ابواب (جلد اول) میں واضح کر چکے ہیں لہٰذا تکرار کی ضرورت نہیں۔

محدثین لکھتے ہیں کہ اس وقت ابو سفیان جناب امیر علیہ السلام کا سخت حامی بن گیا تھا اور ان کی حمایت میں پرجوش اور ولولہ انگیز جملے بھی کہنے لگا تھا وہ کہتا تھا'

"خدا کی قسم میں ان لوگوں کے خلاف آدمیوں اور گھوڑوں کی بھرمار کر دوں گا"

جناب امیر علیہ السلام جانتے تھے کہ یہ شخص جس کا سینہ شرک و نفاق سے جل رہا ہے اور جو بیس سال تک عام مسلمانوں سے نبرد آزما رہا ہے' مسلمانوں کے درمیان فساد ڈال کر اپنے شوم مقاصد تک پہنچنا چاہتا ہے۔ عام مسلمانوں کو معلوم تھا کہ فتح مکہ میں ابو سفیان اور اس کی جگر خوار بیوی ہند کس طرح ایمان لائے تھے ان کے دل کینہ و نفاق سے بھرے ہوئے تھے جس کا ثبوت کبھی نہ کبھی ملتا ہی رہتا تھا۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب ابو سفیان بظاہر اسلام لا چکا تھا۔ روایت کرنے والے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جناب رسالتمآبؐ مسجد میں تشریف فرما تھے اور صحابہ کرام ان کے حلقہ بگوش تھے کہ ابو سفیان نے آنحضورؐ

---

[5] حافظ ابوابراہیم (۱۹۳۲-۱۸۷۲) مصری شاعر ہیں۔ وہ اپنے دور کے بہت بڑے شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں اور اسی شہرت و عظمت کی بنیاد پر انہیں شاعر نیل کا لقب دیا گیا۔ ان کے اشعار کچھ اس طرح ہیں۔

وقول لعلی قالها عمر   اکرم بسامعها وانعم بملقیها۔
حرقت دارک لاابقی علیک بہا   ان لم تبایع وبنت المصطفی فیہا
ماکان غیر ابو حفص یفوہ بہا   امام فارس عدنان وحامیہا

پر نگاہ ڈالی اور دل میں سوچا'

"اے کاش جان سکتا کہ کس طرح یہ شخص مجھ پر غالب آ گیا"

اس کے باوجود کہ اس کی زبان سے ایک کلمہ نہ نکلا تھا لیکن آنحضورؐ اس کے دل کی بات پہچان گئے اور اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر جواب دینے لگے '

"اللہ تعالیٰ کی مدد سے تجھ پر غالب آیا ہوں ' اے ابو سفیان"

طبری اور ابن اثیر لکھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے ابو سفیان کو سختی سے مسلمانوں کے خلاف حیلہ بازی کرنے سے منع فرمایا اور اس کے گوشزد کیا کہ '

"خدا کی قسم تو صرف فتنہ ڈالنا چاہتا ہے اور اسلام کے خلاف اتنی بغاوت و سرکشی کر چکا ہے کہ ہمیں تیری حمایت کی کوئی ضرورت نہیں"[1]

ابو سفیان نے حضرت ابوبکر کی خلافت پر بھی خوب طنز کیا

طبری اور ابن اثیر اس سے متعلق اس کے جملے نقل کرتے ہیں[2] ۔

ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں لکھتا ہے کہ وفات سے قبل آنحضورؐ نے ابو سفیان کو خراج و صدقات وصول کرنے کے لئے بھیجا ہوا تھا چنانچہ جب وہ واپس ہوا تو آنحضورؐ وفات پا چکے تھے۔ اس دوران اس کی ملاقات کچھ لوگوں سے ہوئی اس نے پوچھا کہ خلیفہ کون بنا۔ انہوں نے جواب دیا حضرت ابوبکر تو اس نے کہا "ابو فصیل" اس کا یہ جملہ حضرت عمر تک پہنچا تو انہوں نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ ہم ابو سفیان کے شر سے محفوظ نہیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے اس کے پاس موجود تمام صدقات اسے بخش دیئے اور وہ اس پر خاموش اور

---

[1] تاریخ طبری اور الکامل لابن اثیر (ج ۲ صفحہ ۱۱) بیروت کی طباعت۔
[2] تاریخ طبری (جزء الثانی صفحہ ۲۰۲' صفحہ ۲۰۳) الکامل لابن اثیر (ج ۱ صفحہ ۱۵۷)۔

راضی ہو گیا[1] ۔

زیادہ تر روایات صراحت سے بیان کرتی ہیں کہ ابو سفیان کی یہ خاموشی زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکی اس لئے کہ وہ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات اور کشمکش کو ہوا دے کر قتل وخون کا بازار گرم کرنا چاہتا تھا۔ یہی سوچ کر جناب امیر علیہ السلام کے پاس آتا اور انہیں حضرت ابوبکر و عمر کے خلاف بھڑکاتا۔ لیکن جب انہوں نے اسے بری طرح جھڑک دیا تو اپنے ناپاک مقاصد تک پہنچنے کا اس نے ایک اور راستہ تلاش کیا۔ اتفاق سے اس مرتبہ تیر نشانہ پر بیٹھا۔ اس نے حکام وقت سے چاپلوسی شروع کر دی اور ان میں سے کچھ کو اپنے اعتماد میں بھی لے لیا[2] ۔ چنانچہ ایک سال کے اندر شام کی سلطنت اس کے دو بیٹوں' پہلے یزید بن ابی سفیان اور پھر معاویہ بن ابی سفیان کو دیدی گئی ۔ ابو سفیان تو ان لوگوں میں سے تھا جو اسلام کو بھی اسی زاویہ سے دیکھتے تھے جس زاویہ سے بت پرستی کی طرف دیکھا کرتے تھے ۔ یعنی ان کی توجہات کا مرکز ذاتی مفاد اور فردی تسلط و حاکمیت تھی ۔ لہٰذا جب خلافت بھی حضرت عثمان کے پاس آگئی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور تمام امیدیں بر آئیں ۔ دفن نفرتیں اسے شہید اسلام حضرت حمزہ کی قبر پر لے گئیں۔ اس نے پیر سے قبر مبارک کو مسمار کر کے اپنے بغض کا وہ اظہار کیا جس کی مثال جاہلیت میں بھی مشکل سے ملے گی ۔اس نے کہا'

" اے ابو عمارہ ! اٹھو اور دیکھو کہ جس اقتدار کی خاطر تم ہم سے جنگ کرتے تھے وہ ہمارا ہو گیا ہے ۔"

استاد توفیق ابو علم لکھتے ہیں کہ یوں تو قریش کے جناب امیر علیہ السلام کو

---

[1] شرح نہج ج ۱ ص ۱۳۰
یہ واقعہ بعینہ ہماری نظر سے نہیں گذرا البتہ حضرت ابوبکر کی خلافت کے بارے میں ابوسفیان کے طنزیہ جملہ کو ابن ابی الحدید آنحضرتؐ کی وفات کے بعد خلافت میں اختلاف رائے کے ضمن میں نقل کرتے ہیں ۔ (ج ۱ ص ۲۲۰ داراحیاء الکتب)۔

[2] طبری' ابن اثیر اور ابن ابی الحدید کی روایات

خلافت سے محروم رکھنے کے بہت سے اسباب تھے۔ لیکن ان میں سے ایک سبب یہ تھا کہ اس قبیلہ کے لوگ ان سے دلی نفرت کرتے تھے اس لئے کہ زیادہ تر جنگوں میں انہوں نے قریش کا مقابلہ کیا تھا اور اس کے سرکردہ افراد اور مایہ ناز پہلوانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا تھا اور یہ ایک حقیقت تھی کہ اب تک ان کے دل تعصبات سے پوری طرح پاک نہ ہوئے تھے۔ بالائے ستم یہ کہ اب وہ جناب امیر علیہ السلام سے ان لوگوں کا خون بہاء یا انتقام نہ لے سکتے تھے[۱] ۔

بہرحال جن لوگوں نے بھی حضرت ابوبکر کی خلافت کے بارے میں منفی طرز عمل اختیار کیا' چاہے مہاجر ہوں یا انصار یہ اپنی قوم کے نمایاں اور سرشناس لوگوں میں سے تھے اور ان نیک طینت افراد میں سے تھے جن کی تعریف خود جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمائی تھی جیسا کہ مولائے متقیانؑ کے بارے میں آنحضورؐ نے فرمایا علیؑ حق پر ہیں اور حق ان کے ساتھ ہے۔ جہاں جہاں یہ جائیں گے حق ان کے پیچھے آتا جائے گا۔ اور اسی طرح

☆ عباس بن عبدالمطلبؓ

☆ عمار بن یاسرؓ

☆ ابوذر غفاریؓ

☆ سلمان فارسیؓ

---

[۱] رجوع کریں کتاب اہل بیت صفحہ ۲۴۲ (توفیق ابوعلم)۔
استاد توفیق ابوعلم اہلسنت کے ان روشن فکر علماء میں سے ہیں جو اہلبیت اطہارؑ اور پنجتن پاک کی سچی محبت دل میں رکھتے تھے۔ وہ مدینہ منورہ کے ساکنین میں سے تھے اور مصر میں دینی تعلیمات حاصل کرتے تھے اور امام حسن کی پوتی حضرت نفیسہ علیہا الرحمۃ کے فضل و کمالات سے بہت متاثر تھے۔ ان کی سچی عقیدت کے باعث اس وقت کے وزیر اوقاف سید احمد عبداللہ نے انہیں اپنا وکیل اور مسجد حضرت نفیسہ کی مجلس ادارت کا رئیس منتخب کیا تھا۔
اپنی کتاب اہلبیت (مطبوعہ مصر - ۱۹۷۰ء) میں وہ قرآن و سنت کے ذریعہ اہلبیت کی شناسائی کراتے ہیں اور تاریخ کے مصادر اولیہ (اصلی منابع) سے مکمل امانتداری کے ساتھ' اہلبیت کے فضائل و کمالات اور ان پر ہونے والے ظلم و ستم کو نقل کرتے ہیں۔ یہ کتاب انہوں نے ۱۹۶۹ء میں پایہ تکمیل کو پہنچائی۔

☆ مقداد بن اسودؓ

☆ خزیمہ بن ثابتؓ

☆ عبادہ بن ثابتؓ

☆ حذیفہ بن یمانؓ

☆ ابو ہیثم بن التیہانؓ

☆ سھل بن حنیفؓ

☆ عثمان بن حنیفؓ

☆ ابو ایوب انصاریؓ

☆ عتبہ بن ابو لہبؓ

اور دوسرے مشہور و معروف اصحاب جن پر نہ شور شرابہ کا اثر ہوا اور نہ ہی وہ حضرت عمر کے کوڑے[۱] سے ڈرے۔ بلکہ پوری قوت و استقامت کے ساتھ جناب امیرؑ کے حق کی حمایت کرتے رہے۔ انہوں نے اس وقت تک بیعت کا نام نہ لیا جب تک اسلام کے بقاء کی خاطر خود امام علیہ السلام نے بیعت نہ کی۔ اس وقت اسلام خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ لوگ مرتد ہونے لگے تھے جس کی سب سے بڑی وجہ خود ان لوگوں کی نظر میں آنحضورؐ کے ان خطوط فکری سے انحراف تھا جو انہوں نے غدیر خم کے میدان میں وضع کئے تھے۔ طبری اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ جن لوگوں پر مرتد ہونے کا الزام لگایا گیا' ان میں سے ایک جماعت باقاعدہ نماز پڑھتی تھی بس زکوۃ ادا نہ کرتی تھی اور اسد و فزارہ کے قبائل تو علی الاعلان کہتے تھے کہ ہم تا ابد حضرت ابوبکر سے بیعت نہ کریں گے[۲]۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بہت سے وہ لوگ جنہیں

---

[۱] حیاۃ الحسن للقرشی ج ۱۔ صفحہ ۲۶۵۔
[۲] تاریخ طبری جلد سوم صفحہ ۲۲۹۔

مرتد کہا گیا در حقیقت حضرت ابوبکر کی خلافت کے مخالف تھے۔

ان تمام عظیم الشان اصحاب رسولؐ نے جن کے اسامی ذکر کئے گئے نہ صرف بیعت کرنے سے انکار کیا بلکہ محکم دلائل اور مضبوط شواہد کے ذریعہ سے حضرت ابوبکر کی خلافت کو غلط ثابت کر کے جناب امیرؑ کی خلافت کا زور دار مطالبہ کیا۔

نقل کیا جاتا ہے کہ سہل بن حنیف نے ایک مرتبہ مسلمانوں کے اس اجتماع سے خطاب کیا جس میں حضرت ابوبکر و عمر تھے اور کہا'

اے گروہ قریش میں نے اس مسجد میں رسولؐ کو حضرت علیؑ کا ہاتھ تھامے دیکھا آنحضورؐ فرما رہے تھے'

"لوگو یہ علیؑ میرے بعد تمہارے امام و پیشوا ہیں اور میری زندگی و موت میں میرے وصی و نائب ہیں۔ یہی میرے دین کی قضاوت کریں گے' انہی سے میرے وعدے وفا ہوں گے اور حوض کوثر پر بھی یہی سب سے پہلے مجھ سے آ ملیں گے۔ پس خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ان کی حمایت و اطاعت کریں اور روسیاہ ہیں وہ لوگ جو ان کی مخالفت اور نافرمانی کریں"

حضرت ابو ایوب انصاری اس مجمع سے کہنے لگے'

"اے لوگو اپنے نبیؐ کے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس حق کو ادا کرو جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ تم اور تمہارے بھائی ہرنشست و برخاست میں خود آنحضورؐ سے سن چکے ہیں کہ یہ مومنوں کے امیر اور کفار کے جانی دشمن ہیں۔ انکا ساتھ چھوڑنے والے یا انہیں جنگ سے منع کرنے والے خود بے یار و مددگار اور رسوا ہیں جبکہ ان کی مدد اور نصرت کرنے والے سربلند و کامیاب ہیں۔"

ابو ایوب نے حاضرین کو نصیحت کرتے ہوئے مزید کہا کہ انہیں بارگاہ ربوبی میں اپنے کئے دھرے کی معافی مانگنی چاہیے۔ اس لئے کہ خداوند عالم کثرت سے توبہ قبول کرتا اور نہایت رحم فرماتا ہے۔

اسی طرح ابو ہیثم بن التیہان نے دلیل کے ذریعہ مہاجرین کو قائل کرنے کی کوشش کی انہوں نے کہا'

لوگو! میں اس بات پر شاہد ہوں کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے غدیر خم میں جناب امیر علیہ السلام کو کھڑا کیا تھا اور اس کے بارے میں انصار و مہاجرین میں اختلاف ہوگیا تھا۔ انصار کہتے تھے کہ سرور کائناتؐ نے حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کو پیش کرنے کے لئے انہیں کھڑا کیا تھا جبکہ مہاجرین کا کہنا تھا کہ آنحضورؐ اس طرح مسلمانوں پر واضح کرنا چاہتے تھے کہ وہ جس کے مولیٰ ہیں علی بھی اس کے مولیٰ ہیں۔ چنانچہ جب بات آگے بڑھی تو ہم نے کچھ لوگوں کو آنحضورؐ کی خدمت میں بھیجا تاکہ اس مسئلہ کو حل کر سکیں۔ لہٰذا جب یہ لوگ ان کی خدمت میں شرفیاب ہوئے اور سوال کیا تو انہوں نے فرمایا'

وہ میرے بعد مومنوں کے ولی ہیں۔ میری امت میں ان سے زیادہ پاک طینت اور مخلص شخص نہیں۔ میں حاضرین کو اس بات پر گواہ ٹھہراتا ہوں۔ جو چاہے قبول کرلے اور جس کا جی چاہے انکار کرے ہماری وعدہ گاہ قیامت کا دن ہے جہاں حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا۔ (یعنی وہ دن جب حق اتنا واضح اور آشکار ہوجائے گا کہ کسی میں اسے جھٹلانے کی جرات باقی نہ رہے گی)۔

بعینہٖ اسی عزم و ہمت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ حضرت سلمان فارسی ابوذر غفاری' عمار یاسر' مقداد اور دوسرے صحابہ کرام نے بھی کیا۔ یہاں تک کہ چھ ماہ کا وہ عرصہ گزر گیا جو جناب امیر علیہ السلام نے گھر میں نظر بند ہوکر گزارا۔ اس تمام عرصہ میں نہ تو انہوں نے خود کوئی مخالف تحریک چلائی اور نہ کسی اور کو اس کی اجازت دی اس لئے کہ انہیں اسلام سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہ تھی۔

اگر وہ خلافت کا مطالبہ کرتے تھے تو اس لئے کہ اسلام کو آنحضورؐ کے وضع کردہ خطوط پر آگے بڑھا سکیں۔ اگرچہ انہوں نے اسلام کے دارالخلافہ کو ایک

خانہ جنگی سے بچالیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ ان لوگوں سے جنگ کرنے میں سنجیدہ تھے لیکن جانتے تھے کہ جب اس لڑائی کی خبریں اطراف کے شہروں میں سرایت کریں گی تو بغاوت و سرکشی سر اٹھائے گی اور مسلمہ بنی حنیفہ اور طلحہ بنی خویلد' بنی غطفان' اسد' طی اور کنانہ جیسے قبائل کے ساتھ مل کر خروج کریں گے اور مسلمان دارالخلافہ میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوں گے ۔ لہٰذا انہوں نے اس حق سے صرف نظر کیا اور فرمایا ۔

"معبود کی قسم جب تک مسلمانوں کے امور روبراہ ہیں میں صلح کروں گا اور

ظلم صرف علی کی ذات پر ہو گا۔“ [1]

[1] مصنف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کی بالادستی کیلئے جناب امیر علیہ السلام نے حضرت ابوبکر سے بیعت کر لی تھی اس کے باوجود کہ ان کے پاس کافی صحابہ موجود تھے۔ اس کے علاوہ کہ خود مصنف کے پاس اس بات کو ثابت کرنے کیلئے دلائل کافی اور مستند شواہد موجود نہیں ” کتاب سلیم بن قیس “جو کہ شیعہ حدیث کی بنیادی اور اہم کتابوں میں سے ہے اور توثیق و تصدیق کے لحاظ سے الگ تشخص رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر کی خلافت کے فوراً بعد جناب امیر علیہ السلام نے بہت سے اصحاب کو اس ضمن میں آنحضورؐ کی احادیث اور گذشتہ عہد یاد دلائے لیکن سوائے سلمان فارسی، ابوذرغفاری، مقداد بن اسود اور زبیر بن عوام کے کسی اور نے ان کی اطاعت نہ کی لہٰذا جناب امیرؑ ان لوگوں کے خلاف کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکے۔

خود بیعت کا واقعہ مذکورہ کتاب میں ان لفظوں میں ذکر کیا گیا ہے،

حضرت عمر نے کہا، اے علیؑ اٹھو اور بیعت کرو۔ انہوں نے جواب دیا اگر نہ کروں تو پھر۔ !!!

حضرت عمر نے کہا معبود کی قسم پھر ہم تمہاری گردن اڑا دیں گے۔ جناب امیر علیہ السلام تین مرتبہ ان لوگوں کے خلاف دلائل اقامہ کرتے رہے اور انہوں نے مٹھی بند کر کے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ حضرت ابوبکر نے اس پر اپنا ہاتھ مار دیا اور اسی پر راضی ہو گئے۔

بیعت کرنے سے پہلے جبکہ ان کے گلہ میں رسی تھی انہوں نے ندا دی،

” یا ابن ام ان القوم استضعفونی وکادوا یقتلوننی۔“

”اے ماں جائے ان لوگوں نے مجھے ضعیف و ناتواں کر دیا اور نزدیک تھا کہ جان سے مار ڈالتے۔“

سورۃ اعراف آیۃ ۱۵۰۔ یہ وہی جملے ہیں جو حضرت موسیٰ کے خلیفہ اور بھائی حضرت ہارون کی مظلومیت نے ادا کئے تھے۔

اس وقت دستور یہ تھا کہ بیعت کرنے والا مٹھی کھول کر اپنا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ پر رکھ دیتا نہ یہ کہ جس کی بیعت کی جارہی ہو وہ اپنا ہاتھ مارے۔ لہٰذا ذیل روایت میں خود سلمان کہتے ہیں کہ جناب امیرؑ کے علاوہ صرف ہم چار افراد نے طوعاً و کرہاً بیعت کی۔

(کتاب سلیم بن قیس، صفحہ ۸۹ طباعت دارالفنون۔ بیروت۔)

امامؑ بیعت کے بعد

جناب امیر علیہ السلام یہ دیکھ کر کہ اگر وہ اپنے استحقاق خلافت پر سختی سے کاربند رہیں تو امت کے انتشار کا بڑا خطرہ سامنے تھا' دنیوی خلافت سے کنارہ کش ہوکر قرآن کریم کی تدوین و جمع آوری میں مصروف ہوگئے تھے۔ آپ نے اس مقدس کتاب کی جمع آوری اسی طرح شروع کی تھی جس طرح سے یہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اور ساتھ ہی اس کے اسرار و رموز کو واضح کرنے اور اہم نکات پر روشنی ڈالنے کا تہیہ بھی کیا تھا۔

لوگوں نے جب محسوس کرلیا کہ آپ انوار محمدیؐ کی ایک پرتو ہیں اور لوگوں کی اجتماعی اور روحانی زندگی کے اطراف و جوانب پر روشنی ڈالتے اور انواع و اقسام کی مشکلات کا عقدہ کھولتے ہیں تو وہ آپ کے گرد جمع ہوگئے۔

اگر چہ سیاسی مفادات کی خاطر انہوں نے آپ کے حق میں خلافت و ولایت کی احادیث بھلا دی تھیں لیکن ان کے اختیار سے باہر تھا کہ اس حدیث نبویؐ

کو بھی نظر انداز کر دیتے کہ۔

انا مدینة العلم و علی بابها فمن اراد المدینه فلیاء تها من بابها

میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔ پس اگر کوئی شہر میں آنا چاہے تو اس کے دروازے کے ذریعہ آئے۔

اسی طرح وہ اس قرابتداری اور تقرب کو بھی نہیں جھٹلا سکتے تھے جس کے باعث آپ نے آنحضورؐ سے اتنا کچھ حاصل کرلیا جسے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا اور فرمایا۔

مجھے رسول اللہؐ نے علم کے ہزار باب تعلیم دیئے اور ان میں سے ہر باب میں مجھ پر مزید ہزاروں دروازے کھل گئے۔

پھر جس دن یہ آیہ مبارکہ نازل ہوئی کہ۔

وتعیها اذن و اعیه[1]

"وہی کان سن سکتے ہیں جو چوکنے ہیں"

انہوں نے صادق پیغمبرؐ سے سنا جو جناب امیر سے فرمارہے تھے'

"میں نے پروردگار عالم سے چاہا تھا کہ تمہارے کان ایسے ہوں۔ چنانچہ اس نے مجھے اس نعمت سے نوازا"

خود لوگوں نے آپ کی زبانی سنا کہ'

میں نے جناب رسولؐ سے سنی ہوئی باتوں میں نہ کبھی شک و شبہہ کیا اور نہ ہی اس میں سے کسی کو بھلایا۔

لہٰذا جب بھی مسائل کی گتھی الجھ جاتی اور نیا دور نئے مسائل کھڑے کر دیتا تو

---

[1] سورۃ الحاقہ آیہ نمبر ۱۲۔

ناچار یہ لوگ آپ ہی کے پاس آتے اور آپ بے دریغ انہیں دین کی بصیرت دیتے' احکام تعلیم فرماتے اور فقہ و حدیث کی تدوین جاری رکھتے۔

صحیح روایتوں کے مطابق وہ قرآن جو حافظوں کے سینوں میں پنہاں یا لوحوں میں منتشر صورت میں لکھا ہوا تھا' آپ نے نہ صرف اسے صفحہ قرطاس پر جمع کیا بلکہ اس کی تفسیر و تشریح پر قلم اٹھایا اور اس کی متشابہ و مجمل آیات کی نشاندہی کی۔

سیوطی ابن حجر کی یہ عبارت نقل کرتے ہیں کہ

حضرت علی سے منقول ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد انہوں نے اسی ترتیب سے قرآن کریم جمع کیا جس طرح کہ وہ آنحضورؐ پر نازل ہوا تھا۔۔ اس پر ابن حجر ابن سیرین کے اس مقولہ کا بھی اضافہ کرتے ہیں کہ

اگر یہ کتاب دسترس میں ہوتی تو اس میں بے شمار علم پایا جاتا[۵۱]۔

مناقب بن شہر آشوب میں بھی مرقوم ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے اپنے سے عہد کیا تھا کہ قرآن کریم کو جمع کریں گے اور نماز کے علاوہ رداء نہ اوڑھیں گے۔

اعیان الشیعہ' میں تفسیر و حدیث میں اہلسنّت کے' امام شیرازی اور ابو یوسف یعقوب سے روایت ہوتی ہے۔ ابو یوسف اس روایت کے ذیل میں دی گئی آیہ شریفہ کی تفسیر میں ابن عباس سے نقل کرتے ہیں۔

لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ و قرآنہ[۵۲]

اے پیغمبرؐ (وحی کو محفوظ کرنے کے واسطے) زبان کو حرکت نہ دو۔ اس کی تدوین اور اس کی قرائت ہمارے ذمہ ہے۔

---

۵۱ الاتقان فی علوم القرآن'

۵۲ سورۂ قیامت آیہ نمبر ۱۷۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جناب رسول خداؐ کو اس طرح اطمینان دلایا تھا کہ ان کے بعد علی بن ابی طالب قرآن کو جمع کریں گے ۔ چنانچہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن پاک کو جناب امیر کے قلب میں جمع کیا اور انہوں نے آنحضورؐ کی وفات کے چھ ماہ بعد اسے تدوین کیا۔

اعیان الشیعہ' میں مشہور صحابی ابو رافع ۔سے بھی روایت ہوتی ہے کہ بیماری کے دنوں میں وفات سے قبل آنحضورؐ نے حضرت علی سے فرمایا' ۔

اے علی یہ خدا کی کتاب ہے اسے اپنے پاس لے جاؤ۔

آپ اسے ایک کپڑے میں کر کے گھر لے آئے چنانچہ جب جناب رسالت مآبؐ نے جان جان آفرین کے سپرد کی تو آپ نے گھر میں رہ کر اسے اسی طرح مرتب کیا جس طرح سے کہ یہ آنحضورؐ پر نازل ہوئی تھی اور آپ اس سے آگاہ تھے ۔

اسی طرح مورخین کی ایک جماعت نقل کرتی ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے قرآن مجید کی اسی ترتیب سے جمع آوری کی جس طرح کہ وہ آنحضورؐ پر نازل ہوا تھا۔ ساتھ ہی عام و خاص' ناسخ و منسوخ' محکم و متشابہ' مطلق و مقید' فرائض و سنن اور آداب و اطوار پر مشتمل آیات کی نشاندہی کی۔ اس کے علاوہ قرآن کریم کے ساتھ علوم یا صنعتوں کو بمعہ متعدد مثالوں کے املا کرایا۔

اس موضوع سے متعلق مختلف روایات میں نقل کیا گیا ہے کہ جب جناب امیر علیہ السلام سے ناسخ و منسوخ کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو رحمت و عطوفت کے ساتھ بھیجا تھا۔ اور اس رحمت کا تقاضا تھا کہ جب تک اسلام اور اس کے قوانین لوگوں کے دلوں میں اچھی طرح رسوخ نہ کر جائیں' اس وقت تک انہیں ان کی عادات و رسوم سے نہ روکا جائے ۔

چنانچہ زمانہ جاہلیت میں مرسوم تھا کہ اگر کوئی عورت بدکاری کرتی تو مرتے دم تک اسے اس کے گھر میں قید رکھا جاتا تھا لیکن اگر کوئی مرد بدکاری کرتا تو

لوگ اسے اپنی محفلوں میں نہ آنے دیتے اور اس کے کپڑے اتار کر اذیت و آزار دیتے اور برا بھلا کہتے۔ لہٰذا شروع میں اسلام نے بھی اس رسم کو باقی رکھا'

و اللاتی یاتین الفاحشه من نسائکم فاشهدو ا علیهن ا ربعه منکم فا ن شهدو ا فامسکوهن فی البیو ت حتی یتوفاهن المو ت ا و یجعل الله لهن سبیلا و اللذا ن یاتیانها منکم فا ذ وهما فا ن تابا و اصلحا فاعفو ا اعنهما ا ن الله کا ن تو ابا رحیما

"تم میں سے جو عورتیں بدکاری میں ملوث ہوں تو ان پر اپنوں میں سے چار لوگوں کو گواہ ٹھہراؤ۔ پس اگر گواہی قائم ہوجائے تو انہیں ان کے گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ وہ مرجائیں یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی (اور) راستہ نکالے۔ اور تم میں سے جو مرد اس کے مرتکب ہوں تو انہیں اذیت و آزار دو پھر اگر وہ توبہ کے ساتھ اپنی اصلاح بھی کرلیں تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت رحمت کرتا اور درگزر سے کام لیتا ہے۔"

لیکن جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی اور اسلام ان کے دلوں میں مستحکم ہونے لگا تو خود انہیں جاہلیت کی رسموں سے نفرت ہونے لگی۔ چنانچہ یہ آیہ مبارکہ نازل ہوئی'

الز انیه و الز انی فاجلدو ا کل و احد منهما مائه جلده

"زناکار عورت و مرد کو سو سو کوڑے مارے جائیں"

مذکورہ حدیث بحار الانوار میں نقل کی گئی ہے اور اس میں نہ صرف نسخ بلکہ

---

[1] سورۂ نساء آیہ نمبر-۱۵

قرآن کریم کے ساتھ علوم کی متعدد مثالیں موجود ہیں[۱]۔

---

[۱] مذکورہ حدیث بحارالانوار (مطبوعہ بیروت ۔ داراحیاء التراث) کی جلد نمبر ۹۰ کی ابتداء میں ذکر کی گئی ہے۔ اگرچہ حدیث بہت طویل و عریض ہے لیکن اس کی افادیت کے پیش نظر ہم اس کا مختصر سا حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔
امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جناب ختمی مرتبت کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور ان کے ذریعہ نبوت کو پایہ تکمیل تک پہنچایا پس آنحضورؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر جو کتاب نازل کی اسے آسمانی کتب کی آخری کڑی قرار دیا اور اس کے بعد کوئی کتاب نہ ہوگی۔ اس کتاب میں ذات باری تعالیٰ نے کچھ چیزوں کو حلال اور کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا چنانچہ یہ قیامت تک حلال اور قیامت تک حرام رہیں گی۔ اسی کتاب میں تم لوگوں کے لئے قوانین درج ہیں اور تم سے پہلے اور تمہارے بعد کی اقوام کے حالات نقل کئے گئے ہیں۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کتاب کا علم اپنے اوصیاء کے درمیان باقی رکھا تھا لیکن لوگوں نے ان سے منہ پھیرلیا اور ان کا ساتھ نہ دیا اور اس کے باوجود کہ یہ اوصیاء تمام ادوار پر شاہد و ناظر تھے، لوگوں نے ان سے انحراف کیا وہ ان کی جان کے درپے ہوئے، انہیں شہید کیا اور دوسروں کو ان کی جگہ بٹھا کر بڑے خلوص سے ان کی پیروی کرنے لگے۔ بات یہاں تک پہنچی کہ اگر لوگوں میں سے کوئی ان نائبین کی ولایت کا دم بھرتا یا ان کے علوم حاصل کرنا چاہتا تھا تو اس سے بھی دشمنی کی جاتی۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فنسوا حظا مما ذکروا به ولا تزال تطلع علی خائنه منہم

اور جن جن باتوں کی انہیں نصیحت کی گئی تھی ان میں سے ایک بڑا حصہ بھلا بیٹھے اور اے رسولؐ اب تو تم ان میں سے خائنوں سے اچھی طرح واقف ہو۔
اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے قرآن کریم کے کچھ حصوں کو کچھ سے جوڑنا شروع کیا انہوں نے اپنے خیال میں ناسخ آیت سے استشہاد کیا حالانکہ وہ منسوخ تھی۔ وہ محکم سمجھ کر متشابہ اور عام سمجھ کر خاص آیات سے استفادہ کرنے لگے۔ انہوں نے آیات مبارکہ کی تفسیر و تاویل کے اسباب پر نظر ڈالے بغیر ان کے ابتدائی حصہ سے معانی اخذ کرنے شروع کردیئے اور نہ ہی آیت کے اول و آخر اور موارد و مصادر کے بارے میں جستجو کی۔ اس لئے کہ انہوں نے کتاب خدا کے علم کو اس کے اہل اور شائستہ افراد سے نہ لیا لہٰذا خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

اے لوگوں تم پر خدا کی رحمتیں ہوں' جان لو کہ جو شخص بھی اس کتاب مقدس کی ناسخ و منسوخ' خاص و عام' محکم و متشابہ' رخص و عزائم' مکی و مدنی' شان نزول' مبہم الفاظ' قضاء و قدر' تقدیم و تاخیر' واضح و عمیق' ظاہر و باطن' ابتداء و انتہاء' سوال و جواب' قطع و وصل' مستثناء وغیر مستثناء' وہ صفت جو پہلے ذکر کی جاچکی ہو اور بعد کی طرف اشارہ کرے' موکد و مفصل' فرائض و احکام اور حلال و حرام (جس کی تفسیر میں ملحدین ہلاک ہوچکے ہیں) سے متعلق آیات کی طرف توجہ رکھتا ہو اور ان کی صحیح معرفت اور حقیقی شناخت سے برخوردار ہو تو وہ صحیح معنی میں قران کریم کا عالم کہلانے کا مستحق ہے اور وہی اس کے اہل میں سے ہے۔ لیکن اگر کوئی بغیر دلیل کے ان تمام چیزوں کی معرفت کا ادعاء کرے تو وہ خود بھی جھوٹا ہے اور خدا اور رسول پر بھی جھوٹ باندھتا ہے جہنم اس کا ٹھکانہ ہے جو بہت بری جگہ ہے۔

جناب امیر علیہ السلام سے ان کے شیعوں نے اسی طرح کا سوال کیا تھا تو انہوں نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو سات اقسام پر نازل کیا۔ ان میں سے ہر قسم شافی و کافی ہے۔

(۱) امر (کسی چیز کو انجام دینے کا حکم)۔

(۲) زجر (کسی چیز سے منع کرنا اور روکنا)۔

(۳) ترغیب (کسی کام میں ہمت افزائی کرنا اور حوصلہ دلانا)۔

(۴) ترہیب (کسی کام سے ڈرانا اور باز رکھنا)۔

(۵) جدل (مخالفین و معاندین سے دلائل کی رد و قدح)۔

(۶) مثل (مثالیں یا ضرب المثال)۔

(۷) قصص (حقیقت پر مبنی سبق آموز واقعات)۔

اور پھر قرآن کریم میں ناسخ و منسوخ اور وہ آیات ہیں جن میں ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ انہیں میں سے وہ آیات ہیں جن کے الفاظ محدود (خاص) اور معنی وسیع (عام) ہیں یا لفظ مفرد ہے لیکن جمع کے معنی لئے گئے ہیں یا اس کے برعکس۔ اسی طرح لفظ ماضی کا استعمال کیا گیا ہے لیکن مستقبل کے معنی لئے گئے ہیں یا بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خبر دی جارہی ہے لیکن وہ درحقیقت کسی دوسری قوم کی حکایت ہوتی ہے یا وہ آیات جو شان نزول کے مخالف ہیں اور وہ جو مطابق ہیں۔ انہیں میں سے وہ آیات ہیں جن کا آدھا حصہ منسوخ کیا جاچکا ہے اور آدھا اپنے حال پر باقی ہے یا وہ جن کے الفاظ مختلف اور معنی ایک ہیں یا معنی مختلف اور الفاظ ایک ہیں۔ انہیں میں وہ آیات ہیں جن میں ممنوعیت کے بعد اجازت دی گئی ہے اور خداوند عالم پسند کرتا ہے کہ جس طرح سے اس کی ممنوع کردہ چیزوں سے اجتناب برتا جائے اس طرح اس کی جائز کردہ چیزوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

جناب امیر علیہ السلام اسی طرح قران مجید کی تمام انواع و اقسام بیان کرتے جاتے ہیں اور ان سات اقسام کی بھی توضیح دیتے ہیں اور پھر مثالوں کی طرف آتے ہیں۔ چنانچہ نسخ سے شروع کرتے ہیں

اور ہر صنف کی متعدد مثالیں دیتے ہیں ہم اس میں سے صرف نسخ کی چند مثالیں پیش کررہے ہیں۔

امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ نسخ کے موارد میں سے ایک مورد یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت میں عورت کی عدت ایک سال تک ہوتی تھی۔ چنانچہ اگر کسی عورت کا شوہر وفات پاجاتا تو وہ ایک سال تک زینت و آرائش کرنے اور دوسرا شوہر انتخاب کرنے سے محروم رہتی تھی۔ قرآن کریم نے ابتداء میں اسی رسم کی تائید کی'

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیہ لازواجہم متاعا الی الحول غیر اخراج

اور تم میں سے جو لوگ وفات پاجائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو ان کے حق میں سال بھر کے نان و نفقہ اور باہر نہ نکلنے کی وصیت کریں۔

لیکن اسلام کے مضبوط ہوتے ہی اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ آیہ مبارکہ نازل فرمائی۔

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعہ اشھر و عشرا

اور جو لوگ وفات پاجائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو یہ (بیوائیں) چار مہینہ دس دن تک انتظار کریں (یعنی اس سے پہلے نکاح نہ کریں)۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اسی طرح جناب امیر علیہ السلام مزید مثال دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تو شروع میں انہیں صرف دعوت دینے کا حکم دیا چنانچہ سورہ احزاب کی (۴۵ - ۴۸) آیات میں یہی فرمایا کہ'

اے حبیب ہم نے تمہیں بشیر و نذیر (اللہ تعالیٰ کی رحمت و نعمت کی بشارت دینے اور اس کے عذاب سے ڈرانے والا) بنا کر بھیجا اور داعی الی اللہ اور سراج منیر کے رتبہ پر فائز کیا۔ تم کافروں اور منافقوں کی تقلید و پیروی نہ کرو اور نہ ہی انہیں اذیت و آزار دو بلکہ خدا پر تکیہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہے جو اپنے کام اس کے سپرد کردے۔

پس اللہ تعالیٰ نے انہیں صرف دعوت دینے اور منافقین و کفار سے معترض نہ ہونے کا حکم دیا لیکن جب ان لوگوں نے ختمی مرتبتؐ کے قتل کی سازشیں کیں تو اللہ تعالیٰ نے ہجرت کا حکم دیا اور جنگ و قتال کو مسلمانوں پر فرض کردیا۔ چنانچہ سورہ حج کی ۳۹ ویں آیت اس امر کی شاہد ہے۔ لیکن جنگ کا حکم ملتے ہی مسلمان خوف کے مارے ڈرنے لگے اور غمگین ہوگئے تو سورہ نساء کی ۷۷ ویں آیت نازل ہوئی۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس میں دونوں ادوار کا تذکرہ کیااور مسلمانوں کو صبر و استقامت سے کام لینے اور موت جیسی اٹل حقیقت سے نہ ڈرنے کا درس دیا۔ چنانچہ جن آیات میں صرف دعوت دینے کے لئے کہا گیا تھا وہ ان آیات کے ذریعہ نسخ ہوگئیں جن میں جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

تاریخ یعقوبی میں مرقوم ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے قرآن کریم کو تدوین کیا۔ وہ اونٹ پر اٹھائے اسے لے کر آئے اور حضرت ابوبکر اور ان کے اطرافیوں سے فرمانے لگے'

"یہ قرآن مجید ہے جسے میں نے تمہارے لئے جمع کیا ہے۔"

انہوں نے اسے سات اجزاء میں تقسیم کیا تھا اور ہر جزو میں تقریباً آٹھ سو چھیاسی (۸۸۶) آیات اور پندرہ یا سولہ سورتیں شامل تھیں۔

یعقوبی جناب امیر علیہ السلام کی طرف نسبت دیتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا

"قرآن کریم چار حصوں میں نازل ہوا۔ ایک حصہ ہمارے اور دوسرا ہمارے دشمنوں کے بارے میں اور تیسرا سنن و امثال اور چوتھا فرائض و احکام سے متعلق ہے۔"

قرآن مجید کی اس طرح کی تقسیم اہل بیت سے موصول شدہ روایتوں میں بھی کثرت سے ملتی ہے۔ جو الکافی یا دوسری کتابوں میں نقل کی گئی ہیں۔ اگر یہ نسبت صحیح ہو تو آئمہ طاہرین کے بارے میں نازل شدہ قرآن سے مراد ان لوگوں سے متعلق آیات ہیں جو ایمان لائے انہوں نے نیک اعمال انجام دیئے اور جنگ و جہاد کے علاوہ تمام کاموں کو اخلاص سے بجا لاتے رہے۔ اور اس قسم کے مضامین پر مشتمل آیات ایک چوتھائی سے کم نہیں۔ اس طرح آئمہ اطہار علیہم السلام کا ان آیات کو اپنے سے نسبت دینا اس لئے صحیح ہے کہ ان سے پہلے اور بعد کے تمام وہ لوگ جو ان صفات کے حامل تھے وہ ابتدائی مرحلہ میں تھے جبکہ آئمہ معصومین ان آیات کے مصداق کامل ہیں۔ اسی طرح دوسرا چوتھائی حصہ جو ان کے دشمنوں کے بارے میں ہے' اس سے مراد وہ تمام آیات ہیں جو کفار' منافقین' فاسق' جھوٹے اور ریاکار لوگوں کے بار میں نازل ہوئیں۔ بے شک جس میں بھی اس قسم کی صفات ہوں وہ ان کے دشمنوں میں سے ہے اس لئے کہ وہ حق کے داعی تھے' رحمت و عدالت اور اچھائیوں کے پیکر تھے اور جس میں یہ صفات نہ پائی جائیں وہ یقیناً ان کا دشمن ہے۔

بہرحال ہمیں اس قسم کی روایات سے کوئی سروکار نہیں کہ یہ صحیح ہیں یا غلط ہمیں تو صرف یہ کہنا ہے کہ جن روایات میں بھی صراحت سے کہا گیا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے قرآن پاک کو مرتب کیا' یہ نہ صرف راویوں کے درمیان مشہور و معروف ہیں بلکہ ان کے مضامین میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں جسے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جائے یا اس کی توجیہ و تاویل کی جا سکے۔

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ قرآن کریم کی جمع آوری کرنے کے بعد جناب امیر علیہ السلام اسے لوگوں کے پاس لے گئے اور فرمانے لگے'

"یہ خدائے عزوجل کی کتاب ہے' جسے باری تعالیٰ نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا تھا اور ہم نے اسے لوحوں سے جمع کیا ہے"

لوگوں نے کہا کہ ہمارے پاس ایک ایسی کتاب ہے جس میں قرآن موجود ہے اور ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

جناب امیر علیہ السلام نے فرمایا

"جان لو! معبود کی قسم تا ابد اس کی شکل نہ دیکھ سکو گے۔ یہ میری ذمہ داری تھی کہ تمہیں اس سے آگاہ کرتا تاکہ اس کی قرائت کر سکتے"

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام کے نفاذ کی خاطر ظاہری خلافت سے دستبردار ہونے کے بعد جناب امیر علیہ السلام نے سب سے پہلے قرآن مجید کی جمع آوری کی اور پھر فقہ کی تدوین پر توجہ دی۔ چنانچہ اس ضمن میں "الجامعہ" نامی کتاب مرتب فرمائی جس کی طول ستر (۷۰) بازو تھی۔ اسے جناب ختمی مرتبتؐ نے املاء کرایا تھا اور آپؑ نے بقلم خود اسے مرتب کیا تھا۔ ہم مصحف فاطمہ کے ضمن میں اس کے بارے میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ (پہلی جلد میں) اس کے علاوہ چونکہ آپ قضاوت یا لوگوں کے درمیان عدالت سے حکم کرنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے لہٰذا جب بھی کسی مسئلہ کے فہم میں صحابہ کے درمیان اختلاف ہو جاتا اور مختلف آراء و انظار سامنے آتیں تو صرف آپ کی آراء کو حرف آخر اور قول فیصل کا درجہ حاصل ہوتا۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ لوگوں کی نظریں

آپ سے ہٹا کر کسی اور کی طرف مائل کر دیتا یا آپ کے اور ان لوگوں کے درمیان حائل ہو جاتا جو دینی احکام اور اپنی تمام تر مشکلات میں آپ ہی کی طرف رجوع کرتے۔ خود صاحبان اقتدار بھی جب کتاب و سنت کے مسائل حل کرنے سے عاجز آ جاتے تو ناچار آپ کے دروازے پر آتے۔ وہ تو شروع سے لوگوں کے درمیان آپ کی حیثیت اور شرف کو کم کرنا چاہتے تھے لیکن جب انہوں نے محسوس کر لیا کہ یہ ان کے یا ان جیسی کسی اور حکومت کے بس کی بات نہیں تو ناچار انہیں اس حقیقت کو قبول کرنا پڑا۔ خود حضرت عمر جنہوں نے آپ کو خلافت سے محروم کرنے کے لئے تمام منصوبے ترتیب دیئے تھے ان کا یہ حال تھا کہ اپنے معتقدین سے کہتے کہ

"تم میں سے کوئی بھی علیؑ کی موجودگی میں مجھ سے سوال نہ کرے"

اور نہ جانے کتنے موقعوں پر انہوں نے یہ تک کہہ دیا

"خدا مجھے کسی ایسی مشکل سے دو چار نہ کرے جس کے لئے ابو الحسن نہ ہوں۔ اور اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا"

اگر چہ مختلف ہتھکنڈوں سے ان لوگوں نے خلافت تو چھین لی تھی لیکن ان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ آپ کے علم و فضل اور آپ کے مقام فقاہت و قضاوت سے عام لوگوں کی نظریں ہٹا سکتے۔ خاص طور پر جبکہ تقریباً ہر ایک نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سنا تھا کہ

"علیؑ علم کے شہر کا دروازہ ہیں۔ وہ تم میں سب سے زیادہ بافضیلت اور مطیع و فرمانبردار ہیں۔ وہ حق کے ساتھ ہیں اور حق ان کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا ہے جہاں بھی چلے جائیں اور جس طرف بھی رخ کر لیں اور وہ خدا کی کتاب سے ہرگز جدا نہ ہوں گے"

یہ اور اس جیسی نہ جانے کتنی احادیث و اقوال جنہیں مختلف موقعوں پر آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا اور ان میں سے کچھ کو ہم ذکر بھی کر چکے ہیں۔

بہرحال مسلمان ایک نئے دور میں قدم رکھ چکے تھے۔ انہیں نئی قوموں اور

جدید مکاتب فکر اور اور نظریات کا سامنا تھا۔ اور وہ اس وسیع میدان میں ہر وقت سے زیادہ آنحضورؐ کے محتاج و نیاز مند تھے جو ان کے سوالات کے جواب دیتے اور مبہم باتوں کو واضح کرتے اور بالاخر جناب رسالتمآبؐ کے پاس ان کی تمام مشکلات کا حل اور ان کے معاشرے کی ہر بیماری کے لئے ایک نسخہ کیمیا موجود تھا۔ لیکن وہ اس دنیا سے کوچ کر چکے تھے اور وہ واسطہ جو زمین کو آسمان سے ملاتا، جو منافقوں اور کفار کی سازشوں کو بے نقاب کرتا اور دشمنوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیتا وہ منقطع ہو چکا تھا۔ آنحضرتؐ وفات پا چکے تھے اور ان کے لئے خدا کی کتاب اور ان اہل بیت کو چھوڑ گئے تھے جنہیں انہوں نے کبھی سفینہ نوحؑ سے تشبیہ دی تھی اور کبھی اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کے قرین بتایا تھا جو انحراف ناپذیر ہے۔ یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ مستقبل کی ان تمام مشکلات اور مسائل کے لئے انہوں نے آپ کو تیار کیا تھا۔ اسی لئے آپ ہزاروں مسلمانوں کے سامنے یہ ندا دیتے اور کوئی نہ جھٹلاتا،

"پوچھ لو اس سے پہلے کہ مجھے کھو دو، خدا کی قسم اب سے لے کر قیامت تک ایسی کوئی چیز نہیں اور نہ ہی ایسا کوئی لشکر ہے جو سینکڑوں کو ہدایت دیتا اور سینکڑوں کو گمراہ کرتا ہو مگر یہ کہ میں تمہیں اس کے نعرہ مارنے والے، اس کے قائد و سربراہ اور اس کے حرکت دینے والے کے بارے میں نہ بتا سکوں۔ اور یہ بھی کہ اس کی سواریاں کہاں رکھی جاتی ہیں اور اس کے مویشی کہاں باندھے جاتے ہیں۔"

پھر آپ نے ان کی طرف ایک اور مرتبہ توجہ کی اور فرمایا

"مجھ سے خدا کی کتاب کے بارے میں دریافت کرو۔ خدائے احد کی قسم میں ہر نازل ہونے والی آیت کے بارے میں جانتا ہوں کہ دن میں نازل ہوئی یا رات میں لق و دق صحراء میں اتری یا پہاڑوں میں"

ابن ابی الحدید آپ کا یہ قول بھی نقل کرتا ہے کہ

"اگر میرے لئے مسند حکم بچھا دی جائے تو میں اہل تورات کے درمیان تورات سے اہل انجیل کے درمیان انجیل سے اور اہل فرقان کے درمیان فرقان

سے فیصلے کروں"

اگر ہم ان تمام احادیث و نصوص کو نظر انداز کر دیں اور صرف جناب امیر علیہ السلام کی اس تیس سالہ زندگی کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہو گا کہ اس کا لمحہ لمحہ آنحضرتؐ کی رفاقت میں گذرا اور سوائے ضروری مواقع کے آپؐ ان سے جدا نہ ہوئے۔ لیکن پھر بھی اگر فرض کر لیں کہ خاکم بدہن جناب رسالت مآبؐ نے اپنے بعد آپ کو اپنا خلیفہ اور جانشین نہ بنایا تھا جس آسانی سے ہمارے اہلسنت بھائی کہہ دیتے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس امت مسلمہ کی دینی اور دنیاوی مشکلات کے لئے اور تمام مسائل میں اسے سیدھے راستے پر گامزن کرنے کے لئے انہوں نے کسے تیار کیا تھا۔ کیا حبیب خداؐ کے لئے صحیح تھا کہ اتنے اہم اور نازک مسئلہ کو لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیتے؟ حالانکہ اگر معیار قابلیت ہی تھا تو اس لحاظ سے بھی کوئی آپ کے پائے کو نہ پہنچتا تھا۔

گرچہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ وہ نکات ہیں جو اہل نظر سے پوشیدہ ہوں لیکن سیاق کلام میں بے اختیار یہ سطریں سپرد قلم ہوتی رہیں اور میں لکھتا رہا۔ عرض کر رہا تھا کہ جناب امیر علیہ السلام نے حضرت ابو بکر کے دور میں اسلامی قوانین کی نشر و اشاعت اور اسلامی معارف کی تعلیم و تدریس کی۔ اور ضروری ہے کہ اس ضمن میں کچھ مثالیں بھی دی جائیں۔

ابن جوزی فضائل احمد بن حنبل سے ایک واقعہ نقل کرتا ہے[۵] ۔ اسے ابو ظبیان نے روایت کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ'

"حضرت عمر کے پاس ایک زنا کار عورت کو لایا گیا تو انہوں نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ ابھی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ جناب امیر علیہ السلام تشریف لائے۔ انہوں نے جو دیکھا تو حضرت عمر کو سمجھایا کہ یہ فلانی کی بیٹی ہے اس پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی اور رسول اللہؐ سے منقول ہے کہ

---

۵ تذکرۃ الخواص صفحہ نمبر ۱۲۷ مطبوعہ بیروت موسسۃ اہل بیت۔

"قلم تکلیف سوتوں[1] سے جب تک کہ نہ جاگ جائیں، بچوں سے جب تک کہ وہ سن شعور کو نہ پہنچ جائیں (بلوغ کی حد کو نہ پہنچ جائیں) اور مبتلائے جنوں سے جب تک کہ اسے افاقہ نہ ہو جائے، متعرض نہیں ہوتا۔"[2]

اسی طرح نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عمر کے سامنے ایک ایسی عورت کو لایا گیا جس نے چھ ماہ کے عرصہ میں وضع حمل کیا تھا۔ انہوں نے اسے سنگسار کرنے کے لئے کہا تو جناب امیر علیہ السلام نے ان کے فیصلے کو غلط قرار دیتے ہوئے انہیں خدا کی کتاب کی طرف رجوع کرنے کے لئے کہا۔

انہوں نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا،

"والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعه"[3]

"ماؤں کو اپنے بچوں کو دو سال تک دودھ پلانا چاہیے اگر وہ شیر خوارگی کی مدت پوری کرنا چاہتی ہیں۔"

جبکہ دوسری آیۂ شریفہ میں ہے،

"وحمله وفصاله ثلاثون شهرا"

"اور اس بچہ کے رحم اور شیر خوارگی کی مدت تیس ماہ ہے"

امام علیہ السلام نے مزید فرمایا کہ ان دو آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اگر شیر خوارگی کی مدت تیس ماہ سے نکال دی جائے تو حمل کی کمترین مدت چھ ماہ رہ جاتی ہے۔ حضرت عمر نے فوراً کہا،

---

[1] شرعی تکلیف کا نفاذ

[2] صحیح بخاری جلد نمبر ۴، صفحہ ۱۷۷۔ (ابن جوزی لکھتا ہے کہ امام احمد نے اسے اپنی مسند میں بھی نقل کیا ہے۔)

[3] سورۂ بقرہ ۲۳۳۔

"خدا مجھے کسی ایسی مشکل میں نہ ڈالے جس کے لئے علی بن ابی طالب نہ ہوں"

شیخ مفید لکھتے ہیں کہ حضرت ابو بکر کے دور میں ایک شخص نے شراب نوشی کی جب اسے حضرت ابو بکر کی خدمت میں حاضر کیا گیا اور انہوں نے اس پر حد جاری کرنے کیلئے کہا تو اس نے دعویٰ کیا کہ وہ شراب نوشی کی حرمت سے ناواقف تھا اس لئے کہ اس کا اوڑھنا بچھونا ان لوگوں میں تھا جو شراب کو حلال گردانتے تھے۔ حضرت ابوبکر پریشان ہو گئے اور انہیں کچھ سمجھ نہ آیا۔ جلیسوں نے کہا کہ حضرت امیرؑ کو بلوائیے اور ان سے سوال کیجئے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

جناب امیر علیہ السلام تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ مسلمانوں میں سے دو افراد مہاجرین و انصار کی محفلوں میں جائیں اور پوچھیں کہ آیا کسی نے ملزم پر شراب نوشی سے متعلق آیت تلاوت کی تھی یا نہیں؟ پس اگر واضح ہو جائے کہ اس پر آیت تلاوت کی گئی ہے تو حد جاری کر دی جائے ورنہ اسے بری کر دیا جائے اس لئے کہ جناب رسول خداؐ فرماتے تھے۔

"الحدود تدرا بالشبهات"

"شبہات میں حدود ساقط ہیں"

مجبوراً" حضرت ابوبکر کو ایسا ہی کرنا پڑا اور جب مسلمانوں میں سے کسی نے اس بات کی تصدیق نہ کی تو اسے رہا کر دیا گیا

اسی طرح نقل کیا گیا ہے کہ جب حضرت ابو بکر سے میراث کی آیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ اس مسئلہ میں وہ اپنی ذاتی رائے پر عمل کریں گے اگر صحیح ہوئی تو خدا کی جانب سے ہوگی اور اگر غلط ہوئی تو نفس اور شیطان کی طرف سے ہوگی۔ حضرت امیر علیہ السلام کو جب معلوم ہوا کہ وہ اس قسم کے نظریات رکھتے ہیں تو فرمانے لگے کہ کونسی چیز اس بات کا باعث بنی ہے کہ وہ اس مسئلہ میں اپنی ذاتی رائے لڑائیں کیا وہ نہیں جانتے کہ "کلالہ"

سے مراد سوتیلے بھائی بہن ہیں چاہے ماں کی طرف سے ہوں یا باپ کی طرف سے۔ پھر آپ نے ان آیات کا حوالہ دیا

یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالہ ان امرئو ھلک لیس لہ ولد ولہ اخت فلھا نصف ما ترک "[1]

"وان کان رجل یورث کلالہ او امراۃ ولہ اخ او اخت فلکل واحد منھما السدس "[2]

نیز کتاب الارشاد میں مرقوم ہے کہ قدامہ بن مطعون نامی شخص نے شراب پی۔ حضرت عمر اس پر حد جاری کرنا چاہتے تھے کہ اس نے مذکورہ آیہ شریفہ کو دلیل کے طور پر پیش کیا۔

لیس علی الذین آمنوا و عملوا الصالحات جناح فیما طعموا اذا ما اتقوا و آمنوا و عملوا الصحالحات "[3]

"جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیئے ان کے لئے کھانے (پینے) والی اشیاء میں کوئی قباحت نہیں اگر وہ تقوی اختیار کریں' ایمان لائیں اور نیک اعمال انجام دیتے رہیں"

حضرت عمر نے اس بنیاد پر کہ آیہ مبارکہ میں ایمان لانے اور عمل صالح انجام دینے کے بعد ہر قسم کے گناہ کی نفی کی ہے' اسے رہا کر دیا۔ جب حضرت امیر علیہ السلام کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو انہوں نے حضرت عمر سے اس پر شراب نوشی کی حد جاری نہ کرنے کی وجہ دریافت کی۔ حضرت عمر نے جب آیہ مبارک سے استشہاد کیا تو آپ نے فرمایا

"جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں وہ کبھی اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو حلال

---

[1] نساء ۱۷۶۔
[2] نساء ۱۲۔
[3] سورۃ مائدہ ۹۳

نہیں گرداننے"

لہٰذا قدامہ کو پلٹاؤ اور اسے توبہ کرنے کے لئے کہو اگر وہ توبہ کر لے تو اس پر شرابخوری کی حد جاری کرو اور اگر انکار کرے تو اسے قتل کر دو اس لئے کہ اس نے اس چیز کو اپنے اوپر جائز کیا ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں حرام قرار دیتا ہے۔ ادھر جب قدامہ کو معلوم ہوا کہ اس کی گلو خلاصی ممکن نہیں تو اس نے توبہ کر لی اور اسے کوڑے کھانے پڑے۔

اسی طرح حضرت ابوبکر کی نظر میں شرابخوار کی سزا چالیس کوڑے تھی لیکن جب سے جناب امیر علیہ السلام نے انہیں توجہ دلائی کہ اس کی سزا "اسی" (۸۰) کوڑے ہے تو وہ اسی پر عمل درآمد کرنے لگے۔

حضرت عمر کے دور میں ایک عورت پر بدکاری کا الزام لگایا گیا اور چار شاہدوں نے شہادت دی تو حضرت عمر نے اسے سنگسار کرنے کا حکم صادر کیا۔ جناب امیر علیہ السلام نے ان سے فرمایا

"فرض کرو کہ تمہیں اسے سزا دینے کا حق حاصل ہے لیکن اس کے رحم میں موجود بچہ کو سزا دینے کا حق تمہیں کس نے دیا"؟

حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب پاک میں فرماتا ہے'

"ولاتزرو وازرۃ و زراخری"[1]

"کوئی کسی دوسرے کا وزر و وبال نہیں اٹھایا کرتا"

حضرت عمر نے ناچار وہی جملہ دہرایا

"مجھے کسی ایسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے جس کے لئے ابوالحسن نہ ہوں"

جناب امیر علیہ السلام نے مزید فرمایا کہ اس عورت کو وضع حمل تک کی

---

[1] سورۃ انعام ۱۶۴-

مہلت دی جائے۔ اگر ولادت کے بعد وہ کسی ایسے شخص کو تلاش کر لے جو بچہ کی کفالت کر سکے تو اس پر حد جاری کی جائے ورنہ اس وقت تک انتظار کیا جائے جب تک کہ بچہ اس سے بے نیاز نہیں ہو جاتا۔

سعید بن مسیب [۱] روایت کرتے ہیں کہ اہالی شام میں سے ایک شخص نے اپنی اہلیہ کے ساتھ ایک اجنبی مرد کو دیکھا اور دونوں کو ہلاک کر دیا۔ جب اسے معاویہ کے پاس لایا گیا تو معاویہ کیلئے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ اس نے ابو موسیٰ اشعری کو لکھا کہ اس مسئلہ کو جناب امیرؑ کی خدمت میں پیش کرے۔ چنانچہ جب ابو موسیٰ نے آپ سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ

"اگر وہ شخص چار عینی شاہد نہ لا سکے تو اپنے آپ کو پیش کر دے" [۲]

حضرت عمر سے جب اس عورت کی عدت پوچھی گئی جو حاملہ تھی اور اسی دوران اس کا شوہر وفات پا گیا تھا تو انہوں نے کہا کہ اس کی عدت وضع حمل پر ختم ہو جائے گی۔ دلیل کے طور پر انہوں نے مذکورہ آیہ مبارکہ کا حوالہ دیا کہ،

"واولات الاحمال اجلهن ان يضعن حملهن" [۳]

"حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وضع حمل کریں"

جب یہی سوال جناب امیر علیہ السلام سے کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ "وضع حمل" اور چار ماہ دس دن میں سے جو مدت بھی زیادہ طویل ہو گی وہی ان کی عدت قرار پائے گی۔ ان معنی میں کہ اگر تاریخ وفات سے چار ماہ دس

---

[۱] سعید بن مسیب قریشی مخزومی (وفات ۹۷ ھ) مدینہ کے سات فقہاء میں سے ایک تھے۔ وہ جناب ختمی مرتبتؐ اور حضرت ابوبکر و عمر کے واقعات کے بارے میں سب سے زیادہ واقف سمجھے جاتے ہیں۔ (منجد الاعلام)۔

[۲] موطا مالک۔ ۲۱۲۔

[۳] سورۂ طلاق۔ آیہ نمبر ۴

دن قبل وفات ہو جائے تو یہ عورتیں عدت میں باقی رہیں گی یہاں تک کہ یہ مدت پوری ہو جائے اور اگر چار ماہ دس دن گذر جانے کے بعد بھی ولادت نہ ہو تو ولادت ہونے تک یہ عدت میں باقی رہیں گی اور شادی کرنے کی اہل قرار نہ پائیں گی۔ البتہ جن حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل پر مکمل ہو جاتی ہے' (جیسا کہ آیہ شریفہ سے ظاہر ہوتا ہے) وہ طلاق دی گئی عورتیں ہیں۔

جب امیر المومنین علیہ السلام سے اس حکم کے مصدر و ماخذ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے ذیل میں دی گئی آیہ شریفہ کی تلاوت کی'

والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجا" یتربصن بانفسہن اربعہ اشہر و عشرا"[۱]

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو یہ بیوائیں چار ماہ و دس روز تک انتظار کریں[۲]۔

امیر المومنین علیہ السلام کی نظر میں لفظ طلاق کو ایک وقت میں تین مرتبہ دہرانے سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی تھی اور اس کا سبب نہ بنتی تھی کہ شوہر بیوی ایک دوسرے کی طرف رجوع نہ کر سکیں۔ اس لئے کہ اس مسئلہ میں وہ اس آیہ مبارکہ پر عمل کرتے تھے جو صراحت سے بیان کرتی تھی کہ دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد بھی شوہر کو اختیار حاصل ہے کہ وہ بیوی کو نیکی کے ساتھ روک لے یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دے۔

الطلاق مرتان فامساک بمعروف اوتسریح باحسان[۳]

اور وہ آیہ مبارکہ جس میں طلاق دینے کے بعد عدت حساب کرنے کیلئے کہا گیا تھا'

---

[۱] بقرہ ۲۳۴۔
[۲] یعنی سورۃ طلاق کی آیت نمبر ۴ کو اس میں ضمیمہ کیا جائے تو انتہائی وقت کے بعد وہی نتیجہ نکلے گا جسے جناب امیر علیہ السلام نے بیان فرمایا۔
[۳] سورۃ بقرہ۔ ۲۲۹۔

فطلقوهن لعدتہن و احصوا العدہ[1]

"(اگر عورتوں کو طلاق دینا چاہو) تو ان کی پاکی کے ایام میں طلاق دو اور عدت حساب کرو"۔

جبکہ حضرت عمران تین طلاقوں کو تین طلاقوں کا درجہ ہی دیتے تھے۔ ان کی نظر میں اس طرح بیوی شوہر پر حرام ہو جاتی تھی یہاں تک کہ شخص ثالث سے نکاح نہ کر لے حالانکہ وہ خود اعتراف کرتے تھے کہ جناب رسالت مآبؐ کی نظر میں اس قسم کی طلاق حرمت کا سبب نہ بنتی تھی لیکن وہ آخر تک اپنے نظریہ پر ڈٹے رہے جیسا کہ اہلسنّت بھائی نقل کرتے ہیں اور خدا کی کتاب کے مخالف ہونے کے باوجود اس حکم میں ان کی پیروی کرتے ہیں[2]۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ روئے زمین پر کوئی ایسا شخص نہیں جو فرائض و احکام کو حضرت علیؑ سے زیادہ جانتا ہو۔ اور باوجویکہ خود ابن عباس فقہ و حدیث، تفسیر و لغت اور دوسرے علوم میں متبحر تھے لیکن جب کسی نے ان سے سوال کیا کہ ان کے علم کو جناب امیر علیہ السلام کے علم سے کیا نسبت ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ وہی جو حقیر سے قطرے کو اتھاہ سمندر سے ہوا کرتی ہے۔

مسلمان محققین اپنے تمام اختلاف کے باوجود اور مستشرقین بھی اعتراف کرتے ہیں کہ جناب امیر علیہ السلام تمام علوم اسلامی یہاں تک کہ زبان و ادب کے بھی بانی و موجد تھے۔ چنانچہ اشاعرہ ہوں یا معتزلہ، ابو حنیفہ ہوں یا امام مالک، شافعی ہوں یا احمد بن حنبل، ان تمام لوگوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ انہی لوگوں سے فیض حاصل کیا جو آپ کے شاگرد تھے۔

---

[1] سورۃ طلاق۔ ۱

[2] اگرچہ اہلسنّت یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ صحابی کا فتویٰ خدا کی کتاب کے دائرے کو محدود کر سکتا ہے لیکن نظر آتا ہے کہ خود ان کے درمیان بھی اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت عمر کا یہ فیصلہ سیاسی حیثیت رکھتا تھا چنانچہ صحیح روایات کی بنیاد پر تین مرتبہ لفظ طلاق دہرانے سے صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے (رجوع کریں فتاویٰ رشیدیہ)۔

اہل نظر کا اجماع ہے کہ امین رسالتؐ نے فرمایا تھا'

"اتقاکم علیؑ"

"علی تم سب سے زیادہ باتقویٰ ہیں"

بے شک تقویٰ کی طرح قضاوت کرنے میں بھی ان کا کوئی نظیر نہ تھا اس لئے کہ فقہ و قوانین پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا جو قضاوت کا بنیادی مصدر و ماخذ ہیں۔ ان کی قوت فکری اور پاک باطن سے بڑے بڑے مسائل لمحوں میں حل ہو جاتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ نظام کا احترام بھی کرتے تھے۔

وہ لوگوں کے درمیان عدالت رائج کرنے پر تاکید کرتے اور فرد کو معاشرے کے فرائض ادا کرنے اور اجتماع کے حقوق کی رعایت کرنے پر اصرار کرتے اور خود سالہا سال سے ان تمام چیزوں کی رعایت کرتے چلے آئے تھے۔

ایک رات انہوں نے کسی کے چیخنے کی آواز سنی جو انہیں پکار رہا تھا۔ وہ اس طرف دوڑے ہوئے گئے اور فرمانے لگے تمہارا مشکل کشا آیا چاہتا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص نے دوسرے کو مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے۔ آپ کو آتا دیکھ کر اس نے دوسرے کو چھوڑ دیا اور بولا'

"یا امیر المومنین! میں نے نو درہم میں اس شخص کو ایک کپڑا فروخت کیا اس نے مجھے کچھ درہم دیئے۔ میں نے جب باقی مانگے تو اس نے مجھے ناسزا کہا اور میرے منہ پر ایک زور دار طمانچہ رسید کیا"

آپ نے دوسرے سے کہا کہ اسے پوری قیمت ادا کرو اور پھر پہلے سے تھپڑ لگنے کا ثبوت طلب کیا۔ اس نے جب ثبوت پیش کر دیا تو آپ نے فرمایا اپنا بدلہ لے لو اس نے کہا اس نے خریدار کو معاف کیا۔

آپ نے فرمایا بے شک تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن ابھی اس شخص پر معاشرے اور نظام کا حق باقی رہ گیا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ اسے سزا دی جائے اور اس قسم کے تمام لوگوں کو عبرت حاصل ہو جو لوگوں پر ہاتھ اٹھاتے

ہیں، ان کی عزت و حیثیت سے کھیلتے ہیں اور ماحول و فضا کو خراب کرتے ہیں۔

اور چونکہ اس شخص نے معاشرے میں ظلم و زیادتی کی حمایت کی تھی لہٰذا حضرت امیر علیہ السلام نے مار کھانے والے شخص کے سامنے اسے نو عدد تھپڑ رسید کئے اور فرمایا "یہ حاکم کا حق ہے"

جناب امیر علیہ السلام کا علم صرف محسوسات و معقولات اور ان چیزوں تک محدود نہ تھا جن تک عام انسانوں کی رسائی بھی ہو سکتی ہے بلکہ ان مافوق الفطرت چیزوں پر محیط تھا جنہیں غیبی امور کہا جاتا ہے۔ یہ چیزیں انہوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے حاصل کی تھیں اور جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انہیں وحی کے ذریعہ سے دریافت کیا تھا۔ چنانچہ اصحاب جمل کی شکست کے بعد انہوں نے دسیوں سال بعد حبشیوں وغیرہ کے ہاتھوں بصرے کی تباہی و بربادی کی پیشن گوئی کی۔ آپ کے ساتھیوں میں سے جب کسی نے کہا کہ مولا آپ کے پاس تو علم غیب بھی ہے، تو آپ یہ سن کر مسکرائے اور جیسا کہ نہج البلاغہ میں ذکر کیا گیا ہے آپ نے فرمایا،

"یہ علم غیب نہیں بلکہ ان تحصیلی علوم میں سے ہے جو اس کے اہل اور شائستہ افراد سے سیکھے جاتے ہیں۔ علم غیب تو صرف قیامت کا علم ہے" جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

"ان اللہ عندہ علم الساعۃ"[1]

"صرف خداوند عالم کے پاس قیامت کا علم ہے"

پس یہی وہ تنہا علم ہے جو باری تعالیٰ سے مخصوص ہے باقی جو کچھ بھی ہے اسے ذات حق نے اپنے پیارے نبیؐ کو تفویض کیا اور انہوں نے اس سب کو مجھے تعلیم دیا اور میرے حق میں دعا فرمائی کہ ان تمام علوم کو میرا سینہ برداشت

---

[1] سورۂ لقمان - ۳۴۔

کر سکے اور روح تحمل کر سکے (یعنی میرے حق میں انشراح صدر کی دعا کی)[1]

بہرحال جناب امیر علیہ السلام نے بہت سی پیشن گوئیاں کیں جن میں سے کچھ نے دسیوں سال اور کچھ نے صدیاں بیت جانے کے بعد حقیقت کا روپ ڈھالا۔

جیسا کہ بصرے کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ

"میں اسے پانی میں غرق ہوتا دیکھ رہا ہوں"[2]

اس خبر نے دو مرتبہ حقیقت کا روپ ڈھالا اور ہر مرتبہ پورا شہر زیر آب آ گیا' ہر چیز تباہ ہو گئی اور اچھی خاصی جمعیت ہلاک ہو گئی۔ پہلی مرتبہ قادر باللہ احمد بن اسحاق بن مقتدر کے دور میں کہ ۳۸۱ھ میں لوگوں نے اس کی بیعت کی تھی اور دوسری مرتبہ عبداللہ بن قادر (قائم بہ امر اللہ) کے دور میں جس سے ۴۲۲ھ میں بیعت کی گئی تھی۔

اسی طرح احنف بن قیس سے ایک گفتگو میں آپ نے بصرے پر حبشیوں کے یلغار کی خبر دی[3]

مورخین کا اجماع ہے کہ یہ حادثہ عباسی خلیفہ المہتدی کے دور میں ۲۵۵ھ میں پیش آیا۔ اس زمانہ میں امام حسن عسکری علیہ السلام شہر سامراء میں محصور تھے۔ حبشیوں کے سردار نے دعوٰی کیا تھا کہ وہ حسب و نسب کے لحاظ سے علوی (سادات سے) ہے۔ مہتدی نے جب اس کے بارے میں امامؑ سے استفسار کیا تو امام علیہ السلام نے اس کی تردید کی۔ ہم امام حسن عسکری علیہ السلام کی سیرت میں اس پر مزید گفتگو کریں گے۔

جناب امیر علیہ السلام نے بصرے پر تاتاریوں کے حملہ کی خبر بھی دی تھی

---

[1] نہج البلاغہ (صبحی صالحی) خطبہ نمبر ۱۲۸ (اردو - ۱۲۶)۔
[2] نہج البلاغہ (صبحی صالحی) خطبہ نمبر ۱۳ -
[3] نہج البلاغہ (صبحی صالحی) ۱۲۸ (اردو ۱۲۶)۔

جسے ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ کی دوسری جلد میں ذکر کیا ہے۔ تاتاریوں نے زیادہ تر اسلامی ممالک کو تاراج کر لیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بصرے میں انہیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ یہاں انہوں نے مزید وحشی گری اور بربریت کا مظاہرہ کیا[1]۔

آپ نے لوگوں کو کوفہ میں ہونے والی قتل و غارتگری کی خبر دی اور حجاج بن یوسف جیسے ظالم و سفاک حکمرانوں سے خبردار کیا[2]۔ اپنے ایک کلام میں کوفیوں سے خطاب کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں

"میرے بعد تم پر وہ حکام مسلط ہوں گے جو تمہیں کوڑوں اور تلواروں کا مزہ چکھائیں گے اور تم پر ثقیف کے دو شخص حکومت کریں گے جن میں ایک کی بینائی کمزور (حجاج بن یوسف) اور دوسرے کا قد چھوٹا ہو گا (یوسف بن عمر) یہ لوگ قتل و غارتگری اور ظلم و ستم کا بازار گرم کریں گے اور بہت کم عرصہ تک باقی رہ سکیں گے"

اسی طرح آپ نے ایران کے کچھ علاقوں میں سادات علوی کے ظہور کی خوشخبری دی اور اس ضمن میں فرمایا،

"اور طالقان میں آل محمدؐ کا ایک ایسا گنجینہ ہے جسے اللہ تعالیٰ جب مناسب سمجھے گا، ظاہر کرے گا۔ یہ لوگ خدا کے اذن سے اٹھ کھڑے ہوں گے، قیام

---

[1] نہج البلاغہ (صبحی صالحی خطبہ نمبر ۱۲۸) (اردو - ۱۲۶) اس خطبہ میں جناب امیر علیہ السلام بصرے پر حبشیوں کے ہجوم کی پیشن گوئی کرنے کے بعد ترکوں کی توصیف کرتے ہیں اور چونکہ تاتاری (مغل، منگول) بھی انہی سے ہیں لہٰذا یہ خطبہ ان کے شامل حال بھی ہے۔ ابن ابی الحدید اپنی کتاب میں اس خطبہ کی شرح کے ذیل میں لکھتا ہے کہ تاتاریوں نے اس کے زمانے میں سر و سامان پیدا کیا اور قتل و غارتگری سے زیادہ تر اسلامی و غیر اسلامی مملکتوں کو ویران کر دیا لیکن خوش قسمتی سے وہ بغداد یا عربوں کے عراق میں داخل نہیں ہوسکے وہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ چیز حضرت امیرؑ کے خطبہ سے بھی سمجھی جاسکتی ہے اس لئے کہ بصرے میں رہ کر انہوں نے بتایا تھا کہ وہاں قتل و غارتگری کا بازار گرم ہوگا (یعنی دور کی طرف اشارہ کیا تھا) چنانچہ اگر یہ بات صحیح ہو تو مصنف کا استشہاد غلط ہوجائے گا کہ جناب امیرؑ نے بصرہ میں تاتاریوں کے حملہ کی پیشین گوئی کی تھی۔ مزید تحقیق کیلئے تاریخی کتب کی طرف رجوع کریں۔

[2] نہج البلاغہ (ترجمہ مولانا مفتی جعفر حسین صاحب) خطبہ نمبر ۴۷، ۱۷۔

کریں گے اور خدا کے دین کی طرف بلائیں گے"

امام عالی مقام نے باخمراء کے مقام پر حضرت نفس زکیہ (محمد بن عبداللہ حسین) اور ان کے بھائی ابراہیم کی شہادت کی خبر دی اور اس مغربی مملکت کی نشاندہی بھی کی جس کی بنیاد ابو عبداللہ نے رکھی تھی[۱]۔

یہ اور نہ جانے کتنے ہی ایسے واقعات اور ماجرا جو صدیاں بیت جانے کے بعد پیش آئے لیکن آپ بہت پہلے ان کی خبر دے چکے تھے۔

---

[۱] آخری تین پیشن گوئیاں نہج البلاغہ میں ذکر نہیں کی گئیں ہیں اور مصنف نے غالباً انہیں اہلسنت سے نقل کیا ہے۔

☆ ۔ ابوعبداللہ (وفات ۱۵۳۲ء) بنی نصر کے سلسلہ میں غرناطہ (Garanada) کا آخری امیر تھا اسے فرزینینڈ (Ferdeinand) آراگو (Arago) کے بادشاہ اور ازابیلا (Isabella)' کاسٹیلا (Castilla) کی ملکہ نے اپنی امارت میں لے لیا تھا اور وہ مغرب کی طرف چلا گیا تھا۔ (بعد میں انہیں ریاستوں کے امتزاج سے اسپین وجود میں آیا)۔

آپؑ کی شجاعت

ہم نے گذشتہ ابواب میں ذکر کیا کہ جناب امیر علیہ السلام نے مکہ اور بدر و احد و احزاب وغیرہ میں کس طرح جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ داد شجاعت دی۔ اور پھر وہ تلوار جس نے مشرکین کے سروں کے ٹکڑے اڑا ڈالے تھے' میان کی امانت میں رہی یہاں تک کہ وہ دن آگئے جن کے بارے میں جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا تھا کہ

"اے علیؑ میرے بعد عہد شکنوں' باغیوں اور گمراہوں کے لشکر تمہارے خلاف تلوار اٹھائیں گے۔"

بخدا اگر تاریخ میں جمل و صفین و نہروان کے علاوہ حضرت علیؑ کی کسی اور جنگی کامیابی کا ذکر نہ بھی کیا جاتا تو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ تاریخ انسانیت نے جنگوں میں آپ سا دلاور نہ دیکھا کہ جس کے سامنے بڑے بڑے پہلوان اور سورما جانے سے گھبرائیں' اگر لحظہ بھر بھی آپ کے سامنے ٹھہر جائیں تو ناز کریں اور اگر آپ سے بچ کر نکل بھاگیں تو انہیں ذلت و عار کا احساس نہ

ہو۔

جنگ جمل میں جبکہ دشمن کی فوجیں حاوی ہونے لگی تھیں اور (سفر کی تکان کے باعث) آپ کو اونگھ سی آ رہی تھی، تو آپ کے ساتھ شریک لوگوں میں سے کسی ایک نے آپ پر نگاہ ڈالی اور کہا،

''مولا معبود کی قسم ہم نے آج تک ایسا سماں نہ دیکھا تھا کہ ہمارے سامنے دشمن کی ایک لاکھ تلواریں ہیں، ہمارے دائیں بائیں بازو کی فوجیں شکست کھا رہی ہیں اور آپ کی یہ حالت ہے''

یہ سننا تھا کہ امام علیہ السلام متنبہ ہوئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھ بارگاہ ربوبی میں اٹھا دیئے اور قاضی القضاۃ کے حضور گلہ کیا،

''پالنے والے تو جانتا ہے کہ عثمان کے معاملہ سے میرا دامن پاک و صاف ہے لیکن طلحہ و زبیر نے پھر بھی لوگوں کو میرے خلاف بھڑکایا ہے''

یہ کہہ کر آپ نے محاذ جنگ کا جو جائزہ لینا شروع کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ ساتھی مارے جا چکے ہیں اور کچھ پسپائی اختیار کر رہے ہیں۔ یہ دیکھنا تھا کہ ایک مرتبہ اپنے بیٹے اور فوج کے پرچمدار محمد بن حنفیہ سے پکار کر آگے بڑھنے کے لئے کہا۔ (لیکن فوجوں کے انبوہ اور تلواروں کی یلغار میں وہ کہاں آگے بڑھتے) چنانچہ جب وہ پیشقدمی نہ کر سکے تو خدا کے شیر کو جوش آیا اور پرچم کو ان سے چھین کر خود امام علیہ السلام دشمن کے قلب میں جا گھسے۔ آپ نے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے اور مسلسل تلوار چلاتے رہے۔ دشمن کی فوجیں اس طرح آپ سے ڈر ڈر کر بھاگ رہی تھیں جس طرح سے کہ بھیڑ بکریاں ببر شیر کو دیکھ کر بچھاڑتی ہیں۔ پھر آپ واپس ہوئے اور پانی مانگا۔ ایک شخص نے پانی میں شہد ملا کر آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے ایک گھونٹ پیا اور اس شخص کو یہ تک بتایا دیا کہ یہ شہد طائف کا ہے۔ یہ سن کر وہ حیرت میں ڈوب گیا کہ اس وقت جبکہ جانوں کی امان نہ تھی اور موت سروں پر منڈلا رہی تھی انہوں نے شہد کی خاص قسم کو بھی پہچان لیا تھا۔

امام عالی مقام نے اس سے فرمایا'

"میرے بھتیجے تمہارے چچا کو نہ کوئی چیز پریشان کر سکی ہے اور نہ ہی خوفزدہ کر پائی ہے۔"

اس کے بعد ہمارے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی شجاعت کے تذکروں اور ان کی عظمت و شکوہ کے ان واقعات کو کہاں سے شروع کریں۔ جن کے چرچے پہلوانوں میں مشہور رہتے اور جن کی مثالیں عوام کے زبان زد ہو گئی تھیں۔ جب بھی کسی واقعہ کو شروع کرنا چاہتے ہیں تو یکایک نظر ایک ایسے واقعے پر جا پڑتی ہے جو اس سے زیادہ تعجب آمیز اور حیران کن ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف وہ تمام لوگ کرتے ہیں جنہوں نے ان کی زندگی کے مختلف ادوار پر قلم اٹھایا۔ اور چونکہ ہم بھی اسی تحیر و تردد کا شکار ہیں لہٰذا دوسروں سے نقل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ابن ابی الحدید معتزلی ان کی اس عظمت و ہیبت کے بارے میں لکھتا ہے کہ انہوں نے ماضی کے تمام پہلوانوں کا تذکرہ ذہنوں سے نکال باہر کیا اور مستقبل کے شہ زوروں کے نقوش تک مٹا دیئے۔ جنگوں میں ان کی استقامت اتنی مشہور ہوئی کہ ہمیشہ اسے نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا رہے گا وہ ان شہسواروں میں سے تھے جنہوں نے نہ کبھی میدان جنگ سے فرار کیا اور نہ وہ فوجوں کی کثرت سے مرعوب ہوئے۔ جس سے مقابلہ کیا اس کا کام تمام کیا اور جہاں ایک ضرب لگا دی وہاں دوسری کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ انہوں نے جب امت مسلمہ کو خون خرابہ سے بچانے کے لئے معاویہ کو مقابلہ کی دعوت دی اور ابن عاص نے اسے قبول کرنے کا مشورہ دیا تو معاویہ نے اس سے کہا'

"آج کے علاوہ کبھی تم نے مشورہ دینے میں دھوکہ نہ دیا تھا۔۔ مجھے ابو الحسنؑ سے لڑنے کے لئے کہتے ہو یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ وہ انتہائی بہادر و شجاع ہیں۔ لگتا ہے کہ شام کی امارت پر تمہارا دل آ گیا ہے۔"

یہ سب بیان کرنے کے بعد ابن ابی الحدید اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے'

"میں اس شخص کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں جسے کفار نبوت کا انکار کرنے کے بعد بھی پسند کریں اور اہل اسلام دشمنی کے باوجود بھی ان کی عظمت کے قائل ہوں۔ جن کی نبرد کے دوران کی تصویروں کو فرانس اور روم کے قیصر اپنی عبادتگاہوں میں نصب کریں اور ترک و دیلم کے بادشاہ ان کی صورت کو اپنی تلواروں پر نقش کریں۔ اور ہر شخص چاہے کہ ان سے منسوب ہو کر اپنے کمالات اور خوبیوں میں خاطر خواہ اضافہ کرے۔"

خلاصہ کلام یہ کہ جناب امیر علیہ السلام نے شجاعت و بہادری کی بہترین اور جیتی جاگتی مثالیں قائم کیں جو صرف شجاعت و شرافت پر صادق آتی ہیں اور ہر قسم کی پیچ حرکت سے مصون و محفوظ ہیں۔ اسی لئے آپ کے لئے انتہائی تکلیف دہ تھا کہ کسی کو آپ کی ذات سے نقصان پہنچے اگرچہ خود وہ شخص آپ کو آزار دینا چاہتا ہو۔ اسی طرح آپ یہ جان لینے کے بعد بھی کہ کوئی آپ کی جان کے درپے ہے اسے تکلیف نہ دیتے یا کسی قسم کا بدلہ نہ لیتے۔ اسی بزرگی و شرافت کے باعث آپ نے کبھی معاویہ اور اس کی فوجوں کی بد زبانی و ناسزا کا جواب نہ دیا۔ اور نہ صرف اپنے آپ کو اس سے دور رکھا بلکہ اپنے اصحاب کو بھی اس ناشائستہ عمل سے روکا اور منع فرمایا۔

"انی اکرہ لکم ان تکونوا سبابین"

"میں تمہارے لئے پسند نہیں کرتا کہ زیادہ ناسزا کہنے والوں میں قرار پاؤ، بلکہ اگر ان کی ہدایت کے لئے دعا کرو اور خدا سے اپنی اور ان کی جانوں کی حفاظت اور اصلاح طلب کرو تو یہ کہیں بہتر ہو گا"

لہٰذا جس طرح سے جنگوں کے دوران انہوں نے بے شمار مرتبہ اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا اسی طرح انتہائی غضبناک لمحوں میں بھی اپنی فوج کو اس بات کی اجازت نہ دی کہ کسی بھاگتے کا پیچھا کریں، کسی زخمی پر ہاتھ اٹھائیں یا کسی ایسی عورت کی تذلیل و توہین کریں جو انہیں یا ان کے خلفاء کو برا بھلا کہہ رہی ہو۔

چنانچہ اہل لشکر کو انہوں نے یہ ہدایات دی تھیں،

دو کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھاؤ' کسی بھاگتے کا پیچھا نہ کرو کسی کمزور پر حملہ نہ کرو اور کسی ایسی عورت کی بے عزتی نہ کرو جو تمہارے بزرگوں کو ناسزا کہہ رہی ہو''

آپ اپنے بدترین دشمن پر بھی غلبہ پاکر اس وقت اسے معاف کر دیتے تھے جب بچنے کے لئے مکر و فریب کے علاوہ اس کے پاس کوئی حیلہ نہ رہ جاتا تھا لہٰذا جنگ جمل (میدان بصرہ) میں آپ نے عبداللہ بن زبیر' مروان بن حکم اور سعید بن عاص کو معاف کیا اور اپنے ساتھیوں کو ان سے مدارات کرنے کی نصیحت فرمائی۔

اسی طرح جب (صفین میں) آپ عمر بن عاص پر حاوی آگئے جو (شرارت و خباثت میں) معاویہ سے کم نہ تھا تو وہ کمینگی اور پستی پر اتر آیا۔ اسے ذوالفقار سے بچنے کا کوئی حیلہ نہ سوجھا سوائے اس کے کہ اپنی شرمگاہ کو نمایاں کر دے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس کی موت سے معاویہ کی فوجوں کو شکست ہو جاتی اس لئے کہ وہی معاویہ کا عیار وزیر تھا لیکن شرافت و مردانگی کے باعث آپ نے گوارا نہ کیا کہ اس پستی و افتادگی میں اس پر ہاتھ اٹھائیں۔ اسی طرح جنگ صفین میں معاویہ نے آپ کی فوجوں پر پانی بند کر دیا تھا لیکن آپ کی فوجوں نے جب پانی پر قبضہ کر لیا تو اسے سب کے لئے آزاد چھوڑ دیا حالانکہ اگر آپ چاہتے تو پانی بند کر کے باآسانی انہیں شکست کھانے اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتے تھے لیکن جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے ہوا کی طرح تمام انسانوں کے لئے جائز رکھ چھوڑا تھا اور کسی کی ملکیت قرار نہ دیا تھا اسے آپ کیونکر ان پر بند کر سکتے تھے۔

معاویہ بن ابی سفیان تو یہ حسرت لئے مر گیا کہ حضرت علیؑ اور ان کی فوجوں کو پیاس سے تڑپا تڑپا کر مار ڈالے لیکن اس کے بیٹے یزید نے آپ کے فرزند امام حسین علیہ السلام اور ان کے اعوان و انصار کے ساتھ یہ کام کر دکھایا۔ اس نے انہیں کربلا میں محصور کر کے ان پر پانی بند کر دیا اور اگر نیزہ و تلواریں ان کے گلوں تک نہ پہنچتی تو صرف پیاس ہی انہیں مار ڈالنے کے لئے

کافی تھی۔

یوں تو جناب امیر علیہ السلام نے ہرمیدان و معرکہ میں اعلیٰ اخلاق و عفو و درگزر کا مظاہرہ کیا لیکن جنگ جمل میں حضرت عائشہ سے ان کا حسن سلوک مثالی ہے۔اس لئے کہ انہوں نے حضرت عائشہ پر غلبہ پاکر بھی ان کے ظاہری احترام میں کمی نہ آنے دی انہیں بہ حفاظت ان کے گھر روانہ کیا اور بہت دور تک خود بھی ساتھ گئے۔ نیز ان کی خدمت کے لئے کچھ عورتوں کو مامور کیا جو مردوں کے بھیس میں تھیں۔ حالانکہ انہوں نے آپ کے خلاف بغاوت کرنے والوں کی قیادت کی اور ہزاروں مسلمانوں کو خلیفۃ المسلمین سے جنگ کرنے کی دعوت دی۔ یہ اور اس جیسی نہ جانے کتنی سنہری مثالیں اور لاتعداد واقعات جن سے شرافت و مردانگی ٹپکتی ہے۔

آپؑ کا زہد

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے زہد کی گفتگو ان کی بہادری و شجاعت کے کارناموں سے جدا نہیں اس لئے کہ اگر میدان جنگ میں اپنے دشمن پر غالب آجانے کا نام شجاعت ہے تو اپنے بد ترین دشمن یعنی ہوا و ہوس اور خواہشات نفس پر حاوی ہو جانا زہد ہے۔

تاریخ ہرگز کسی ایسے حاکم اور فرمانروا کو نہ جانتی ہو گی جس کے پاس دولت و اقتدار اور گرہستی کی تمام آسائشیں فراہم ہوں لیکن وہ پھر بھی ان سے بیزار رہے جیسا کہ جناب امیر علیہ السلام تھے۔

کیا تاریخ کسی ایسے حکمران کو پہچانتی ہے جو سوکھی روٹی بھی اپنے اوپر حرام کرے اور سیر ہو کر نہ کھائے اس لئے کہ اس کے اطراف میں ایسے نادار لوگ ہوں جنہیں روٹی تک میسر نہیں؟ وہ نرم اور آرام دہ لباس بھی اسی لئے نہ پہنے کیونکہ وہ بہت سے لوگوں کو کھردرے لباس کی نعمت سے بھی محروم دیکھ رہا ہو۔

کیا تاریخ میں کوئی ایسا امیر گذرا ہے جو جو کی سوکھی روٹی پر گذارا کرے جسے وہ ہاتھوں یا زانوں کی مدد سے توڑتا ہو۔ جو مال دنیا سے کچھ بھی ذخیرہ نہ کرے اور یہ کہتا ہوا اس دنیا سے رخت سفر باندھے کہ'

"کیا میں اسی پر اکتفاء کر لوں کہ لوگ مجھے امیرالمومنین کہیں اور گرہستی کی مشکلات اور غم روزگار میں ان کا ہاتھ نہ بٹاؤں"

یہ وہی حضرت امیرؑ تھے جن کی نظر میں دنیا کی حقیر ترین چیز بھی اس خلافت سے بہتر تھی جو حق کو زندہ کرنے اور باطل کا گلا گھونٹنے کی طاقت نہ رکھتی ہو۔ جو اپنے اصحاب اور والیوں کی معمولی سی چیز میں بھی پکڑ کر لیتے تھے۔ اور انہیں ڈراتے اور دھمکاتے تھے۔ والیوں کو ارسال کئے گئے خطوط میں سے ایک خط میں فرماتے ہیں'

"معبود کی قسم اگر تم نے اپنے پاس موجود چیزوں میں' چاہے کم ہوں یا زیادہ' خیانت کی تو میں وہ کچھ کر گذروں گا کہ تم اسے سنبھال نہ پاؤ گے اور ذلت و رسوائی کے سوا تمہیں کچھ حاصل نہ ہو گا"

ایک اور شخص کو جو رشوت لیتا اور غریبوں کے مال سے دولتمند بننے کے خواب دیکھ رہا تھا آپ لکھتے ہیں'

"اے شخص خدا سے ڈر اور لوگوں کا مال انہیں پلٹا دے' اگر تو نے ایسا نہ کیا اور میرے قابو میں آ گیا تو اس تلوار سے تیرا حساب صاف کروں گا جو سیدھا جہنم پہنچاتی ہے"

مورخین کی جماعت ایک روایت نقل کرتی ہے جس کی سند احنف بن قیس پر ختم ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معاویہ کو حکومت و سلطنت ملنے کے بعد ایک مرتبہ وہ معاویہ کے پاس گیا تو اس نے کھانے پینے کی مختلف چیزیں اس کے سامنے پیش کیں۔ اس نے تعجب کیا اور کہا'

"اللہ تعالیٰ حضرت علیؑ کو جزائے خیر دے اس مسئلہ میں انہوں نے جو روش اپنائی وہ نہ تم اور نہ ہی تم جیسے حکمران اختیار کر سکتے ہیں"۔

معاویہ نے جب مزید پوچھا تو اس نے کہا'

ایک مرتبہ میں ان کے پاس گیا۔ وہ ان کے افطار کا وقت تھا چنانچہ انہوں نے مجھے حسنین علیہما السلام کے پاس جانے کے لئے کہا اور خود نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے ایک بند تھیلی میں سے جو کی روٹی نکالی اور تھیلی کو دوبارہ بند کر دیا۔

میں نے عرض کیا یا امیرالمومنین آپ خسیس نہیں ہیں پھر کیوں تھیلی بند کر دی۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس ڈر سے کہ کہیں حسنین علیہما السلام اس میں گھی کا تڑکا نہ لگا دیں۔

میں نے پوچھا کہ کیا یہ حرام ہے؟ انہوں نے فرمایا نہیں لیکن حق کا پرچار کرنے والے حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں کمزور ترین رعایا کو مدنظر رکھیں اور کسی چیز میں بھی اپنے کو ان سے نمایاں نہ کریں تا کہ غریب انہیں دیکھے تو اللہ تعالیٰ سے اپنی غربت کا رونا نہ روئے اور امیر انہیں دیکھے تو اللہ تعالیٰ کا شکر کرے اور اس کی بارگاہ میں مزید متواضع ہو جائے۔

احنف بن قیس مزید نقل کرتا ہے کہ ربیع بن زیاد جناب امیر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اے امیر المومنین میرا بھائی بن زیاد پرانی عباء اوڑھتا اور ہر چیز سے پرہیز برتتا ہے۔ نیز اہل و عیال کے پاس بھی نہیں جاتا۔ آپ نے فرمایا میں خود اس کی خبر لیتا ہوں۔ آپ اس کے پاس تشریف لے گئے۔ اس نے ایک عباء پہنی اور دوسری اوڑھی ہوئی تھی۔ اس کے بال غبار آلود اور بکھرے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا'

اے عاصم تجھ پروائے ہو کیا تجھے اپنی اہلیہ سے شرم اور بچوں پر رحم نہیں آتا۔ کیا تو نے یہ فرمان الٰہی نہیں سنا کہ'

"و یحل لھم الطیبات"[1]

"پیغمبر اکرمؐ ان کے لئے پاک و صاف اور اچھی چیزوں کو حلال کر دیتے ہیں"

کیا جو چیز اللہ تعالیٰ نے تمہارے اور تمہارے ابنائے حسن کے لئے جائز قرار دی ہو اسے انجام دیتے ہوئے تمہیں کراہت محسوس ہو گی؟

کیا تم نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ مقولہ نہیں سنا کہ

"تمہارا نفس تم پر ایک حق رکھتا ہے' تمہاری اولاد تم پر ایک حق رکھتی ہے اور تمہارا پروردگار تم پر ایک حق رکھتا ہے"

اس نے سوال کیا کہ یا حضرت پھر آپ کیوں اتنا کھردرا لباس پہنتے اور اتنی سادہ غذا تناول کرتے ہیں؟

آپ نے جواب دیا'

"وائے ہو تم پر! اللہ تعالیٰ نے حق کے حکمرانوں پر فرض کیا ہے کہ وہ فقراء کے رہن سہن کو اپنائیں تاکہ نادار لوگ اپنے آپ کو حقیر اور کمتر نہ سمجھیں اور دولتمند حضرات اپنی بے نیازی پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کریں"

مناقب احمد بن حنبل اور دوسری کتابوں میں ایک روایت نقل کی گئی ہے۔ اسے سوید بن غفلہ نامی شخص نے نقل کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

"ایک مرتبہ میں جناب امیر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت ان کے گھر میں ایک بوسیدہ چٹائی کے علاوہ کوئی اور چیز نہ تھی۔ میں نے عرض کیا اے امیرالمومنین آپ مسلمانوں کے حاکم و فرمانروا ہیں اور بیت المال آپ

---

[1] سورۂ اعراف آیۂ ۱۵۷

کی نگرانی میں ہے۔ آپ کے پاس (مختلف ملکوں سے) وفود آتے جاتے رہتے ہیں حالانکہ آپ کے گھر میں صرف یہ بوسیدہ چٹائی ہے۔"

ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے فرمانے لگے'

"اے سوید سرائے اور گذر گاہ کو سجایا نہیں جاتا' اور ہمارے سامنے تو ہمیشگی کا گھر ہے جہاں ہم اپنی چیزیں منتقل کر چکے ہیں۔اور بہت جلد خود بھی وہاں پہنچ جائیں گے"

سوید کہتا ہے کہ "خدا کی قسم ان کی گفتگو سے مجھ پر بھی رقت طاری ہو گئی"

محدثین ضرار بن حمزہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ایک دن معاویہ کے پاس پہنچا۔ معاویہ نے حضرت امیرؑ کی توصیف کرنے کے لئے کہا تو اس نے معذرت چاہی لیکن جب معاویہ نے اصرار کیا تو اس نے کہا

"معبود کی قسم وہ بہت بلند ہمت اور توانا انسان تھے۔ جو کہتے کرتے اور جو فیصلہ کرتے عدالت سے کرتے' علم ان کے چاروں طرف سے پھوٹتا اور حکمت و دانش ان کی زبان سے بولتی تھی وہ دنیا اور اس کی چمک دمک سے گھبراتے اور رات اور اس کی سیاہی سے مانوس تھے۔ خدا کی قسم وہ بہت روتے اور انتہائی غور و فکر کرتے تھے۔ سمجھ سے باہر ہے کہ ان کا لباس کتنا کھردرا اور کھانا کتنا بدذائقہ ہوتا تھا۔ جب بھی ہمارے درمیان رہتے ہم جیسے ہوجاتے۔ ہم ان سے سوال کرتے تو جواب دیتے' ہم ان کے پاس جاتے تو ہم سے باتیں کرتے اور ہم انہیں بلاتے تو وہ آجاتے لیکن اتنا نزدیک ہونے کے باوجود بھی ہم ان کی ہیبت کے باعث نہ بولتے تھے اور ان کی عظمت و شوکت کی خاطر کلام میں پہل نہ کرتے تھے۔ اگر وہ مسکراتے تو ایک چمکتے دمکتے ہیرے کی طرح دکھائی دیتے وہ دینداروں کی عزت کرتے اور ناداروں سے محبت کرتے تھے۔ بااثر لوگ ان سے غلط کام کی توقع نہ رکھتے اور کمزور ان کے انصاف سے مایوس نہ ہوتے تھے۔"

اے معاویہ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے انہیں تاریک

راتوں میں بھی دیکھا جب وہ داڑھی پکڑے محراب عبادت میں کھڑے ہوتے تھے اور ایسا بلک بلک کے روتے جیسے سانپ کا کاٹا روتا ہے اور یوں دھاڑیں مارتے جیسے بیٹے کا داغ دیکھنے والی ماں چیختی ہے گویا میں انہیں یہ کہتے ہوئے سن رہا ہوتا تھا'

اے دنیا مجھ سے دور ہو اور کسی اور کو دھوکہ دے ۔ کیا مجھے شکار کرنا چاہتی ہے یا مجھے اپنی خوبصورتی اور سنگھار دکھارہی ہے ناممکن ہے ناممکن ہے میں تو تجھے تین طلاقیں دے چکا ہوں ! اب تیرے لئے رجوع کی گنجائش نہیں ۔ تیری عمر بہت کم تیری زندگی بہت حقیر اور تیرا خطرہ بہت بڑا ہے ۔ آہ ! کہ سامان سفر کم اور سفر بہت طویل اور پر پیچ و خطرناک ہے ۔ راوی کہتا ہے کہ معاویہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے جنہیں پلٹانے پر وہ قادر نہ تھا اور اس کے اطراف میں آہ و زاری سے لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں ۔ اس نے اعتراف کیا کہ جناب امیر علیہ السلام ایسے ہی تھے ۔

مولائے متقیان نے نہ جانے کتنی مرتبہ سچی قسم کھائی حالانکہ بولنے سے پہلے وہ عمل کرتے تھے بلکہ دراصل ان کی گفتار ان کے کردار کا آئینہ اور ان کے عمل سے ماخوذ ہوتی تھی' انہوں نے قسم کھائی اور فرمایا' ۔

خدا کی قسم اگر مجھے پوری دنیا کی حکومت و سلطنت بھی دیدی جائے اور یہ کہا جائے کہ چیونٹی کے حق میں خدا کی معصیت کروں اور اسے اس کے رزق سے محروم کردوں تو میں ہرگز ایسا نہ کروں گا ۔ بے شک تمہاری یہ دنیا میری نظر میں اس ٹکڑے سے بھی زیادہ حقیر و پست ہے جو ٹڈی کے منہ میں ہوتا ہے ۔

مورخین کو اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ایام خلافت میں اور اس سے پہلے بھی جناب امیر علیہ السلام کے پاس صرف تین کپڑے تھے ۔ ایک قمیض' ایک تہبند اور ایک جبہ جس میں وہ پیوند لگاتے لگاتے عاجز آگئے تھے ۔

غزالی لکھتے ہیں کہ حضرت علی بن ابی طالب بیت المال سے مطلقاً کچھ نہ لیتے تھے یہاں تک کہ وہ اپنی تلوار بیچنے پر مجبور ہوگئے تھے ۔ ان کے پاس صرف

ایک قمیض تھی اور غسل کے وقت بھی دوسری میسر نہ تھی۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ امیرالمومنین علیہ السلام قنبر[1] کے ساتھ کپڑے کے بازار میں تشریف لے گئے اور ایک پارچہ فروش سے دو کپڑے دینے کے لئے کہا۔ اس نے کہا اے امیرالمومنین مجھے آپ سے ایک کام تھا۔ آپ سمجھ گئے کہ وہ آپ کو پہچان چکا ہے لہٰذا اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے کہ شاید آپ سے خصوصی رعایت کرے۔ آگے جاکر آپ نے ایک بچہ سے دو کپڑے خریدے ایک تین درہم کا تھا اور دوسرا دو درہم کا۔ جب آپ واپس ہوئے تو بچہ کا باپ آیا۔ بچہ نے تمام ماجرا کہہ سنایا اور آپ کے خدو خال بھی بتادیئے۔ پارچہ فروش بھاگا بھاگا آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میرے بچہ نے آپ سے دو درھم کا نفع لیا ہے آپ چاہیں تو ایک درہم واپس لے لیں اور چاہیں تو دونوں لے لیں۔ آپ نے فرمایا کہ آپ نے اپنی رضایت سے یہ معاملہ کیا ہے لہٰذا اس کی ضرورت نہیں پھر آپ نے تین درہم والا لباس قنبر کو دیا اور دوسرا اپنے لئے رکھ لیا۔ قنبر نے کہا۔

مولا یہ کپڑا آپ کے لئے زیادہ ضروری ہے اس لئے کہ آپ منبر پر بیٹھتے اور لوگوں سے خطاب کرتے ہیں۔

آپ نے فرمایا' قنبر تم جوان ہو اور تمہارے ساتھ جوانی کی امنگیں ہیں۔ مجھے اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے کہ اس میں تم پر سبقت لے جاوں۔ اس لئے کہ میں نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سنا ہے کہ ''جو خود پہنتے ہو اسی میں سے انہیں (اپنے نوکروں اور غلاموں کو) پہناؤ اور جو خود کھاتے ہو اسی میں سے ان کی خاطر مدارات کرو۔''

ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ مولائے متقیان سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنے لباس و خراش اور خوراک کے سلسلہ میں اتنے سخت تھے اور دوسری طرف دیکھتے ہیں کہ وہ یتیموں کو جمع کرکے انہیں شہد اور لذیذ ترین کھانے کھلاتے

---

[1] احیاء العلوم (غزالی)۔

تھے۔ یہاں تک کہ ان کے صحابیوں میں سے ابو طفیل نامی شخص نے اس تمنا کا اظہار کیا کہ اے کاش وہ بھی یتیم ہوتا حالانکہ وہ خود اپنی تمام مال و دولت فقیروں میں تقسیم کرچکا تھا۔

فخر رازی نیچے دی گئی آیۂ شریفہ۔

و الذین ینفقون اموالھم باللیل و النھار سرا" وعلانیہ[1]

"اور وہ لوگ جو صبح شام، دکھاکر اور چھپاکر اپنے مال و دولت سے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں"' کے ذیل میں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ آیۂ مذکورہ جناب امیر علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی جیسا کہ مظفری دلائل صدق میں اسی مطلب کو واحدی کی کتاب اسباب نزول سے نقل کرتے ہیں۔

اسی طرح مفسرین کو اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ذیل میں دی گئی آیۂ شریفہ۔

ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا و یتیما و اسیرا[2]

"اور وہ اس کی محبت میں محتاج و یتیم و اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں"

حضرت علیؑ، ان کی اہلیہ جناب سیدہ اور حسنین علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی[3]۔

مولائے متقیان دنیا میں زہد کرنے اور اس کی نعمتوں اور لذتوں سے پرہیز کرنے کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے ان اولوالعزم نبیوں اور مقرب ترین پیغمبروں کی پیروی کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی رضایت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ایک خطبہ میں آپ فرماتے ہیں کہ'۔

---

[1] سورۂ بقرہ۔ ۲۷۴۔
[2] سورۂ دھر (انسان) ۸۔
[3] اس بات کی تصدیق تفسیر بیضاوی، تفسیر نیشاپوری، تفسیر بغوی، درمنثور اور تفسیر فخر رازی سے ہوتی ہے۔

"میرے لئے رسول اللہ کا قول و عمل پیروی کے لئے کافی ہے اس لئے کہ دنیا کے دامنوں کو ان سے سمیٹ لیا گیا اور دوسروں کے لئے اس کی وسعتیں مہیا کر دی گئیں" [۱]

---

[۱] یہ اور اس کے بعد کی عبارت غلط نقل کی گئی ہے جس کی وجہ سے مصنف نے غلط نتیجہ گیری کی ہے کہ جناب امیر علیہ السلام زہد کے مسئلہ میں انبیاء کی پیروی کرتے تھے۔ اس لئے کہ یہ مضمون نہج البلاغہ (صبحی صالح خطبہ نمبر ۱۹۰) (ترجمہ مفتی جعفر حسین صاحب خطبہ نمبر ۱۵۶) میں اس طرح سے ذکر کیا گیا ہے اور چونکہ زہد سے متعلق ہے اس لئے ذکر کر رہے ہیں'۔
" تمہارے لئے رسول اللہ کا قول و فعل پیروی کے لئے کافی ہے اور ان کی ذات دنیا کے عیب و نقص اور کثرت سے اس کی رسوائیاں اور برائیاں دکھانے کے لئے رہنما ہے۔ اس لئے کہ دنیا کے دامنوں کو ان سے کھینچ لیا گیا اور دوسروں کے لئے اس کی آسائشیں فراہم کر دی گئیں۔ اگر چاہو تو تمہارے لئے دوسرا نمونہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار سے کہا تھا کہ '"پروردگار تو نے جو کچھ نعمت بھی نازل کی ہے میں اس کا نیاز مند ہوں حالانکہ انہوں نے صرف کھانے کی روٹی مانگی تھی اس لئے کہ سبزیوں (ساگ وغیرہ) پر گزارا کرتے کرتے وہ اتنے لاغر و کمزور ہوگئے تھے کہ ان کے شکم کی نازک جلد سے ان سبزیوں کا سبز رنگ جھلکنے لگا تھا اور اگر تیسری مثال چاہو تو صاحب زبور اور اہل جنت کے قاری حضرت داؤد علیہ السلام کو دیکھ لو وہ اپنے ہاتھ سے کھجور کے پتوں کی ٹوکریاں بنتے اور اپنے ہمنشینوں سے پوچھتے کہ ان میں سے کون انہیں بیچے گا۔ پھر ان سے حاصل ہونے والی اجرت سے جو کی روٹی کھاتے۔ اگر تم چاہو گے تو میں تمہیں عیسیٰ بن مریم کے بارے میں بتاؤں گا جو پتھر پر سر رکھتے کھردرا لباس پہنتے بدذائقہ کھانا کھاتے اور لگاتار بھوکے رہتے۔ رات کو چاند ان کا چراغ ہوتا اور سردیوں میں زمین کا مشرق و مغرب ان کا سایہ تھا اور چوپایوں کے لئے اگنے والی گھاس پھوس ان کا پھل اور پھول تھی۔ نہ ان کی کوئی بیوی تھی جو انہیں گرہستی کے جھنجھٹوں میں مبتلا کرتی نہ بچے جو ان کے غم و اندوہ کا سبب بنتے' نہ مال و متاع جو ان کی توجہ کا باعث بنتے اور نہ ہی لالچ و طمع جو انہیں ذلیل و رسوا کرتی۔ ان کی سواری ان کے پاؤں تھے اور ان کے خادم و نوکر ان کے ہاتھ تھے۔
پس تم اپنے سب سے زیادہ پاک و پاکیزہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو نمونہ عمل بناؤ اس لئے کہ ان کی ذات پیروی کرنے والے کے لئے نمونہ کامل ہے اور صبر کرنے والے کے لئے ڈھارس ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بندوں میں سب سے زیادہ وہ لوگ محبوب ہیں جو اپنے نبیؐ کی پیروی کرتے اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔" یہاں تک کہ آپ نے آنحضرتؐ کے طرز زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اسوۂ رسولؐ پر عمل کرنے کے حسنات گنوائے اور پھر فرمایا۔

"اللہ کا ہم پر کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہمیں ایک ایسے قائد و پیشوا کی نعمت عظمیٰ سے نوازا کہ جنکی ہم پیروی کرتے اور قدم بہ قدم ان کے پیچھے چلتے ہیں خدا کی قسم میں نے اپنی اس قمیض پر اتنے پیوند لگائے کہ مزید لگاتے ہوئے شرم آئی یہاں تک کہ کسی نے یہ کہا کہ کیوں نہیں اسے اتار پھینکتے۔ میں نے اسے جواب دیا کہ اے شخص مجھ سے دور ہو جاؤ کیونکہ مشقت اٹھاکر ہی انسان آسائش و راحت کی امید کر سکتا ہے۔

مذکورہ خطبہ سے واضح ہوتا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام دنیا سے زہد و پرہیزگاری اختیار کرنے کے سلسلہ میں صرف جناب ختمی مرتبتؐ کی قدم بہ قدم پیروی کرتے تھے اور اسی کی عام مسلمانوں کو ترغیب دیتے تھے۔

امامؑ اور بیت المال

ابن عبدالبر نے استیعاب میں لکھا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام بیت المال کے اموال کو تقسیم کرنے کے بعد وہاں جھاڑو دلواتے اور اس امید کے ساتھ نماز پڑھتے کہ یہ قیامت کے دن ان کے حق میں گواہی دے گی۔

ایک مرتبہ اصفہان سے مال پہنچا تو آپ نے اسے سات حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک روٹی باقی رہ گئی تھی چنانچہ آپ نے اس کے بھی سات ٹکڑے کئے۔

ابن نعیم حلیۃ الاولیاء میں لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ ابن نباح نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ،

"اے امیرالمومنین بیت المال میں سونا چاندی کے ڈھیر لگ گئے ہیں۔"

آپ نے فرمایا اللہ اکبر! مجھے ضرور لوگوں کو بلوانا چاہئے۔ پھر کیا تھا سارے لوگ جمع ہوگئے اور خلیفۃ المسلمین ان میں اس مال و زر کو تقسیم کرتے جاتے اور فرماتے،

"اے سیم! اے زر! میرے علاوہ کسی اور کو دھوکہ دو۔"

جب کبھی شام ہونے لگتی اور دور دراز کے علاقوں سے مال پہنچتا تو بیت المال کے لوگ آپ سے درخواست کرتے کہ مال کی تقسیم کو کل پر چھوڑ دیں لیکن آپ فرماتے

"اس بات کی کون ضمانت دے گا کہ ہم کل تک زندہ رہیں گے"

بہت سی مستند روایتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ آپ بیت المال کے مسئلہ میں کسی سے نرمی نہ برتتے تھے۔ اس معاملہ میں آپ کی نظر میں اپنے پرائے سب برابر تھے۔

اس عدالت شعاری اور انصاف پسندی کا ایک اور ثبوت آپ کے وہ فرامین ہیں جو آپ نے گورنروں کو بھیجے۔

چنانچہ اسی طرح کے ایک فرمان میں آپ لکھتے ہیں'

"اپنے انصاف کا خیال رکھنے کے بجائے دوسروں کو انصاف دینے کی فکر کرو اور لوگوں کی ضروریات پوری کرنے یا ان کے مسائل حل کرنے میں صبر و حوصلہ سے کام لو۔ یہ نہ ہو کہ مالیات وصول کرنے کی خاطر لوگوں کے لباس و پوشاک یا آمد و رفت کے ذرائع کو نیلام کر دو یا پیسہ کی خاطر کسی پر کوڑے برساؤ"

اسی طرح مالک بن اشتر کو کہ جنہیں آپ نے مصر میں اپنا گورنر مقرر کیا تھا لکھتے ہیں'

"ہرگز خونخوار بھیڑیئے کی طرح لوگوں کے منافع اور ان کے مال و دولت پر نہ جھپٹنا اس لئے کہ لوگوں کی دو صنفیں ہیں۔ ایک تمہارے دینی بھائی ہیں اور دوسرے صرف خلقت میں تم جیسے ہیں (یعنی تم سے صرف جسمی مماثلت رکھتے ہیں) لہٰذا ہمیشہ ان سے اسی طرح عفو و درگزر کرتے رہو جس طرح تم خداوند عالم کی بخشش و رحمت کے امیدوار ہو اور ہاں کبھی کسی کو معاف کرنے کے بعد

پشیمان نہ ہونا اور کسی کو سزا دینے کے بعد فخر نہ کرنا"۔

ان ارشاد و فرامین کے ساتھ ساتھ آپ اپنے تمام گورنروں پر کڑی نظریں رکھتے تھے۔ چنانچہ جب زیاد بن ابیہ نامی گورنر کے بارے میں بہت سی باتیں سننے میں آئیں تو آپ نے سعد نامی شخص کو ایک خط لکھ کر اس کے پاس بھیجا۔ اس خط میں زیاد بن ابیہ کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ بیت المال میں موجود تمام اموال سعد کے حوالہ کردے لیکن اس نے نخوت دکھائی اور پیسہ دینے سے انکار کیا۔ سعد نے پلٹ کر تمام ماجرا سنایا تو آپ نے اسے لکھا۔

"سعد نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے ناحق اسے برا بھلا کہا اور غرور و تکبر کے ساتھ اس سے پیش آئے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے تھے "تکبر و بزرگی صرف ذات باری تعالیٰ کو زیب دیتی ہے اور اس کے علاوہ جو بھی تکبر کرتا ہے وہ خداوند عالم کے غضب میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم انواع و اقسام کے کھانے کھاتے ہو۔ کچھ غلط نہ ہوگا کہ چند روز روزہ رکھو اور اپنے حصہ کا کھانا ضرور تمندوں میں تقسیم کردو۔ کیا یتیم و بے سہارا لوگوں کا مال کھانے اور ناز و نعمت میں ڈوبنے کے بعد بھی ثواب و اجر عظیم کی امید رکھتے ہو میں نے یہ بھی سن رکھا ہے کہ تم تقریریں تو بہت اچھی کرتے ہو لیکن تمہاری چال چلن اور آداب و اطوار درست نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو اپنے لئے گڑھا کھود رہے ہو اور اپنی خوبیوں کو خاک میں ملا رہے ہو۔"

اسی طرح اپنے بھائی عقیل کے بارے میں آپ کا طرز عمل مشہور ہے۔ زندگی کی ضروریات و مشکلات عقیل کو سرزمین حجاز سے اسلامی حکومت کے نئے دارالخلافہ، کوفہ تک لے گئیں کہ بھائی کے پاس جاکر ان سے حقوق میں اضافہ کی درخواست کریں۔ چنانچہ عقیل نے بھائی سے اپنے وظیفہ میں اضافہ کرنے کے لئے کہا اور جناب امیر علیہ السلام نے صاف انکار کردیا۔

مورخین کی ایک جماعت دعوی کرتی ہے کہ عقیل اس کے بعد معاویہ کے پاس چلے گئے اور ان سے اپنی حاجت طلب کی۔ معاویہ اسی گرمجوشی سے ان سے پیش آیا جس طرح سے کہ وہ حضرت علی سے الگ ہونے والوں کے ساتھ

پیش آتا تھا۔ اور ان کی طلب کو پورا کر دیا۔ وہ خیال کرتا تھا کہ اس طرح عقیل کا دل جیت لے گا اور اپنی شان میں ان سے کچھ کہلوائے گا۔ اس غرض سے جب بھری محفل میں اس نے پوچھا کہ وہ اچھا ہے یا ان کے بھائی علی تو ان کے جواب نے اسے تعجب میں ڈال دیا۔

حضرت عقیل نے کہا'۔

"معاویہ تم میری دنیا کے لئے اچھے ہو اور میرے بھائی علی میری آخرت کے لئے"۔

اگرچہ کچھ لوگوں نے اس واقعہ کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھا ہے لیکن کافی دلائل کی بنیاد پر ہم یہ قبول کرنے سے قاصر ہیں کہ حضرت امیر کے جیتے جی عقیل سرزمین شام میں قدم رکھ دیں۔ !

کچھ بعید نہیں کہ کربلا میں عقیل کے خاندان سے چوٹ کھانے کے بعد بنی امیہ نے ان کے خاندان کو مجروح کرنے کے لئے یہ واقعہ جعل کیا ہو۔ البتہ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ جناب امیر علیہ السلام کی شہادت کے بعد یہ واقعہ پیش آیا ہو۔

بہر حال اس میں تو شک نہیں کہ معاویہ کی بذل و بخشش اور مخالفین کو جمع کرنے کی کوششیں ان تلوار و خنجر سے کہیں زیادہ تیز اور موثر تھیں جنہیں وہ جنگوں میں امام کے خلاف استعمال کیا کرتا تھا۔ اس حقیقت کو شیعیان علی نے بھی پالیا تھا لہٰذا بار بار وہ آپ سے درخواست کرتے تھے کہ بیت المال میں نرمی برتیں اور مخالفوں کے منہ بند کرنے اور حمایتی اکٹھے کرنے کے لئے بھی کچھ رقمیں مخصوص کریں۔

علی بن یوسف مدائنی روایت کرتا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام کے اصحاب میں سے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے'

"اے مومنوں کے امیر آپ بیت المال میں موجود مال و زر کو تقسیم کریں اور قریش کو عرب اور عرب کو عجم پر فوقیت دیں۔ اسی طرح ایک حصہ ان

باغیوں اور منافقوں کے لئے بھی معین فرمائیں جن کے بارے میں معاویہ سے مل جانے کا خطرہ ہو۔"۔

مولائے متقیان نے ان لفظوں میں ان لوگوں کا جواب دیا'

"کیا مجھے ظلم و زیادتی کے زور پر کامیابی حاصل کرنے کا مشورہ دیتے ہو خدا کی قسم مجھ سے ہرگز یہ نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ میرا اپنا مال بھی ہوتا تو ان کے درمیان برابر تقسیم کرتا حالانکہ یہ تو لوگوں کا مال ہے"۔

یہ روایت نقل کرنے کے بعد علی بن یوسف مدائنی فضل بن جعد کے یہ تاثرات بھی نقل کرتے ہیں کہ'

یہی مال و دولت اہم ترین سبب بنا کہ لوگ امیرالمومنین سے ٹوٹتے گئے اس لئے کہ پیسہ کے معاملہ میں تو وہ رتی بھر بھی کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور مساوات برقرار رکھتے تھے۔ نہ روساء و امراء کی خاطر و مدارات کرتے اور نہ ہی ان کی دل لگی کے سامان فراہم کرتے۔ اس کے برخلاف چونکہ معاویہ یہ تمام کام بڑی خندہ پیشانی سے انجام دیتا تھا لہٰذا ان لوگوں نے جناب امیرؑ کو چھوڑکر معاویہ سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔

چنانچہ جب جناب امیر علیہ السلام نے مالک اشتر سے لوگوں کی بے رخی و بے وفائی کی شکایت کی تو مالک نے لوگوں کی ذہنیت کا خاکہ یوں کھینچا'۔

"مولا آپ نے لوگوں کو عدالت و انصاف کی زنجیر سے باندھ دیا ہے اور ان کے ہاتھوں میں حق و حقیقت کی ہتھکڑیاں ڈال دی ہیں۔ آپ با اثر لوگوں اور عمائدین شہر کے بجائے بے سہارا اور ستم رسیدہ افراد کا ساتھ دیتے ہیں اور دولتمند طبقے کی بہ نسبت غریبوں کی طرفداری کرتے ہیں۔ آپ کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد اسی عدالت و انصاف کی وجہ سے آپ سے دور ہوگئی ہے۔ پھر جب انہوں نے معاویہ کو ان روساء کے ساتھ مدارات کرتے دیکھا تو ان کے دل دنیا کی طرف مائل ہوگئے اور عام لوگوں کی طرح وہ بھی اپنی دنیا کے لئے سہارے ڈھونڈنے اور ہمدرد و غمگسار تلاش کرنے لگے۔ ہاں اگر اب بھی آپ

خزانوں کے منہ کھول دیں تو وہ آپ کے گرد جمع ہونے لگیں گے، آپ کو اپنے بہترین مشوروں سے نوازیں گے اور آپ پر اپنی محبتیں نچھاور کریں گے"۔

جناب امیر علیہ السلام نے مالک کے جواب میں فرمایا۔

"تم جو یہ کہتے ہو کہ ہم انصاف کے پابند اور سچائی پر اٹک گئے ہیں تو اس کے بارے میں خداوند عالم اپنی کتاب مقدس میں فرماتا ہے"

"من عمل صالحا " فلنفسه ومن اساء فعليها وما ربك بظلام للعبيد "[ا۵]

"جس نے اچھے کام کئے اپنے نفع کے لئے کئے اور جس نے برے کام کئے اپنے لئے برا کیا اور تمہارا پروردگار رتی برابر بھی اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا"۔

میں تو اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی حقوق العباد میں خداوند عالم سے ڈرتا ہوں۔ لہٰذا اگر کسی پر عدالت اتنی ہی ناگوار گزرتی ہے تو وہ کل کا ہوتا آج ہم سے الگ ہوجائے۔ خداوند عالم شاہد ہے کہ وہ ظلم کی وجہ سے ہم سے الگ نہیں ہوا اس لئے کہ عدالت ہمارا شعار ہے ایسا شخص زودگذر اور بے ثبات دنیا سے رشتہ جوڑ رہا ہے اور کل قیامت کے دن اسے واضح کرنا پڑے گا کہ اس نے کیا پایا۔؟ اور جہاں تک بذل و بخشش یا لوگوں کی خرید و فروخت کا تعلق ہے تو ہم کسی کو بھی اس کے حق سے زیادہ نہیں دے سکتے۔

پھر باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے'۔

كم من فئه قليله غلبت فئه كثيره باذن الله [۵۲]

"نہ جانے کتنے چھوٹے گروہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے بڑے گروہوں پر غالب آئے"

[ا۵] سورۂ فصلت - ۴۶-

[۵۲] سورۂ بقرہ ۲۴۹-

اللہ تعالیٰ نے جب اپنے پیارے نبی کو معبوث کیا تھا تو وہ بھی اکیلے تھے لیکن رب العزت نے بہت جلد اس کمی کو پورا کیا' ان کے اصحاب کو ظاہری شکست کے بعد کامیابیوں سے نوازا اور اقبال کی دولت عطا فرمائی[۱]۔

جس دن سے حکومت جناب امیر علیہ السلام کے ہاتھ آئی تھی وہ اسی روش کے ساتھ حکومت کرتے تھے۔ انہیں دیندار ہونے کی بنا پر کسی سے خاص رعایت کرنے یا مسلمانوں کے اموال ہتھیا کر اور ظلم و زیادتی کے بل بوتے پر حمایتی اکٹھا کرنے سے نفرت تھی۔

ابواسحاق ہمدانی روایت کرتا ہے کہ ان کے پاس دو عورتیں آئیں۔ انہوں نے جب برابر سے ان کے درمیان مال تقسیم کیا تو ایک بولی کہ میں عرب ہوں اور یہ عجم ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ'

"اس مسئلہ میں میری نظر میں حضرت اسماعیل کی اولادوں اور حضرت اسحاق کی نسلوں میں کوئی فرق نہیں"

لالچی اور دنیا دار لوگ جب آپ کی اس عدالت شعاری کا اندازہ لگا چکے اور انہوں نے آپ سے یہ بھی سن لیا کہ'

"میں جانتا ہوں کہ کونسی چیز تمہیں ٹھیک کر سکتی ہے لیکن میں نہ اپنے ایمان کا سودا کرکے تمہاری بھلائی چاہتا ہوں اور نہ ہی ظلم کے بدلہ تمہارے لئے فتح و ظفر خرید سکتا ہوں"

تو وہ آپ سے الگ ہوگئے پھر جب انہوں نے معاویہ کو گرمجوشی سے ان کا استقبال کرتے دیکھا جو ان کی تمام خواہشات کو پورا کر دیتا تھا تو ان کے دل دنیا کی طرف مائل ہوگئے اور انہوں نے امام معصوم سے وہ بے رخی دکھائی کہ ان کی زندگی کے آخری ایام حسرت و افسوس اور غم و اندوہ میں گزر گئے اور وہ ایسے لوگوں سے جدائی کی تمنا کرنے لگے۔

---

[۱] شرح نہج ج ۱ صفحہ ۱۸۰۔

جناب امیر علیہ السلام بخوبی جانتے تھے کہ ایک صحیح نظام صرف اور صرف عدالت و انصاف کی بنیاد پر استوار ہو سکتا ہے۔ اور عدالت اس وقت معاشرے میں تحقق پا سکتی ہے جبکہ معاشرے سے طبقاتی کشمکش اور امیر غریب کے فرق کو مٹایا جائے اور حالات و شرائط کی مطابقت سے محروم طبقے کے حق میں آگے بڑھا جائے۔ آپ بخوبی جانتے تھے کہ اس سے بہت سی مشکلات وجود میں آئیں گی اور بہت سے مسائل جنم لیں گے۔ مخالفین سر اٹھائیں گے اور معاویہ جیسے دشمن مزید مستحکم ہو جائیں گے لیکن یہ چیزیں آپ کو آپ کے اٹل ارادے سے باز نہ رکھ سکتی تھیں لہٰذا خلافت کے پہلے دن آپ نے برابر سے تمام لوگوں کے درمیان اموال تقسیم کئے حالانکہ گذشتہ خلافتوں میں ان اموال کی تقسیم میں تفریق اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ حضرت ابوبکر و عمر کے دور میں متوسط طبقے کو پانچ سے بارہ ہزار اور فقراء کو دو سے چار ہزار تک کے حقوق دیئے جاتے تھے۔ اور پھر حضرت عثمان کے دور میں تو اس تفریق کی کوئی حد و انتہا نہ رہی۔ جاہلیت کی فرسودہ روایات اور وہی طرز تفکر زندہ ہو گیا جس کی وجہ سے ابو سفیان جیسوں نے سالہا سال پیغمبر اکرمؐ سے سخت جنگیں لڑیں تھیں۔ اقرباء پروری اور صلہ رحم نے تو اتنا سر اٹھایا کہ تمام اسلامی ریاستیں خلیفہ کے ان رشتہ داروں میں تقسیم ہو گئیں اور وہ لوگ مسلمانوں کے مقدر پر حاکم ہو گئے جو کچھ عرصہ قبل مسلمانوں سے لڑی جانے والی جنگوں کی قیادت سنبھالتے تھے۔ جناب امیر علیہ السلام کے برسراقتدار آنے کے بعد بھی حالات اور اس وقت کی خاص شرائط نے انہیں اس بات کی اجازت نہ دی کہ گذشتہ خلافتوں کے غلط اثرات کو مٹائیں اور ان اموال کو واپس لے سکیں جو ان ادوار کے وزراء نے ہتھیا لئے تھے خاص طور پر حضرت عثمان کے گورنر جو بیت المال کو ذاتی ملکیت سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو حضرت عثمان کا خزانچی گردانتے تھے۔ حالانکہ جناب امیر علیہ السلام کی نظر میں یہ اموال تمام مسلمانوں سے متعلق تھے۔ آپ یتیموں اور غریبوں کی طرف اسی پیار و محبت سے دیکھتے تھے جیسا کہ وہ آپ کے عیالدار اور آپ کے خاندان کے فرد ہوں۔ خود کو نظر انداز کر کے ان پر خرچ کرتے اور اپنے کھانے، پینے، پہننے اور رہن سہن میں ان کی سطح پر رہتے اور فرماتے "حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی رعایا کے سب سے زیادہ کمزور و مفلوک

الحال لوگوں کا طرز زندگی اپنائیں تاکہ محروم لوگ ان کی پیروی کریں اور دولتمند اپنی دولت پر گھمنڈ نہ کریں" (بلکہ شرمائیں !!)۔

اگر جناب امیر علیہ السلام جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد بلافاصلہ خلافت سنبھال لیتے اور اپنی زندگی کے اختتام تک اسے اپنے ہاتھوں میں رکھتے اور پھر اسے باصلاحیت اور لائق ہاتھوں میں دیدیتے جن میں آپ کی تمام صفات موجود ہوتیں جیسا کہ آئمہ طاہرین میں موجود تھیں تو اسلام ایک صحیح شکل میں دنیا کے سامنے نمودار ہوتا اور مختلف میدانوں میں زندگی، علم اور عقل کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس کے باوجود کہ ان کی حکومت ایک مختصر عرصہ کے لئے تھی اور ایسے ادوار کے بعد واقع ہوئی تھی جن میں طبقاتی کشمکش اور غریبوں کا استحصال رائج تھا اور حکومت کے ذرائع خلیفہ اور ان کے اعوان و انصار سے مخصوص تھے۔ اس کے علاوہ مختلف جنگوں میں آپ کا سامنا انہیں لوگوں سے ہوتا جو گذشتہ خلافتوں میں خاص مراعات کے عادی ہوچکے تھے۔ اسی طرح آپ کے بعد آنے والی مشرق و مغرب کی اسلامی ریاستوں پر حاکم شخص کو امیرالمومنین کے نام سے تو یاد کیا جاتا تھا اور بظاہر وہ اسلام کے نام پر حکومت کرتا تھا لیکن درپردہ انواع و اقسام کے ظلم کئے جاتے اور تمام قدریں پامال ہوتی تھیں اور مسلمانوں کے اموال اور ان کے مقدر سے خوب کھیل کھیلا جاتا تھا۔ عباسی و اموی دور کے ہر خلیفہ اور اندلس و مغربی عرب پر حاکم ہر امیر کے پاس ہزاروں رقاصائیں، کنیزیں اور سینکڑوں غلام اور خدمتگار ہوا کرتے تھے۔ اور یہ لوگ طرح طرح کے عیش و عشرت کے سامان اور لہو و لعب کی چیزوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ انہوں نے جزیرۃ العرب اور اس سے باہر کی ریاستوں میں وہ خباثتیں کیں کہ تاریخ کے ورق ان کی بداعمالیوں سے سیاہ ہوگئے اور مسلمان پھر بھی انہیں امیرالمومنین کے نام سے یاد کرتے ہیں حالانکہ یہ لوگ اسلام کے وجود پر ایک سیاہ دھبہ تھے۔ اس سب کے باوجود بھی کہ جناب امیر علیہ السلام کا دور حکومت ان مشکلات اور سابق و لاحق آثار کا شکار رہا اور ان حالات نے انہیں اجازت نہ دی کہ معاشرے کی ٹھوس اصلاح کرسکیں اور اسلامی حکومت کو اتنا استحکام بخش سکیں جو اسلام چاہتا ہے لیکن پھر

بھی آپ کا یہ مختصر دور حکومت، اسلام کی سہولت و نرمی اور آسودگی و خوشحالی پر بڑے واضح ثبوت فراہم کرگیا۔ اور اسی طرح اس عدالتی نظام پر بھی جو انسان کی مشکلات کو حل کرتا ہے، اسے زندگی کی ضروریات فراہم کرتا ہے اور ہر شخص کو شرافت و آزادی سے زندگی گزارنے کا موقعہ دیتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جناب امیر علیہ السلام کی زندگی اور آپ کی سیرت طیبہ کو ایک کتاب میں سمویا نہیں جاسکتا حالانکہ مختلف مکاتب فکر کے دانشوروں اور مفکروں نے آپ پر قلم اٹھایا اور سینکڑوں کتابیں تصنیف کیں لیکن سب ہی کو یہ اعتراف رہا کہ،۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مولائے متقیان اور اسلام کے مشترکہ دشمنوں نے چاہا کہ ان کی کعبہ سے لے کر مسجد کوفہ تک کی مقدس اور طولانی زندگی میں کوئی نقص نکال لیں لیکن جب وہ عاجز آگئے تو ناچار بدزبانی و بدخلقی پر اتر آئے۔ نہ جانے کتنے زرخرید اور بدباطن خطیب انہیں منبروں سے ناسزا کہنے لگے لیکن وہ خود بھی جانتے تھے کہ اس طرح مولا کی شان میں کمی نہیں لاسکتے۔ اسی طرح بہت سوں نے ان کی سیاست پر کمزوری کے دھبے لگانے کی کوشش کی اس لئے کہ وہ معاویہ کی طرح مکر و فریب نہ کرتے تھے اور نہ ہی بیت المال کے پیسوں کو انسان اور ضمیروں کی خرید و فروخت میں خرچ کرتے تھے۔

جیسا کہ ہم پہلے ہی ذکر کرچکے ہیں کہ جناب امیر علیہ السلام کے اصلاحی پروگرام حکومت کے تمام محکموں اور اداروں پر محیط تھے تاکہ اس عدالت کو معاشرے میں نافذ کرسکیں جو ہر انسان کو اس کا حق فراہم کرتی ہے۔ اپنے گورنروں اور ماتحتوں پر کڑی نظریں رکھنے کے ساتھ آپ قاضیوں کی دست گیری بھی کرتے تھے تاکہ گرہستی کی مشکلات انہیں حق و عدالت کو ترک کرنے پر مجبور نہ کردیں۔ اسی طرح آپ کسانوں اور کاریگروں کی معاونت بھی کرتے تھے اور پیداوار کی افزائش پر زور دیتے تاکہ حکومت بھی تمام ٹیکس اور مالیات وصول کرسکے اور لوگ بھی اپنی زندگی کے سامان اور ضروریات کی چیزیں

حاصل کر سکیں۔ ان باتوں کی تاکید آپ کے ان خطوط و مراسلات سے ہوتی ہے جو آپ نے اپنے گورنروں کو روانہ کئے خصوصاً مالک بن اشتر کو دیئے گئے فرامین۔ یہ ارشادات انہیں اس وقت دیئے گئے جب مصر میں آپ کے گورنر محمد بن ابی بکر کو ابن عاص نے شہید کر دیا تھا اور آپ نے مالک کو مصر میں اپنا گورنر معین کیا تھا۔

حقائق و قوانین کے اس رہنما دستور میں آپ گورنروں کے انتخاب کے بارے میں فرماتے ہیں'

ان میں سے ایسے باحیاء اور تجربہ کار لوگوں کو منتخب کرو جو شریف و نجیب اور اسلام میں سابقہ رکھنے والوں خاندانوں سے ہوں اس لئے کہ شرف و عزت اور اخلاق و کردار میں یہی لوگ بہتر ہوں گے۔ ان کے ہاتھوں نعمات کا ضیاع کم ہوگا اور امور کے عواقب اور نتائج پر ان کی نگاہیں زیادہ گہری ہوں گی پھر اپنے ماتحتوں اور معاونوں کے امور پر غور کرو اور امتحان لینے اور آزمانے کے بعد انہیں مقام و منصب دو نہ کہ بیجا طرفداری یا ذاتی پسند کے باعث۔ اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں ظلم اور خیانت سے ہیں۔ پھر انہیں منتخب کرلینے کے بعد سچے اور دیانتدار لوگوں کو ان کے کاموں کی نظارت اور ان کے اعمال کی مخبری کے لئے معین کرو۔ تمہارا پس پردہ رہ کر ان کے کاموں پر نظر رکھنا اس بات کا سبب بنے گا کہ وہ لوگوں کے ساتھ پیار و محبت اور امانتداری سے برتاؤ کرتے رہیں لہذا اگر ان میں سے کوئی بھی خیانت کی طرف ہاتھ بڑھائے اور تمہارے مخبر اس واقعہ کو بالاتفاق بیان کریں تو شہادت کے لئے اتنا ہی کافی سمجھو سب سے پہلے اسے اس جرم کی سزا دو پھر ذلیل و رسوا کرو اور پھر جرم و بددیانتی کا طوق اس کے گلے میں ڈال دو۔

اسی دستور میں عدلیہ کے سربراہوں کے انتخاب کے بارے میں آپ فرماتے ہیں'

پھر لوگوں کے درمیان فیصلے اور قضاوت کرانے کے لئے معاشرے کے بہترین افراد کا انتخاب کرو جو مسائل کی پیچیدگیوں سے گھبراتے اور پریشان نہ ہوتے

ہوں اور جھگڑالو لوگوں کے رویے سے بد خلق نہ بن جاتے ہوں۔ وہ اپنے غلط نقطہ نظر پر نہیں اڑتے اور حق کو پہچان لینے کے بعد اس کی طرف پلٹنے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔ ان کا نفس لالچ، طمع کی طرف مائل نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ چھان بین کے بغیر سرسری طور پر معاملات کو سمجھنے پر اکتفاء کرتے ہوں۔ وہ شکوک و شبہات میں قدم روک لیتے ہیں اور دلیل و حجت کو استعمال کرنا جانتے ہیں۔ فریقین کی بحثابحثی سے اکتاتے نہیں اور معاملات کی تحقیق میں حوصلہ نہیں ہارتے۔ ان قاضیوں کے برخلاف جو لوگوں کے اکسانے یا زیادہ تعریف کرنے سے جانبداری سے کام لینے لگتے ہیں، یہ لوگ حقیقت کے واضح ہوجانے کے بعد بے دھڑک فیصلے کرتے ہیں۔ ان کے تقرر کے بعد تم خود ان کے فیصلوں کی نگرانی کرو اور ان پر اتنی بذل و بخشش کرو کہ نہ ان کے پاس پیش کرنے کے لئے کوئی عذر رہے اور نہ یہ لوگوں کے محتاج رہیں۔ اپنے ہاں انہیں اتنا مرتبہ دیدو کہ تمہارے خواص میں سے بھی کوئی اس کی ہوس نہ کرسکے تاکہ تمہارے اس التفات کی وجہ سے وہ لوگوں کی سازشوں سے محفوظ رہیں۔ ان معاملات میں انتہائی بالغ نظری سے کام لو اس لئے کہ یہ دین بدکرداروں کے ہاتھوں اسیر رہ چکا ہے جنہوں نے اسے دنیا طلبی کا ایک ذریعہ اور اپنی خواہشات کی برآوری کا وسیلہ بنالیا تھا۔

اسی طرح ارکان حکومت کے انتخاب کے بارے میں فرماتے ہیں،

تمہارے حق میں وہ لوگ بدترین وزیر ثابت ہوں گے جو تم سے پہلے شرپسندوں کے باقیات میں سے ہوں اور ان کے گناہوں میں شریک رہ چکے ہوں۔ انہیں تمہارے خواص میں سے نہ ہونا چاہئے اس لئے کہ یہ لوگ ظلم کا دست بازو اور ظالموں کے پٹھو ہیں۔ کبھی بھی اپنی ذاتی رائے اور فردی عقل و فراست اور خوش خیالی کی بنیاد پر انہیں منتخب نہ کرنا اس لئے کہ گورنروں کی عقل و دانش کے مطابق لوگ اپنی اخلاقی بناوٹ اور حسن کارکردگی سے پہچانے جاتے ہیں حالانکہ دیانتداری اور بھلائی نام کی چیز بھی ان میں نہیں پائی جاتی۔ البتہ تم ان کے بارے میں اس طرح اندازہ لگا سکتے ہو کہ انہوں نے تم سے پہلے اپنے زمانے میں مومنوں اور نیک بندوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا۔ پھر

تم ہر محکمہ کی قیادت و سرپرستی ایک ایسے شخص کے سپرد کردو جسے نہ کوئی بااثر شخص اور نہ ہی بہت سارے لوگ مل کر ہلا سکیں۔ البتہ خود اس پر نظر رکھو اگر کوئی نقص یا عیب دیکھو تو فوراً" اس کی پکڑ کرو۔

اسی طرح مزدوروں اور کسان طبقے کے بارے میں فرماتے ہیں'۔

"ٹیکس کی وصولیابی کا نظام اس طرح رکھو جو ٹیکس ادا کرنے والوں کے مفاد میں ہو۔ اس لئے کہ انہیں لوگوں کی بھلائی میں اوروں کی بھلائی ہے بلکہ اوروں کی بھلائی صرف ان کے ذریعہ ممکن ہے اس لئے کہ ملک کے تمام لوگ ٹیکس اور اس کے ادا کرنے والوں کے سہارے جیتے ہیں۔ ٹیکس کی وصولیابی سے زیادہ تمہاری توجہ زمین کی آبادی و عمرانی پر ہونی چاہئے اس لئے کہ مالیات اس وقت وصول کی جاسکتی ہے جب فصل اچھی ہو اور اگر کوئی زمین کو آباد کئے بغیر ٹیکس وصول کرتا ہے تو وہ شہروں کو ویران اور لوگوں کو ہلاک کرتا ہے اور زیادہ عرصہ بر سراقتدار نہیں رہتا اگر یہ لوگ تم سے ٹیکس کے سنگین ہونے' یا مختلف چیزوں کے ذریعہ فصلوں کو نقصان پہنچنے یا آبپاشی میں کمی یا قحط کا گلہ کریں تو تم اس حد تک ٹیکس معاف کردو جس سے ان کے مسائل حل ہوسکیں۔ اس قسم کی رعایت تم پر گراں نہیں گزرنی چاہئے اس لئے کہ یہ وہ ذخیرہ ہے جسے یہ لوگ تمہارے شہر کو آباد کرکے اور تمہاری حکومت کو زینت بخش کے تمہیں واپس کردیں گے۔ البتہ اس شرط کے ساتھ کہ تم ان کی سچی تعریفیں حاصل کرکے اور ان کے درمیان عدالت سے رفتار کرکے اپنی بڑائی اور بزرگی کا پاس رکھ سکو۔ اس وقت تمہارا اعتماد اس انسانی طاقت پر ہوگا جسے تم گنجائشیں دے چکے ہو اور جس پر عدالت و انصاف سے رفتار کرکے اور نرمی سے پیش آکر بھروسہ کرسکتے ہو۔ اس لئے کہ کبھی کبھار ایسے مسائل پیش آتے ہیں کہ اگر تم ان لوگوں کے خلاف کوئی اقدام کر بیٹھو تو اپنی شرافت نفس سے یہ لوگ اسے برداشت کرلیں گے اس لئے کہ اگر فصل اچھی ہوئی ہو اور زمین سرسبز و شاداب ہو تو جو بوجھ بھی تم ان پر ڈالو گے وہ اسے اٹھالیں گے اور زمین کی خرابی اس کے اہل پر نقصان وارد کرنے سے وجود میں آتی ہے"۔

اسی طرح آپ اہل تجارت و حرفت اور پیشہ ور لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ'

"تاجروں' اہل صنعت و حرفت اور کاریگر و مزدور طبقے کے ساتھ خود بھی نیکی کرو اور انہیں بھی نیکی کرنے کا حکم دو۔ چاہے وہ ایک جگہ رہ کر کاروبار کرتے ہوں یا ایک سے دوسری جگہ جاکر یا جسمانی مشقت و مزدوری کرتے ہوں۔ یہی لوگ پیداوار کا سرچشمہ اور معاشرے کی ضروریات فراہم کرنے کا ذریعہ ہیں۔ پہاڑوں' ریگستانوں' دور افتادہ مقامات اور سمندروں سے یہی تمام چیزیں درآمد کرتے اور ڈھونڈ نکالتے ہیں کہ جہاں عام انسان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ امن پسند اور صلح جو ہوتے ہیں البتہ جہاں کہیں بھی رہیں تم ان سے پوری طرح باخبر رہنا۔ یاد رکھو! ان میں سے کچھ لوگ انتہائی تنگ نظر اور کنجوس ہوتے ہیں چنانچہ نفع کمانے کے لئے مال روکے رہتے ہیں اور نرخ بڑھادیتے ہیں اور یہ چیز عوام کے لئے نقصان دہ ہوتی ہے اور حکام کی بدنامی کا سبب بنتی ہے لہٰذا احتکار و ذخیرہ اندوزی کی ممانعت کرنا اس لئے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے ممنوع قرار دیا تھا۔ اور اس بات کا خیال رکھنا کہ خرید و فروخت صحیح پیمانہ (وزن) اور مناسب داموں پر ہونی چاہئے تاکہ نہ خریدار کو خسارہ ہو اور نہ دکاندار کو نقصان پہنچے۔

اسی طرح امام علیہ السلام نے ان غریبوں' یتیموں' بیماروں اور بزرگ و سالخوردہ لوگوں کے لئے بھی بھلائی کی تاکید کی جو کام کرنے سے معذور ہیں اور بیت المال سے ان کیلئے کچھ رقمیں معین کرنے کی سفارش فرمائی"[۹۵]۔

خلاصہ کلام یہ کہ مولائے متقیان کے ارشادات و فرامین ہوں' ان کی سیرت طیبہ ہو یا وہ فضائل ہوں جنہیں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بیان کیا یا وہ آیات جو ان کی شان میں نازل ہوئیں۔ ان سب کو سمیٹنا کسی کی دسترس میں نہیں۔ ان کے بارے میں شیعوں اور اہلسنت نے بے شمار کتابیں

---

۹۵ نہج البلاغہ عہدنامہ نمبر ۵۳۔

لکھیں یہاں تک کہ ان کے لئے سورج پلٹ جانے کی حدیث کو اہلسنت کے زیادہ تر محدث و مورخ نقل کرتے ہیں اور بہت سے ان احادیث کی تصدیق و توثیق کرتے ہیں جیسا کہ صواعق بن حجر اور دوسری کتابوں میں نقل کیا گیا ہے[۱] ۔

علامہ امینی کتاب الغدیر میں یہ دعوی کرتے ہیں کہ سورج پلٹنے کی حدیث کو صحیح حافظوں کی ایک جماعت نے اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے اور ناقدان فن و اہل نظر نے ان روایات کو صحیح قرار دیا ہے۔ اور کچھ لوگوں نے تو بڑی شد و مد کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ وہ ایسے علماء سے ناواقف ہیں جو مذکورہ حدیث کے حوالوں اور اس کی سندوں میں شک کریں۔ یہ چار لوگ ہیں۔ ابن حزم' ابن جوزی' ابن کثیر' اور ابن تیمیہ۔

وہ مزید فرماتے ہیں کہ دوسرے علماء پر جب اس واقعہ کا انکار کرنا سخت ہوگیا تو انہوں نے اس ضمن میں مستقل کتابیں یا کتابچے تصنیف کئے۔ اس زمرے میں مندرجہ ذیل لوگ آجاتے ہیں۔

حاکم بن حداد حسکانی۔

محمد بن حسین ازدی۔

حسین بن علی بصری۔

اخطب بن خوارزم۔

ابو موید موفق بن احمد۔

محمد بن اسعد بن علی النقیب۔

محمد بن یوسف دمشقی صالحی (مزیل اللبس عن حدیث رد الشمس)[۲] ۔

---

[۱] رجوع کریں فضائل الخمسہ من الصحاح الستہ ' جلد نمبر ۱ صفحہ ۲۷۴ - ۲۷۳ ' دلائل الصدق' (مظفری) وغیرہ وغیرہ۔
[۲] اس کتابچہ کا عنوان جو انہوں نے تحریر کیا۔

جلال الدین سیوطی (مزیل اللبس عن حدیث رد الشمس)۔

جو چیز ہم عرض کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ شیعہ و سنی محدثوں نے جناب امیر علیہ السلام کے بارے میں بہت سے ایسے فضائل نقل کئے جنہیں عقل سمجھنے سے قاصر ہے جیسا کہ سورج کا پلٹ جانا وغیرہ وغیرہ اور ہماری نظر میں یہ چیزیں مولائے متقیان کے لئے ناممکن نہ تھیں اس لئے کہ اگر قادر مطلق چاہے تو اپنے بندوں کو بہت کچھ دے سکتا ہے لیکن ان کی مقدس زندگی اور ان کی پاک سیرت ہمیں ان تمام احادیث و واقعات سے بے نیاز کر دیتی ہے جو ان کتابوں میں کثرت سے نقل کئے گئے ہیں اور ایسے موقعہ پر حسن بصری[1] کا وہ مقولہ یاد آجاتا ہے جو انہوں نے اس شخص کے جواب میں کہا تھا جس نے ان سے پوچھا تھا کہ لوگوں نے ان کے بارے میں کیا کچھ نقل کیا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ '

"میں اس شخص کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ جس کے فضائل کو اس کے دوست اور چاہنے والے ڈر کے مارے چھپائیں اور جس کے دشمن بغض اور کینہ کی خاطر اس کی خوبیوں کو آشکار نہ ہونے دیں پھر بھی ان کے اتنے فضائل و کمالات سامنے آئیں کہ پورا عالم مہک اٹھے۔"

---

[1] حسن بصری ان مشہور تابعین اور ثقہ محدثوں میں سے ہیں جنہوں نے ابن عباس اور حضرت عثمان کو دیکھا۔ وہ شریعت اور فقہ کے احکام اور احادیث کی شناخت میں نظیر نہ رکھتے تھے۔ معتزلہ کے بانی واصل بن عطاء نے انہیں کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ (منجد الاعلام)۔

امامؑ اور خلفاء

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات کے بعد کے تین یا چھ مہینے جناب امیر علیہ السلام اور ان کے اصحاب کے اس مضبوط و مستحکم موقف کی ترجمانی کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت ابوبکر کی خلافت کے بارے میں اپنایا تھا۔ اس عرصہ میں وصی رسولؐ مسلسل اپنے حق کا مطالبہ کرتے رہے۔ آپ کے منہ توڑ جوابوں نے ان توجیہوں کو نقش برآب کر دیا جو لوگوں کو ساتھ ملانے اور انصار کو قائل کرنے کے لئے تراشی گئی تھیں۔ اور پھر دوسرے مستحکم دلائل و براہین کی کثرت نے آپ کی حقانیت کو ثابت کر دیا تھا۔ آپ کی حسن تدبیر سے کچھ مہاجر و انصار آپ کے ساتھ ہو گئے تھے اور اس نام نہاد خلافت سے انہوں نے ٹکرانے کی حامی بھر لی تھی۔

لیکن اندرونی سازشوں اور پلٹتے ہوئے کفر کو دیکھ کر آپ کے نقطہ نظر میں نرمی آگئی۔ اس لئے کہ اگر آپ یہاں اپنے حق خلافت سے درگذر نہ فرماتے تو عقیدہ رسالت خطرے میں پڑ جاتا جبکہ آپ کی دلی خواہش تھی کہ عقیدہ رسالت صدا لوگوں کے دلوں میں باقی رہے۔ اور صبح شام توحید کے نغمے

گنگنائے جاتے رہیں اور بہرحال آپ خلافت کا مطالبہ بھی اس کلمہ توحید کی سر بلندی کے لئے کر رہے تھے۔ چنانچہ اس دن سے۔ آپ نے اس نوخیز خلافت سے کوئی تعرض نہ کیا بلکہ وقت پڑنے پر آپ مسلمانوں کے درمیان قضاوت کرتے اور انہیں قرآن و سنت اور علم و حکمت کی تعلیم دیتے۔

یوں تو آپ سقیفہ بنی ساعدہ میں کئے جانے والے اقدامات اور ان لوگوں کے آپس کے فیصلوں سے باخبر تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت ابوبکر حضرت عمر کو خلافت کے لئے منتخب کریں گے اور ہر طرح سے اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھائیں گے۔ اس کے باوجود کہ اکثر و بیشتر آپ انہیں لوگوں کے درمیان یہ اعتراف کرتا دیکھتے'

"اقیلونی فلست بخیر کم"

"مجھے رہا کر دو اس لئے کہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں"

اور دوسری روایت کے مطابق وہ کہتے ہیں'

"اقیلونی فلست بخیر کم و علی فیکم"

"مجھے چھوڑ دو میں تم میں سب سے بہتر نہیں اور پھر علیؑ تمہارے درمیان موجود ہیں"

لیکن ان تمام چیزوں سے واقف ہونے کے باوجود بھی آپ اس دن خاموش رہے جب انہوں نے حضرت عمر کو خلیفہ بنانا چاہا۔ گویا کچھ عرصہ پیشتر ہی ان لوگوں نے یہ کہہ کر آپ کا حق چھینا تھا کہ خلافت مسلمانوں کی ہے اور صرف انہیں اس کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن آج ان تمام باتوں کو نظرانداز کر کے وہ باآسانی لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ'

"اے لوگو خدا کی قسم میں نے اس مسئلہ میں سوچ بچار کرنے میں کوتاہی نہیں کی اور نہ ہی اپنے عزیز و اقارب کو تمہارے سروں پر مسلط کیا ہے۔ بلکہ میں عمر بن خطاب کو تمہارا خلیفہ بناتا ہوں تم ان کا کہا مانو اور ان کی اطاعت

کرو"

دوسری روایت میں ہے کہ یہ احساس کر لینے کے بعد کہ ان کا آخری وقت آ پہنچا ہے، انہوں نے لوگوں کو جمع کر کے ان سے خطاب کیا لیکن خلافت کے بارے میں ان پر اپنی رائے مخفی رکھی۔ لوگوں نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ حضرت عمر ہی کو خلیفہ بنائیں گے۔ بہرحال انہوں نے حضرت عمر کو ایک رقعہ لکھ دیا اور اسے لوگوں کے پاس لے جانے کے لئے کہا۔ وہ اسے لوگوں کے پاس لے گئے۔ کسی نے ان سے سوال کیا کہ اس میں کیا ہے تو انہوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا جو کچھ بھی ہے سب سے پہلے وہ اس کی پابندی اور اطاعت کریں گے۔ اس شخص نے کہا اسے معلوم ہے اس میں کیا ہے،

"پہلے سال ان کی حکومت تھی اور اس سال تمہاری حکومت ہے"

بہرحال حضرت عمر نے اسے لوگوں کے سامنے پڑھا اور لوگوں نے اسے قبول کیا۔

بہرصورت حضرت عمر کی خلافت کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان کافی ردوکد اور جرح وبحث ہوئی۔ زیادہ تر لوگ حضرت ابوبکر کے اس فیصلے پر تاسف کا اظہار کرنے لگے اور ان کے اس اقدام کو آپس کی ملی بھگت سے تعبیر کرنے لگے۔ کچھ لوگوں نے تو حضرت عمر کی سخت مزاجی اور تلخ طبعی کے سبب حضرت ابوبکر کے خلاف باتیں شروع کر دیں۔ ان میں طلحہ پیش پیش تھے۔ ان کی نظریں خلافت پر جمی ہوئی تھیں اور حضرت ابوبکر نے انہیں بے عزت کر کے گھر سے نکلوایا تھا اور مایوس کیا تھا۔

جہاں تک جناب امیر علیہ السلام کا تعلق ہے تو جیسا کہ ہم ان کے بارے میں ذکر کر چکے ہیں کہ ان تمام چیزوں سے آگاہ ہونے کے باوجود انہوں نے ان لوگوں کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ اس لئے کہ آپ جانتے تھے کہ ایسا کرنے سے صرف مشکلات میں اضافہ ہو گا۔ جب آپ کل خاموش رہے تھے تو آج آپ کو ضرور خاموش رہنا چاہیے تھا اس لئے کہ اب یہ لوگ مزید مضبوط و مستحکم ہو چکے تھے۔ لہٰذا تقریباً" بیس سال سے زیادہ کا عرصہ بیت جانے کے

بعد جب آپ کو خلافت ملی اور چاروں طرف سے اس خلافت کو مشکلات نے گھیر لیا تو آپ نے اپنے مشہور و معروف خطبہ' خطبہ شقشقیہ میں فرمایا'

"خدا کی قسم ابو قحافہ کے بیٹے نے خلافت کو قمیص کی طرح سے پہن لیا حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ خلافت کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو چکی کو بیچ میں لگی ہوئی کیل یا اپنے محور سے ہوتی ہے۔ مجھ سے پانی سرازیر ہوتے ہیں اور پرندے میرے قریب پر نہیں مار سکتے[1] ۔پس میں نے خلافت کے آگے پردہ ڈال دیا' اس سے کنارہ کشی اختیار کی اور یہ سوچنا شروع کیا کہ کٹے ہوئے ہاتھوں سے حملہ کروں یا ان بھیانک اندھیروں پر صبر کروں جن میں سن رسیدہ لوگ ضعیف' بچے بوڑھے اور مومنین جدوجہد کرتے ہوئے اپنے پروردگار کو پیارے ہو جاتے ہیں! ایسے میں مجھے صبر ہی عقل کے قرین دکھائی دیا۔ پس میں نے صبر کیا جبکہ میری آنکھ میں پھانسیں چبھی ہوئی تھیں اور حلق میں کانٹے اٹکے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی میراث لٹتے ہوئے دیکھی یہاں تک کہ پہلا اپنے انجام کو پہنچا اور اسے خطاب کے بیٹے کی گود میں ڈال گیا۔ حیرت ہے کہ زندگی میں تو وہ اس سے سبکدوش ہونے کی باتیں کرتا تھا اور مرنے کے بعد اسے دوسرے کے لئے استوار کر گیا۔ دراصل ان دونوں نے خلافت کے تھنوں کو مل کر آپس میں بانٹ لیا تھا۔ بہرحال اس نے خلافت کو ایسی سخت جگہ پہنچا دیا جہاں کی تکلیف بہت زیادہ ہے اور جسے چھونے سے بھی اس جگہ کے کھردرے پن اور درشتی کا احساس ہوتا ہے"[2]

استاد عبدالفتاح عبدالمقصود اپنی مشہور عالم کتاب "امام علی بن ابی طالبؑ" میں حضرت ابوبکر کے اس جدید طرز انتخاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ' "سزاوار تھا کہ اس موقعہ پر حضرت علیؑ کا دل غم و غصہ سے بھر جاتا اس لئے

---

[1] شاید اس جملے سے امامؑ فرمانا چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے علم و فضل اور حکمت و دانش سے مستفید ہوتے ہیں لیکن کوئی بھی ان کے مقام و منزلت کے دور دور بھی نہیں پھٹک سکتا۔ اس جملہ میں آپ نے اپنے کو ایک بلند پہاڑ و کوہسار سے تشبیہ دی ہے -

[2] خطبہ شقشقیہ (۳)۔

کہ یہ ستم بالائے ستم تھا لیکن انہوں نے کمال بردباری سے کام لیا اور جب اصحاب رسولؐ ہی مل کر آنحضورؐ کی خلافت کو ان کی آل سے چھیننے پر متفق ہو گئے تھے تو انہیں لوگوں کے ساتھ رہنے میں کیا نقصان تھا۔ تعجب قریش پر نہیں بلکہ اس کہن سال بزرگ پر تھا جو اپنے اور علیؑ کے باہمی اختلافات حل ہو جانے کے بعد بھی انہیں نظر انداز کر دے حالانکہ وہ بخوبی آپ کے مقام کو پہچانتا تھا۔ جس دن سے دین کی ابتداء ہوئی وہ اس دن سے آپ کی قربانیوں اور فداکاریوں کو دیکھ رہے تھے اور پھر جب سے اسلامی حکومت کی داغ بیل پڑی وہ معاشرے میں آپ کے علم و حکمت کے آثار مشاہدہ کر رہے تھے۔''[1]

وہ مزید لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے جس طریقہ کار سے حضرت عمر کو انتخاب کیا یہ وہی روش تھی جسے کل یہ لوگ نا درست اور غلط کہتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی چیز کے بارے میں فیصلہ کر چکے تھے۔ اور اہل بیت رسولؐ سے چھپ کر اس پر عملدرآمد کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ یہ وہی غلطی تھی کہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد حضرت عمر بھی اس کے مرتکب ہو چکے تھے۔

انہوں نے اس وقت جناب امیر علیہ السلام کو نظرانداز کیا جب انہیں سب سے زیادہ مورد توجہ قرار دینا چاہیے تھا۔ اسی طرح انہوں نے مشورہ بھی دوسرے اصحاب سے کیا اور اگر چہ یہ مشورے کار ساز نہ تھے اور انہیں ان کے گزشتہ فیصلے سے باز نہ رکھ سکتے تھے لیکن کیا عربوں میں رسول اللہؐ کے چچازاد بھائی سے بھی کوئی افضل یا ان کے برابر تھا کہ انہیں چھوڑ کر وہ اس سے مشورہ لیتے! بے شک حضرت ابوبکر نے اپنے بعد حضرت عمر کو خلافت دینے کا عہد کر لیا تھا۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہ فیصلہ بہت پہلے کیا جا چکا تھا۔ اور اسی وقت سے تمام اصحاب میں حضرت عثمان ان کی ولیعہدی کے لئے زیادہ موزوں دکھائی دیتے تھے۔

---

[1] امام علی بن ابی طالبؑ (فارسی ترجمہ۔ محمود طالقانی) مطبوعہ تہران جلد نمبر ۱ صفحہ نمبر ۲۰۶۔

☆ ۔ استاد عبدالفتاح چودہویں صدی میں مصر کے وہ مشہور مفکر اور اہلسنت کے وہ مایہ ناز محقق ہیں جنہوں نے اسلامی تاریخ میں تحقیق پر ایک نیا دروازہ کھولا۔

تاریخ کی مستند کتابیں لکھتی ہیں کہ حضرت ابوبکر نے حضرت عثمان کو اپنے پاس بلایا اور ان سے حضرت عمر کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ انہیں بہتر جانتے ہیں۔ لیکن جب انہوں نے اصرار کیا تو حضرت عثمان نے کہا کہ'

"شاید ان کا باطن ان کے ظاہر سے بہتر ہے اور ہم میں کوئی بھی ان جیسا نہیں"

حضرت ابوبکر خوش ہو گئے اور کہنے لگے'

"خدا کی قسم اے عثمان! اگر میں خطاب کے بیٹے کو ترک کر دیتا تو مجھے تم میں کوئی کلام نہ تھا۔"

پھر انہوں نے حضرت عثمان سے آپس کی گفتگو مخفی رکھنے کے لئے کہا اور ان سے چاہا کہ حضرت عمر کی خلافت کو ایک دستاویز پر لکھ دیں۔ چنانچہ وہ املاء کرانے لگے اور حضرت عثمان لکھنے لگے'

"یہ وہ حکم نامہ ہے جسے عبداللہ بن عثمان نے مسلمانوں تک پہنچانے کا عہد کیا ہے"

یہاں پہنچ کر حضرت ابوبکر مزید تاب سخن نہ لا سکے اور بے ہوش ہو گئے۔ حضرت عثمان ان کے پاس اٹھ کر آئے تو انہیں بے ہوش پایا۔ انہوں نے اس ڈر سے کہ وہ اس دستاویز کو نامکمل چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو جائیں' خود اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا اور آگے لکھا'

"بے شک میں نے عمر بن خطاب کو تم پر خلیفہ بنایا ہے پس تم اس کا کہا مانو اور اس کی اطاعت کرو"

اتنے میں خلیفہ کو ہوش آ گیا۔ حضرت عثمان نے ان سے اس دستاویز پر اقرار لے لیا۔ پھر خلیفہ نے اس پر خلافت کی مہر لگا دی اور اسے لوگوں تک پہنچانے کے لئے کہا۔

اس طرح حضرت عمر کو خلافت ملی جبکہ حضرت ابوبکر و طلحہ کے درمیان خاصی

مخاصمت ہو چکی تھی اور جناب امیر علیہ السلام بالکل نظرانداز کر دیئے گئے تھے۔ اور اس بات کا پورا احتمال موجود ہے کہ حضرت عثمان بھی ان لوگوں کے درمیان ہونے والے توافق میں شریک تھے اور خلافت کے امیدوار تھے۔ اس بات کا اندازہ حضرت ابوبکر کے اس جملے سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے حضرت عثمان کے بارے میں کہا تھا اور ابو سفیان کی خاموشی سے۔ اس لئے کہ ابو سفیان حضرت ابوبکر کے سرسخت دشمنوں میں سے تھا اور ان کے گھر کو قریش کا پست ترین گھر کہا کرتا تھا۔ بلاشبہ اسے اس خاموشی کی اس سے زیادہ قیمت ادا کر دی گئی تھی جسے مورخین ذکر کرتے ہیں کہ اسے صدقات و زکوۃ کے پیسے بخش دیئے گئے تھے۔ اس لئے کہ جب تک اسے اقتدار و ریاست میں شریک نہ کیا جاتا' وہ چین سے بیٹھنے والا نہ تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے شام کی مملکت سے روم کی فوجوں کے انخلاء کے بعد اسے ابو سفیان کے بیٹے کو بخش دیا اور حضرت عثمان سے کہا کہ اگر عمر نہ ہوتے تو مجھے تم میں کوئی کمی دکھائی نہ دیتی تھی۔ اور حضرت عمر بھی دسیوں سال گذر جانے کے بعد ابو سفیان کے خاندان والوں سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کر دکھاتے ہیں۔ لہٰذا ایک جدید طرز انتخاب کو اپناتے ہوئے وہ حضرت عثمان کو خلیفہ بناتے ہیں۔ ہم ان کی اس سوچ پر شوریٰ کے باب میں مزید روشنی ڈالیں گے۔

خلاصہ کلام یہ کہ حضرت عمر کے بارے میں حضرت ابوبکر کا نقطہ نظر اور پھر حضرت عثمان کو ان کا ولی عہد بنا دینا ان کے اس قول کے متضاد ہے کہ'

"مجھے خلافت سے الگ کر دو اس لئے کہ میں تم سب سے اچھا نہیں ہوں اور پھر علیؑ تمہارے درمیان موجود ہیں"

اور اس قول کے بھی متضاد ہے جو انہوں نے وفات سے پیشتر کہا تھا کہ'

"تین ایسی چیزیں تھیں کہ اے کاش انہیں میں رسول اللہؐ سے پوچھ لیتا"

ان تین چیزوں کے ضمن میں انہوں نے خلافت کے مسئلہ کو ذکر کیا اور یہ کہ آیا انصار بھی اس میں کچھ حق رکھتے ہیں یا نہیں۔ تاکہ کوئی بھی اس مسئلہ میں جدال و مخاصمت نہ کرتا۔ واقعی یہ بات قابل تعجب ہے کہ وہ ایک طرف سے بستر مرگ پر بھی خلافت کے بارے میں مشکوک و متردد دکھائی دیتے تھے اور

دوسری طرف سے خلافت کی تمام ذمہ داریاں بذات خود قبول کرتے ہوئے اسے حضرت عمر کے حوالے کر دیتے ہیں اور حضرت عثمان کو انکا جانشین بھی بنا دیتے ہیں۔

جہاں تک ہماری سمجھ میں آتا ہے۔ حضرت ابوبکر اس قسم کی باتیں کر کے جناب امیر علیہ السلام کی اس ولایت و خلافت میں شکوک و شبہات ڈالنا چاہتے تھے جسے جناب رسالتمآبؐ نے غدیر خم اور دوسرے موقعوں پر لوگوں کے ذہنوں میں راسخ کر دیا تھا۔

استاد عبدالفتاح لکھتے ہیں کہ قریش نے خلیفہ کے انتخاب میں جو بھی روش اختیار کی وہ ہمیشہ اہل بیت رسولؐ کی مخالفت میں اور ان کا حق چھیننے کے لئے تھی۔ ان واقعات کے شواہد و قرائن اس بات کا پورا ثبوت فراہم کرتے ہیں پھر آنحضورؐ کی وفات کے بعد خود قریش نے ببانگ دہل اس چیز کا اظہار کیا اور بنی ہاشم کے گوشزد کر دیا کہ'

"ہم نبوت و خلافت کو ایک گھر میں نہیں دیکھ سکتے"

قریش کے اس قول کو سابق محدثین اور گذشتہ مصنفین کی ایک جماعت نقل کرتی ہے۔

ابن ابی الحدید معتزلی' جناب امیر علیہ السلام کے بارے میں قریش کے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ'

"میں عربوں اور خاص طور سے قریش کو مورد سرزنش قرار نہیں دیتا اس لئے کہ جناب امیر علیہ السلام نے ان کے بہت سے لوگوں کے خون بہائے تھے اور عربوں کے دل و دماغ اسی طرح کے تھے۔ اس لئے کہ اسلام انکے دلوں کی بہت سے کدورتوں کو نہ نکال سکا تھا جیسا کہ آج ہم انہیں مشاہدہ کرتے ہیں! لوگ وہی لوگ تھے اور ایک جیسی طبیعتیں تھیں۔ اور ہر وہ خون جسے جناب رسالتمآبؐ نے جناب امیرؑ یا کسی دوسرے کی تلوار سے بہایا تھا' ان کی منطق اور رسم و رواج میں ان سب کا انتقام لینے کے لئے صرف حضرت علیؑ

ہی باقی رہ گئے تھے۔''[1]

بے شک ابن ابی الحدید حق بجانب ہیں لیکن وہ جناب امیر علیہ السلام کے نظرانداز کئے جانے کے ایک اور اہم سبب پر توجہ نہ کر سکے اور وہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے بھی پوری طاقت کے ساتھ دعوت اسلام کی مخالفت کی اور آخر تک اپنی فرسودہ سوچوں پر باقی رہے یہاں تک کہ مجبوراً انہیں تسلیم ہونا پڑا جیسا کہ ابو سفیان' ابوجہل کا بیٹا عکرمہ' صفوان بن امیہ' سہیل بن عمر' حرث بن ہشام اور قریش کے دوسرے جاگیردار و سرمایہ دار تھے۔ ان لوگوں نے اس لئے اسلام کی اتنی شدید مخالفت کی تھی کیونکہ اسلام ان کے مفادات پر ضرب لگاتا تھا اور ان کے تمام امتیازات ختم کر کے انہیں غریبوں' محروموں اور ستم رسیدہ لوگوں کے برابر لاکھڑا کرتا تھا۔ یہ لوگ بخوبی جانتے تھے کہ حضرت علیؑ بر سر اقتدار آکر سنت نبویؐ پر عمل پیرا ہوں گے۔ اور اگر فتح مکہ کے دن کچھ مصلحتوں کی بنیاد پر جو اسلام کی طرف پلٹتی تھیں' جناب رسالتمآبؐ نے ان سے نرمی سے برتاؤ کیا تھا تو ضروری نہیں تھا کہ جناب امیرؑ بھی ان سے رعایت کرتے اور اس حق و عدالت کو نظرانداز کر دیتے جو انہیں معاشرے کے کمزور ترین لوگوں کے برابر کر دیتی ہے۔ جبکہ دوسروں کے سائے میں رہ کر با آسانی وہ اپنی تمام خواہشات پوری کر سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ایسا ہی کیا اور حضرت ابوبکر کی خلافت کو قبول کر لیا۔ انہوں نے اسی پر اکتفاء نہ کیا بلکہ ان لوگوں کے خلاف بھی محاذ آرائی شروع کر دی جو حضرت علیؑ کی خلافت کا دم بھرتے تھے۔

تاریخ کے مستند دفاتر رقم کرتے ہیں کہ انصار کی جناب امیر علیہ السلام سے شدید ولولہ و محبت اور خلافت انہیں واپس ملنے کی خواہش نے سہیل بن عمر کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے قریش کے سرکردہ افراد کے سامنے کھڑے ہو کر کہا'

---

[1] شرح نہج البلاغہ تیسری جلد (مطبوعہ مصر)۔

"اے گروہ قریش یہ لوگ اپنی اور علیؑ ابن ابی طالب کی طرف بلاتے ہیں۔ علیؑ اپنے گھر میں موجود ہیں اگر چاہیں گے تو انہیں واپس پلٹا دیں گے ورنہ تم انہیں اپنے خلیفہ سے تجدید بیعت کی دعوت دو۔ اگر قبول کر لیں تو صحیح ہے ورنہ ان کا کام تمام کر دو۔ خدا کی قسم میں حضرت ابوبکر سے چاہتا ہوں کہ وہ اس کام میں تمہاری مدد کریں جس طرح سے تم نے ان کی مدد کی تھی۔"

اس کے بعد حرث بن ہشام اور ابو جہل کے بیٹے نے بھی اسی قسم کی جوشیلی تقریریں کیں جن کا لب لباب یہ تھا کہ اگر انصار موجودہ خلافت کی بھرپور حمایت کریں تو صحیح ہے ورنہ انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

کچھ روایات میں نقل کیا گیا ہے کہ خلیفہ اور ان کے حامی ارکان نے خالد بن ولید کے ذریعہ انصار کے قائد سعد بن عبادہ کا کام تمام کر دیا تھا اور یہ مشہور کیا تھا کہ انہیں جنوں نے مارا ہے۔ تائید کے طور پر کچھ شعر بھی کہے تھے جن میں سعد کے قتل کو گروہ اجنہ سے نسبت دی گئی تھی۔ چنانچہ ان سے فارغ ہونے کے بعد یہ لوگ نماز کے دوران جناب امیر علیہ السلام سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سوچ میں پڑ گئے تھے۔ لیکن اجراء کے آخری لمحے ان کی رائے بدل گئی۔ لہٰذا سلام پھیر کر نماز کو مکمل کرنے کے بجائے انہوں نے یہ جملہ ادا کیا'

"خالد ایسا نہ کرو"

انکا یہ فعل اہلسنت کے کچھ فرقوں کے فقہا کے نزدیک اس بات پر دلیل بن گیا کہ نماز کو سلام کے بغیر کسی اور چیز سے بھی ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ قرآن و سنت کی طرح صحابی کا عمل بھی احکام کی ایک مستقل دلیل اور حجت ہے۔

ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں ان اسباب کے ضمن میں کہ جن کے باعث قریش جناب امیر علیہ السلام سے اپنا انتقام نہ لے سکی' لکھتے ہیں کہ وہ ابو جعفر اسکافی کے پاس تھے اور ابو جعفر انہیں اپنی سوچ کے مطابق کچھ اسباب بتلا رہے تھے کہ انہوں نے ابو جعفر سے سوال کیا۔

"کیا نماز میں جناب امیر علیہ السلام کو قتل کرنے کی ان لوگوں کی سازش اور خالد کے بارے میں کی جانے والی باتیں صحیح ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا کہ امامیہ کی ایک جماعت ان چیزوں کو نقل کرتی ہے۔ پھر انہوں نے مزید کہا کہ ایک شخص امام ابو حنیفہ کے ساتھی اور ہم نشین زفر بن ہذیل کے پاس آیا اور ان سے دریافت کرنے لگا کہ سلام کے بجائے کسی اور چیز کے ذریعہ یعنی وضو توڑ کر یا کوئی کام انجام دے کر نماز ختم کرنے کے بارے میں ابو حنیفہ کا کیا نظریہ ہے؟

زفر نے جواب دیا کہ ان کی نظر میں جائز ہے اس لئے کہ حضرت ابوبکر نے اپنے تشہد میں کچھ کہا تھا۔ اس نے پوچھا کہ کیا کہا تھا تو زفر نے جواب دیا کہ اس کے خلاف کچھ نہ کہا تھا۔ اس نے جب دوسری اور تیسری مرتبہ بھی اس سوال کو دہرایا تو زفر نے اسے زبردستی اپنی محفل سے خطابیہ کہکر نکلوا دیا۔

ابن ابی الحدید نے جب ابو جعفر سے اس روایت کے بارے میں ان کا نقطہ نظر پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اگرچہ امامیہ نے ان چیزوں کو نقل کیا ہے لیکن ان کی نظر میں حضرت ابوبکر سے بعید ہے کہ وہ خلافت بھی چھین لیں، فدک بھی غصب کرلیں اور حضرت علیؑ کے قتل کے منصوبے بھی ترتیب دیں۔ البتہ خالد سے یہ کام ہرگز بعید نہیں اس لئے کہ خالد شجاع و جری بھی تھا اور جناب امیرؑ سے نفرت بھی کرتا تھا۔

ابن ابی الحدید نے ابو جعفر سے پوچھا کہ امامیہ نے اس ضمن میں کیا نقل کیا ہے تو وہ مسکرائے اور کہنے لگے کہ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو جانتے بوجھتے کے بعد بھی سوال کرتے ہیں۔ پھر انہوں نے اسی مضمون کا متنبی کا شعر پڑھا اور کہا کہ انہیں اس کام سے معاف رکھا جائے۔

ابو حنیفہ کے ہم نشین زفر بن ہذیل کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی ایسی چیز ضرور وارد ہوئی تھی جسے وہ مخفی رکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا سوال کرنے والے کے شدید اصرار کے باوجود انہوں نے نہ بتایا کہ حضرت ابوبکر نے تشہد میں کیا کہا تھا بلکہ اسے خطابیہ کہہ کر زبردستی اپنی محفل سے

نکال باہر کیا۔ اگر واقعی مکتب تشیع کی نقل کردہ روایتیں صحیح نہ ہوتیں تو انہیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اسی طرح ابو جعفر اسکافی اور ابن ابی الحدید معتزلی جیسے اہلسنّت کے مشائخ صرف عقیدے کی بنیاد پر ان روایات کو شک و تردید کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور ہرگز ان کے غلط و بے بنیاد ہونے پر یقین نہیں رکھتے۔ لہٰذا صرف عقیدے کی بنیاد پر یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ یہ کام فلاں سے بعید ہے اس لئے کہ اگر کوئی سیرت النبیؐ اور صدر اسلام کے واقعات کا مطالعہ رکھتا ہو اور اس رویے سے واقف ہو جو مہاجروں نے اہل بیت رسولؐ مخصوصاً" جناب سیدہ سے رکھا تھا تو اس کی نظر میں یہ کام بعید نہیں ہو گا اس لئے کہ اس جیسی یا اس سے بڑی چیزیں بھی واقع ہو چکی ہیں۔

امامؑ حضرت عمر کے دور میں

حضرت عمر دارالخلافہ سنبھال چکے تھے اور لوگ اسی طرح ان کے مطیع و فرمانبردار ہو گئے تھے جس طرح ان سے پہلی خلافت کے حامی و وفادار رہ چکے تھے ۔ قریش اپنی اس سازش میں کامیاب ہو گئی تھی کہ نبوت و خلافت کو ایک گھر میں جمع نہ ہونے دیں گے ۔ یہ وہ تلخ حقیقت تھی جس کا انکشاف چند ماہ گذر جانے کے بعد خود خلیفہ نے بھی بنی ہاشم کے ایک نوجوان سے کیا جو ان سے مانوس ہو گیا تھا اور ان کی باتیں سننے کا مشتاق رہتا تھا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ خلیفہ کے انتخاب میں قریش نے ہمیشہ اسی طریقہ کار کو اپنایا تھا۔ البتہ وہ حضرت عمر کے سامنے اسی طرح تسلیم ہو گئی تھی جس طرح اس نے حضرت ابوبکر کو قبول کیا تھا۔ اپنے دور حکومت میں حضرت عمر نے بھی بڑے بڑے اور نمایاں صحابہ کرام کے سلسلہ میں اسی طرز فکر پر عمل کیا جسے حضرت ابوبکر رائج کر گئے تھے ۔ وہ حضرت عمر کو وصیت کر گئے تھے کہ '

"ان اصحاب رسولؐ سے ہوشیار رہنا جن کی گردنیں بلند اور نگاہیں اٹھی ہوئی

ہوں"

اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابوبکر ڈرتے تھے کہ اگر یہ اصحاب مختلف شہروں میں پھیل جائیں اور وہاں کے لوگ ان کے گرویدہ ہو جائیں تو یہ لوگ یا خلافت کے خلاف علم بلند کریں گے یا خود مختار رہ کر خلافت کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنائیں گے۔ چنانچہ ان کی اس وصیت پر حضرت عمر نے بھی بڑی سختی سے عملدر آمد کیا اور اس قسم کے تمام اصحاب کو مدینہ سے باہر نہ نکلنے دیا۔

روایت ہے کہ ان میں سے کوئی صحابی اگر ان کے پاس آکر سرحدوں یا جنگ زدہ علاقوں میں جانے کی اجازت طلب کرتا تو وہ منع کر دیتے اور اسے اپنے گھر اور مسجد سے کام رکھنے کا مشورہ دیتے اور کہتے'

"تم بحد کافی رسول اللہؐ کے ساتھ جہاد کر چکے ہو اور آج ان جنگوں میں حصہ لینے سے تمہارے حق میں یہ بہتر ہے کہ نہ تم دنیا کو دیکھو اور نہ دنیا تمہیں دیکھے"

چنانچہ اگر کسی کو خاصی مشکلات کے بعد اجازت بھی ملتی تو اس علاقہ کی ہوتی جو فتح کیا جا چکا تھا اور اتنی قلیل المدت ہوتی کہ وہ کف افسوس مل کر رہ جاتا۔ جب حضرت عمر کو یہ احساس ہوا کہ اس پابندی کا ان لوگوں پر برا اثر پڑا ہے اور وہ دل میں ان سے سخت ناراض و برہم ہیں تو وہ کبھی کہتے کہ'

"قریش خدا کے بندوں کے بجائے صرف اس کے مال سے مدد لینا چاہتی ہے۔ لیکن جب تک خطاب کا بیٹا زندہ ہے ایسا نہیں ہو سکتا"

اور کبھی ایک ناصح اور ان کی آخرت کے نگہبان بن کر سامنے آتے اور کہتے کہ یہ پابندی آخرت کے عذاب اور جہنم کی آگ سے نجات دلانے کے لئے ان پر عائد کی گئی ہے۔

جہاں تک جناب امیر علیہ السلام کا تعلق ہے تو مورخین میں سے کسی نے نقل نہیں کیا کہ آپ نے حضرت عمر یا ان کی خلافت سے مخالفانہ یا معاندانہ رویہ روا رکھا ہو۔ البتہ جب کبھی انہیں مشکلات پیش آتیں یا نئے مسائل اٹھ

کھڑے ہوتے اور وہ بھاگے بھاگے آپ سے مشورہ لینے آتے تو آپ ایک عظیم انسان اور شفیق ناصح کی حیثیت سے انہیں مشورے دے دیتے یا ان کے مسائل کو حل کر دیتے۔ نتیجتاً" اسلام بہت سی مملکتوں اور سپر پاوروں کو فتح کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور یہ اسلام کی مصلحتیں تھیں جن کے سبب آپ خلیفہ اور ان کے حواریوں سے اس حد تک رابطہ رکھتے تھے۔

دوسری طرف سے اپنی تمام ہمت لوگوں کو علم و شعور دینے اور انہیں قرآن و سنت کے احکام اور مسائل شرعی کے بیان کرنے اور ان کے درمیان قضاوت کرنے میں صرف کرتے۔

تاریخ لکھتی ہے کہ حضرت عمر جناب امیر علیہ السلام کی رائے کا بھرپور احترام کرتے تھے اور شریعت سے ہٹ کر بھی ان کے مشوروں کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ اکثر و بیشتر کہا کرتے تھے کہ خدا مجھے کسی ایسی مشکل سے دو چار نہ کرے جس کے لئے حضرت علیؑ نہ ہوں۔

روایات میں صراحت کے ساتھ نقل کیا گیا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام ہی نے مسلمانوں کی اس ہجری تاریخ کا سنگ بنیاد رکھا جسے وہ آج تک کلینڈر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اس ضمن میں روایت ہے کہ ایک شخص حضرت عمر کے پاس آیا۔ وہ کسی سے کچھ مبلغ رقم کا متقاضی تھا اور اس کے پاس ایک تحریر نامہ تھا جس میں قرض کی اصل رقم ماہ شعبان کے ساتھ درج تھی۔ حضرت عمر نے جو اسے دیکھا تو فوراً اس میں موجود نقص کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے مقروض سے پوچھا کہ اس سال کا شعبان یا اگلے سال کا؟

اور اس کے باوجود کہ وہ اگلے سال کا بتاتا رہا لیکن انہیں یقین نہ آیا۔ اس لئے کہ دونوں مختلف باتیں کہہ رہے تھے اور اقرار نامہ میں یہ چیز مبہم تھی۔ اس لئے کہ اس وقت تک لوگوں کے پاس کوئی خاص اور معین تاریخ نہ تھی۔ کچھ لوگ عام الفیل پر تکیہ کرتے تھے اور کچھ اس سال پر جس میں اسلامی حکومت کی داغ بیل پڑی تھی۔ بہرحال حضرت عمر فیصلہ کر چکے تھے کہ مسلمانوں

کے لئے ایک ایسی تاریخ معین کریں جس پر وہ اپنے کاموں میں اعتماد کرتے ہوں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے تمام صحابہ کرام کو جمع کیا۔ مذکورہ مسائل میں صحابہ کرام کی آراء میں شدید اختلاف پایا جاتا تھا اور نزدیک تھا کہ نتیجہ برآمد ہونے سے پہلے ہی محفل برخاست ہو جاتی اگر حضرت عمر جناب امیر علیہ السلام سے یہ تقاضا نہ کرتے کہ وہ اس مسئلہ میں اپنی صحیح و استوار رائے سے آگاہ کریں۔ آپ نے فرمایا کہ ہم جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مکہ سے مدینہ ہجرت کو اسلامی تاریخ کا سنگ بنیاد قرار دیتے ہیں۔ حضرت عمر کو تعجب ہوا کہنے لگے کہ '

"اے ابو الحسنؑ آپ ہمیشہ کامیاب ہیں"

بے شک وصی رسولؐ کی رائے نے انہیں تعجب میں ڈال دیا اس لئے کہ آنحضورؐ کی یہ ہجرت اسلامی فتوحات کا پہلا قدم اور دعوت اسلام کے لحاظ سے اسلامی تاریخ کا سب سے نمایاں واقعہ ہے۔ یہ واقعہ ہمیں جناب امیرؑ کی ان بے لوث قربانیوں کی یاد دلاتا ہے جو آپ نے آنحضورؐ کی رسالت کو بچانے اور اسلام کے پیغام کو مشرق و مغرب تک پہنچانے کے لئے دی تھیں۔

حضرت عمر کہ جن کے بارے میں مورخین کی رائے عامہ ہے کہ وہ سخت کلام اور خشک طبع تھے اور پھر انہوں نے آپؑ اور آپؑ کی اہلیہ کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا تھا لیکن جہاں کہیں مسلمانوں کو آپ کے علم و دانش کی ضرورت ہوتی وہ آپ کا نام لیتے اور کبھی کبھار نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کی حسن قابلیت کا اعتراف کر لیتے۔ لیکن یہ تمام اعترافات اس پر پلٹتے تھے کہ وہ آپ کو خلافت سے دور رکھنے کی گھناؤنی سازش سے اپنا دامن چھڑانا چاہتے تھے اور بسا اوقات آپ کو خلافت سے دور کئے جانے کے وہ اسباب ذکر کرتے کہ جن کا حق و حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔

ان کی اس قسم کی زیادہ تر گفتگوئیں عبداللہ بن عباس سے ہوتیں جو ان دنوں کم سن تھے اور خلیفہ ان کی ذہانت و قابلیت سے متاثر تھے۔ اور خلیفہ کی سخت کلامی اور ہیبت کے باوجود بھی وہ خلیفہ کو پریشان کرنے ' ان کے خیالات کو

غلط ثابت کرنے اور ان کے منہ پر صاف یہ کہہ دینے سے نہ چوکتے تھے کہ خلافت ہتھیا کر انہوں نے ان کے چچا زاد بھائی کا حق مارا ہے۔

مورخین لکھتے ہیں کہ حضرت عمر اس ہاشمی نوجوان سے مصروف بحث تھے کہ بات حضرت عمر کے اس اعتراف پر ختم ہوئی کہ جناب امیر علیہ السلام مظلوم ہیں۔ ابن عباس نے کہا کہ اے امیر المومنین آپ ان کی مظلومیت ختم کر دیجئے۔ حضرت عمر ایک معقول جواب دینے کے لئے تھوڑا سا ٹھہرے پھر بولے'

"میرے خیال میں لوگوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا سوائے اس کے کہ وہ نوجوان تھے چنانچہ عربوں نے انہیں کم سن سمجھا اور وہ اب سن شعور کو پہنچے ہیں"

انہوں نے مزید کہا کہ'

"اے ابن عباس! کیا نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو چالیس کے سن وسال سے پہلے لوگوں کے پاس نہیں بھیجا"

ابن عباس نے جواب دیا کہ اے امیر المومنین جہاں تک اہل خرد کا تعلق ہے تو وہ انہیں اسلام کی ابتداء سے ایک کامل انسان سمجھتے رہے ہیں۔ البتہ محروم خیال کرتے رہے ہیں۔ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے وفات سے قبل اسامہ بن زید کو تمام مسلمانوں کا امیر بنایا تھا حالانکہ ان میں قریش کے کہن سال بوڑھے بھی موجود تھے جبکہ اسامہ کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ تھی۔[۱]

---

[۱] مذکورہ روایت کے مطابق جو مفروضہ حضرت عمر نے پیش کیا وہ سرے ہی سے بے بنیاد ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ حضرت یحیی کے بارے میں فرماتا ہے " یا یحیی خذ الکتاب بقوة و آتیناه الحکم صبیا" (سورہ مریم ۱۲) اے یحیی کتاب کو مضبوطی سے تھام لو اور ہم نے بچپن میں انہیں نبوت عطا فرمائی۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ بن مریم کے دنیا میں آنے کے بعد ہی ان کی گفتگو ان لفظوں میں نقل کرتا ہے کہ قال انی عبد اللہ آتانی الکتاب وجعلنی نبیا" - "انہوں (عیسیٰ بن مریم) نے کہا کہ میں خدا کا بندہ ہوں مجھے کتاب دی گئی ہے اور نبی قرار دیا گیا ہے۔" (مریم - ۳۰)۔

اسی طرح ایک اور موقعہ پر حضرت عمر نے ابن عباس سے کہا کہ اگرچہ حضرت علیؑ خلافت کے لئے سب سے زیادہ لائق تھے لیکن وہ دو اسباب کی بناء پر ان سے ڈرتے تھے ایک ان کی کم سنی سے اور دوسرے ان کی بنی ہاشم سے والہانہ محبت سے۔

اسی قسم کی روایت کو ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں ابوبکر انباری کی امالی سے بھی نقل کیا ہے۔

جو روایات بھی اس موضوع پر ابن عباس یا کسی اور کی حضرت عمر سے بحث کی شاہد ہیں ان میں یہ اسباب کثرت سے نقل کئے گئے ہیں۔ ہم خیال نہیں کرتے کہ حضرت عمر ان دو اسباب کے ذریعہ قریش کے اس نقطہ نظر کی توجیہہ کرنے میں سنجیدہ تھے جو انہوں نے خلافت کے بارے میں اپنایا تھا۔ اس لئے کہ جناب امیر علیہ السلام کم سن نہ تھے بلکہ ان کی بابرکت عمر تیس سال سے زیادہ تھی۔ جتنی معرکہ آرائیوں میں انہوں نے حصہ لیا اور جتنے پہلوانوں کا ان سے سامنے ہوا اس کا تصور بھی کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔ اور تمام مسلمانوں سمیت حضرت عمر بھی جانتے تھے کہ وہ اپنے عزیز و اقارب سے بیجا رعایت نہ کرتے تھے۔

تعجب تو حضرت عمر پر ہے کہ انہوں نے جناب امیر علیہ السلام کی بنی ہاشم سے والہانہ محبت کی بنیاد پر انہیں خلافت نہ دی اور چونکہ حضرت عثمان سے اقرباء پروری اور خاندان دوستی کا کوئی خطرہ لاحق نہ تھا اس لئے خلافت ان کے حوالے کر دی! اور گذشتہ معاہدے کے مطابق اپنے اس فیصلے کی پردہ پوشی کے لئے پانچ اور افراد کو ان کے ساتھ ملا کر ایک شوریٰ تشکیل دی جس کے بارے میں ہم خود شوریٰ کے باب میں مزید بحث کریں گے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ خود اعتراف کر چکے تھے کہ اگر عثمان خلافت سنبھال لے تو اپنے بھائیوں کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دے گا۔

ابن عباس اور خلیفہ ثانی کے درمیان ہونے والا بحث و مباحثہ میں ایک مرتبہ خلیفہ نے ابن عباس کے دلائل قبول کرنے کے بعد کہا کہ چونکہ انکا چچا

زاد بھائی شوخ طبع اور اہل مزاح ہے اس لئے وہ انہیں خلافت دینے سے معذور ہیں۔

حضرت عمر کے ان جوابوں سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ وہ جناب امیر علیہ السلام کے بارے میں اپنی رفتار و رویے کی توجیہہ کرنا چاہتے تھے لہٰذا کبھی کہتے کہ قریش نبوت و خلافت کو ایک گھر میں نہیں دیکھ سکتی، کبھی کہتے کہ وہ کم سن و سال اور بنی ہاشم پر فریفتہ ہیں اور کبھی ان کے اہل مزاح و تفریح ہونے کی باتیں کرتے۔ حالانکہ وہ کئی موقعوں پر خود اعتراف کر چکے تھے کہ،

"اگر علیؑ خلافت سنبھال لیتے تو لوگوں کو صحیح راستے پر گامزن کرتے اور آشکار حق کی طرف بلاتے"

اس اعتراف کے بعد بھی وہ جناب امیر علیہ السلام کو شوخ طبع کہہ رہے تھے اور ان کی نظر میں یہ عنصر انہیں خلافت سے دور رکھنے کا کافی سبب تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ لوگوں میں ان کی تلخ کلامی اور بد خلقی خاصی مشہور ہے اور حضرت ابوبکر نے جن اصحاب سے بھی ان کے بارے میں مشورہ کیا تھا سب نے ان کی انہی صفات کو ذکر کیا تھا جو صفات رذیلہ و مذمومہ سے ہے اور جس کے بارے میں قرآن کریم جناب ختمی مرتبتؐ سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ،

"اگر آپ بد مزاج اور سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے کب کے تتر بتر ہو جاتے"[1]

حضرت ابوبکر نے تو اس صفت مذمومہ کے ہوتے ہوئے بھی انہیں خلیفہ بنا دیا اور وہ جناب امیر علیہ السلام کی غریبوں اور ستمدیدہ لوگوں سے ہلکی سی مسکراہٹ یا ان سے مانوس ہونے کی خاطر انہیں خلافت سے محروم کئے دے رہے تھے۔

عمر بن عاص بھی حضرت عمر کے اس جملہ کے ذریعے معاویہ کی محفل میں

---

[1] آل عمران - ۱۵۹-

جناب امیر علیہ السلام پر عیب لگاتا تھا چنانچہ جب آپ کو اس بات کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا'

نابغہ کے بیٹے پر حیرت ہے کہ وہ شام کے لوگوں سے میرے بارے میں مشہور کرتا پھرتا ہے کہ مجھ میں سنجیدہ پن نہیں پایا جاتا ہے اور میں وہ بیکار آدمی ہوں جو تفریح اور خوش گذرانی میں اپنا وقت گذارتا ہوں۔ بے شک اس نے جو کچھ کہا غلط کہا اور کہہ کر گناہ گار ہوا۔ آگاہ رہو کہ جھوٹ بد ترین قول ہے۔ وہ خود جھوٹ بولتا اور وعدہ خلافی کرتا ہے۔ اگر وہ کسی سے مانگتا ہے تو اس کی جان دوبھر کر دیتا ہے۔ اور اگر کوئی اس سے سوال کرے تو بخل سے کام لیتا ہے۔ وہ عہد شکن اور رشتوں کو توڑنے والا ہے۔ جنگ میں جب تک تلواریں گردنوں تک نہیں پہنچ جاتیں وہ بڑی تنومندی سے حکم چلاتا اور ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے اور جب وہ وقت آ جاتا ہے تو اس کا آخری حربہ حریف کے سامنے خود کو عریاں کر دینا ہوتا ہے۔ خدا کی قسم مجھے موت کی یاد نے کھیل کود اور بیہودہ چیزوں سے باز رکھا ہے اور اسے عاقبت اور قیامت کی غفلت نے حق بات کہنے سے روک دیا ہے۔ اس نے اس وقت تک معاویہ کی بیعت نہ کی جب تک کہ معاوضہ کی بات اور دین کا سودا نہ کر لیا۔

ابن ابی الحدید لکھتا ہے کہ جناب امیرؑ کی ذات میں کوئی نقص نکالنے کی غرض سے معاویہ بھی کبھی کبھار یہی حربہ استعمال کرتا تھا[۵۸]۔

---

[۵۸] شرح نہج البلاغہ جلد نمبر ۱ صفحہ نمبر ۸ (مطبوعہ مصر)۔

حضرت عمر کی وفات

کیونکہ موضوع سخن حضرت عمر کے بعد کی خلافت کے بارے میں ہے اس لئے ہم ان کی وفات اور اس کے اسباب پر بحث و گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

مورخین پورے اتفاق کے ساتھ لکھتے ہیں کہ گیارہ بارہ سال حکومت کرنے کے بعد تقریباً" تریسٹھ (۶۳) سال کی عمر میں' ابو لئولئوہ کے خنجر سے ان کی موت واقع ہوئی۔ ابو لئولئوہ مغیرہ بن شعبہ کا فارسی غلام تھا۔ جسے حضرت عمر نے مدینہ میں رہنے کی اجازت دے دی تھی باوجودیکہ وہ مدینہ میں غلاموں کے داخلے پر پابندی لگا چکے تھے۔ اس لئے کہ ابو لئولئوہ کئی کاموں میں مہارت رکھتا تھا اور مدینہ اس جیسے لوگوں کا محتاج تھا لہٰذا مغیرہ کی سفارش پر انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ اور جیسا کہ مورخین لکھتے ہیں مغیرہ بن شعبہ اسے ماہانہ سو درہم دیتا تھا لیکن جب اس نے اس غلام پر مزید بوجھ ڈالا تو اس نے خلیفہ سے شکایت کی۔ اور یہ واضح کر دینے کے بعد بھی کہ وہ ایک سے زیادہ ہنر جانتا ہے' خلیفہ نے اس کا بوجھ کم کرنے یا اس کی آمدنی بڑھانے میں کوئی وساطت نہ کی۔

کچھ دن اسی طرح گذر گئے یہاں تک کہ ایک دن خلیفہ نے اسے بلوا کر پوچھا'

"میں نے سنا ہے کہ تم ایک ایسی چکی بنانے کا دعویٰ کرتے ہو جو ہوا سے چلتی ہے"

اس نے برہمی سے جواب دیا کہ

"میں آپ کے لئے ایک ایسی چکی بناؤں گا کہ لوگ اس کے بارے میں باتیں کریں گے"

خلیفہ اس کا مطلب سمجھ گئے اور اپنے اطرافیوں سے کہنے لگے کہ اس کا یہ جملہ ایک طرح کی دھمکی ہے۔ ابھی تین دن ہی گذرے تھے کہ اس نے مسجد کے ایک گوشہ میں مورچہ لے لیا۔ اور پھر جب خلیفہ نماز کے لئے آنے لگے تو دو منہ والے خنجر سے ان کے پیٹ پر تین لگاتار وار کئے۔ جس سے وہ زمین پر گر گئے اور خون میں لت پت ہو گئے۔ پھر جس نے بھی اس کے قریب آنے کی کوشش کی اس نے ان سب پر حملہ کیا اس طرح کل تیرہ آدمیوں کو زخمی کر دیا اس میں سے کچھ چل بسے۔ پھر جب اس نے اپنے آپ کو چاروں طرف سے گھرا ہوا پایا تو ایسا ہی ایک وار اپنے اوپر کیا اور ٹھنڈا پڑ گیا۔

حضرت عمر کو جب ہوش آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کو قاتل کی خبر لینے بھیجا۔ وہ مسجد سے باہر چلے گئے اور واپس آکر انہوں نے حضرت عمر کو قاتل اور اس کے انجام سے باخبر کیا۔

اسی اثناء میں طبیب کو بلوایا گیا' طبیب نے ان کے زخموں کا معائنہ کرنے کے بعد انہیں خلیفہ کے تقرر کے بارے میں وصیت کرنے کے لئے کہا اور جب عبداللہ نے بھی ان سے امت مسلمہ پر ایک خلیفہ معین کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے کہا کہ'

"اگر میں اس امت پر خلیفہ معین کئے بغیر چل بسا تو مجھ سے پہلے رسول اللہؐ بھی ایسا کر چکے ہیں اور اگر میں کسی کو ان پر خلافت کے لئے منتخب کر لوں تو میرے لئے حضرت ابوبکر کی سنت موجود ہے"

چنانچہ روایات کے مطابق لوگوں کو اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ اس مسئلہ کو لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیں گے جسے چاہیں اپنا خلیفہ منتخب کر لیں۔ لیکن وفات سے کچھ گھنٹے قبل انہوں نے چھ عدد اصحاب پر مشتمل ایک شوریٰ تشکیل دی جس میں سے کسی ایک کو خلیفہ بننا تھا۔

ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ اور تاریخ الخمیس میں عبدالرحمٰن بن ابی بکر سے منقول ہے کہ ابو لؤلؤہ' ہرمزان اور سعد بن ابی وقاص کے غلام جفینہ رات کے وقت ایک جگہ مشورہ کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان کے درمیان دو شاخ والا خنجر رکھا ہوا تھا۔ آنے والی صبح میں حضرت عمر پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ پھر جب خنجر لگ جانے کے بعد انہوں نے حضرت عمر کو اس بات کی خبر دی تو ان کے بیٹے عبید اللہ نے جفینہ و ہرمزان کا اور ابو لؤلؤہ کی بے گناہ بچی کا کام تمام کر دیا۔

مورخین دعویٰ کرتے ہیں کہ حادثہ سے تین دن قبل کعب الاحبار نے حضرت عمر کے پاس آکر انہیں اس حادثہ کی خبر دے دی تھی اور وصیت کرنے کے لئے کہا تھا۔ انہوں نے جب پوچھا کہ اسے کیونکر اس بات کا علم ہوا تو اس نے کہا توریت سے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا توریت میں ان کا ذکر کیا گیا ہے تو اس نے کہا کہ ان کے شمائل اور صفات موجود ہیں۔ حضرت عمر نے جواب دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر سے راضی ہیں۔ چنانچہ جب تین دن بعد ان پر حملہ ہوا تو انہیں کعب کی بات یاد آئی جس کی پیشن گوئی غیر معمولی طور پر صحیح ثابت ہوئی تھی۔

اس طرح مورخین حضرت عمر کی وفات کے سانحہ کو نقل کرتے ہیں بغیر اس کے کہ اس کے اسباب و وجوہات پر نظر ڈالیں۔ اور عہد حاضر کے قلمکار یہ کوشش تو کرتے ہیں کہ ان واقعات پر سوالیہ نشانات کے علاوہ بھی کچھ چیزوں کا اضافہ کریں لیکن دلائل کافی نہ ہونے کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر پاتے۔

اگر کوئی محقق یا دانشور ان اسباب و عوامل پر سے پردہ ہٹانا چاہے جو خلیفہ کی موت کا سبب بنے تو اسے تاریخ میں سوائے اس کے کچھ اور نہ ملے گا کہ خلیفہ

نے ابو لئولئوہ پر عائد کی گئی مالیات کی کمی میں وساطت نہ کی تھی۔

لیکن ہماری نظر میں یہ حقیقی سبب نہیں ہوسکتا اس لئے کہ اگر ٹیکس میں کمی' ابولئولئوہ کی معاشی زندگی پر اثرانداز ہوسکتی ہے تو اس کا حساب یا انتقام اسے اپنے مولیٰ سے لینا چاہئے تھا کیونکہ یہ ٹیکس اس کے مفاد میں تھا اور خلیفہ یا بیت المال سے اس کا کوئی سروکار نہ تھا۔ لہٰذا دراصل اس جرم کے اسباب اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں جنہیں بیان کیا گیا ہے۔!

کچھ بعید نہیں کہ یہ ان لوگوں کا کام ہو جو خلیفہ کی سخت مزاجی اور خشک طبعی سے عاجز آگئے تھے اور خلیفہ کا وجود ان کے لئے ناقابل برداشت ہوگیا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی خلافت کے آخری سالوں میں وہ کچھ شفیق و مہربان بننے لگے تھے اور غریبوں مسکینوں کا کچھ خیال کرنے لگے تھے۔ یہی ان کی عدالت خواہی کا وہ زریں عہد تھا جس کی مثالیں ان کے طرفدار دیتے ہیں۔ ان کی ہیبت اور جلال کا یہ عالم ہوگیا تھا کہ دور دراز کے شہروں میں بسنے والے لوگ بھی ان کے کوڑے سے خوفزدہ رہنے لگے تھے۔

عمر بن عاص نے ایک دن کہا تھا کہ'

"خدا اس دن پر لعنت بھیجے جب میں عمر بن خطاب کا عہدہ دار تھا۔ خدا کی قسم میں نے اسے اور اس کے باپ کو گھٹنوں تک معمولی کپڑے پہنے دیکھا ہے جبکہ عاص بن وائل (اس کا باپ) ریشمی پوشاک پہنا کرتے تھے۔"

اسی طرح مغیرہ بن شعبہ بھی انہیں سخت ناپسند کرتا تھا۔

اس لئے کہ اس پر زنا کا الزام لگنے کے بعد انہوں نے اسے بصرے کی امارت سے معزول کردیا تھا۔ اس پر زنا کا الزام لگایا گیا تھا لیکن حد جاری نہ کی جاسکی تھی اس لئے کہ تین عینی شاہدوں کی شہادت تو واضح تھی لیکن چوتھے کی شہادت میں صراحت نہ پائی جاتی تھی۔ بسا اوقات حضرت عمر اسے دیکھتے ہی کہتے کہ'

"تمہیں دیکھ کر مجھے ڈر لگنے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر آسمان سے پتھر

برسائے۔"

بہر حال مغیرہ مسلمانوں کے درمیان فحاشی' بدکاری اور فتنہ و فساد پھیلانے میں مشہور ہو چکا تھا۔

شرح نہج البلاغہ میں مرقوم ہے کہ مغیرہ بن شعبہ' جریر بن عبداللہ البجلی اور اشعث بن قیس ایک جگہ جمع تھے کہ ایک صحرا نشین شخص وارد ہوا جسے نہ وہ پہچانتے تھے اور نہ وہ ان چہروں سے واقف تھا۔ ان تینوں نے اپنے بارے میں اس کی رائے دریافت کرنے کیلئے نام لے لے کر اس سے پوچھا اور اس نے ان میں سے ہر ایک کو اہل فسق و فجور بتایا۔

اسی طرح شرح نہج البلاغہ اور دوسری کتابیں حضرت عمر اور طلحہ کے درمیان پائی جانے والی رنجش کے بارے میں بھی لکھتی ہیں۔ حضرت عمر طلحہ کو سخت ناپسند کرتے تھے اور ایک دن انہوں نے یہ تک کہہ دیا تھا کہ'

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مرتے دم تک تمہارے اس جملہ پر سخت نالاں تھے جو تم نے پردے کے بارے میں نازل ہونے والی آیۂ مبارکہ پر کسا تھا۔"

طلحہ نے اس دن کہا تھا کہ'

"ان عورتوں کا پردے میں رکھنا اس (پیغبر اکرمؐ) کے لئے کارساز نہیں اس لئے کہ وہ کل مرجائے گا اور ہم انہیں اپنے نکاح میں لے آئیں گے۔"

پھر جیسا کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی روایت میں نقل کیا گیا ہے کہ سعد بن ابی وقاص کا غلام جفینہ اس جرم میں شریک تھا۔ خود سعد کے بھی حضرت عمر سے کوئی اچھے تعلقات نہ تھے۔ مزید یہ کہ کعب الاحبار حادثہ سے تین دن قبل اس سانحہ کی خبر حضرت عمر کو دے چکے تھے۔ جبکہ کعب الاحبار مغیرہ بن شعبہ اور ہر اس منافق کا گہرا دوست تھا جس کا مقصد اسلام کے شرف کو نقصان پہنچانا ہوتا۔ پھر اسلامی تاریخ کے اس حصہ میں ایک پست غلام کی اتنی ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ اس عظیم الشان اسلامی حکومت کے خلیفہ پر ہاتھ اٹھا سکے۔ اور وہ

بھی صرف اس لئے کہ انہوں نے اس کے اور اس کے مولیٰ کے مابین وساطت نہ کی۔ ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حادثہ ان لوگوں کی متفقہ کاروائی اور سوچی سمجھی اسکیم کا نتیجہ تھا جن لوگوں کے لئے خلیفہ کا وجود ناقابل برداشت ہوگیا تھا۔ یہ لوگ خلیفہ سے دشمنی کرتے تھے اور خلیفہ بھی کھلے عام ان کی تضحیک اور بے عزتی کرتے تھے۔

یہاں ہمیں سعد بن ابی وقاص کے غلام جفینہ کی اس کاروائی کا بھرپور جائزہ لینا چاہئے۔ اگر ہم غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ماں کی طرف سے سعد بنی امیہ سے نسبت رکھتا تھا اس لئے کہ اس کی ماں حمنہ ابوسفیان کی بہن تھی اور جیسا کہ ہم ذکر کرچکے ہیں کہ پہلے دن سے ابوسفیان کی نظریں خلافت و اقتدار پر جمی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اس بات کا قوی احتمال موجود ہے کہ اپنے اپنے دور حکومت میں حضرت ابوبکر و عمر نے اسے وعدے دیئے ہوں گے کہ خلافت اس کے خاندان میں منتقل کردی جائے گی لیکن جب حضرت عمر کا دور حکومت طولانی ہوا تو اسے یہ تمام وعدے نقش بر آب ہوتے دکھائی دیئے۔

اس بات کی تائید یوں بھی ہوجاتی ہے کہ تین دن پہلے کعب الاحبار کا اس واقعہ کی خبر دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سازش میں ضرور شریک تھے یا کم ازکم اس سے واقف تھے۔ چنانچہ اگر یہ روایت صحیح ہو کہ اس واقعہ سے تین دن پہلے انہوں نے خلیفہ کو مطلع کردیا تھا تو اس طرح وہ ایک نجومی اور با بصیرت انسان کا لبادہ اوڑھ کر آئے تھے اور اپنے شوم مقاصد تک پہنچنے کے لئے کچھ لوگوں کو تحت تاثیر قرار دینا چاہتے تھے اور خلیفہ پر سے اپنا اعتماد بحال کرنے کے خواہاں تھے۔ ہم ذکر کرچکے ہیں کہ وہ ان لوگوں کے مفاد میں کام کرتے تھے جن کا مقصد اسلام کو نقصان پہنچانا ہو۔ اور بے شک خاندان بنوامیہ کا بھی یہی مقصد تھا۔

لہٰذا نئے خلیفہ کے دور میں انہیں صدارت کا رتبہ ملا۔ خلیفہ ہر مسئلہ میں ان سے مشورہ کرنا انتہائی ضروری سمجھتے تھے اور کوئی ان کا بال بھی بیکا نہ کرسکتا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک وہ بنوامیہ کے ساتھ رہے جو اسلام اور اس کے

مخلص پیروکاروں پر جھوٹ باندھنے اور تہمتیں لگانے میں انہیں بہترین یارومددگار قرار دیتے تھے۔

ان تمام قرائن و شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر کے قتل کی سازش جو ابولئوہ کے خنجر اور جفینہ اور ہرمزان کی مدد سے پایہ تکمیل کو پہنچی' خود صحابہ کی طرف سے تشکیل دی گئی تھی۔ اس کے سرشناس چہروں میں مغیرہ بن شعبہ' سعد بن ابی وقاص' عمر بن عاص اور ابوسفیان کی زیر قیادت خاندان بنی امیہ تھا اور یہ تین لوگ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے صرف اس سازش کو اجراء اور عملی کرنے والے تھے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر کو راستہ سے ہٹاکر ان لوگوں نے اپنے تمام مقاصد حاصل کرلئے اور خلافت حضرت عمر کی تشکیل دی گئی شوریٰ سے ہوتی ہوئی ان کے پاس آپہنچی۔ شاید انہی لوگوں نے عبیداللہ کو اکسایا تھا کہ وہ جفینہ' ہرمزان اور ابولئوہ کی بچی کا کام تمام کردے تاکہ حقائق لوگوں کے سامنے نہ آسکیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آنے والے خلیفہ نے بھی ان لوگوں کی بھرپور حمایت کی۔ انہیں چاہئے تھا کہ ابولئوہ کی بے گناہ اور معصوم بچی کے سفاکانہ قتل پر انہیں اسلامی سزا دیتے اور حضرت عمر کے قاتلوں کو بے نقاب کرتے لیکن حضرت عثمان اور ان کے مشیروں نے اس جرم کی فائل بند کردی اور عبیداللہ کو معاف کردیا۔

شوریٰ

"حتی اذا مضی لسبیله جعلها فی جماعه زعم انی احدھم فیالله وللشوری متی اعترض الریب فی مع الاول منہم حتی صرت اقرن الی ھذہ النظائر"۔

یہاں تک کہ وہ بھی اپنے انجام کو پہنچا اور خلافت کو ایک جماعت میں قرار دے گیا۔ اس خیال کے ساتھ کہ میں بھی اس میں شامل ہوں۔

اے خدا مجھے اس شوریٰ سے کیا سروکار!

کب پہلے کے مقابلہ میں میرے استحقاق و فضیلت میں شک کیا جاسکتا ہے کہ مجھے ان جیسوں کے قریب کیا جائے!!۔[۱]

مورخین کا اجماع ہے کہ مغیرہ بن شعبہ کے فارسی غلام ابولئو لئوہ کے خنجر

---

[۱] خطبہ شقشقیہ (۳) سے نقل کردہ جملہ، اس خطبہ اور اس کے تاریخی مصادر کیلئے رجوع کریں نہج البلاغہ (اردو ترجمہ ۔ خطبہ نمبر ۳) ۔

سے حضرت عمر کی قضا آپہنچی۔ اس سے متعلق کچھ حقائق و واقعات پر ہم روشنی ڈال چکے ہیں اور اس حادثہ کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کرچکے ہیں۔ خنجر لگنے سے ان کے جسم کا بہت سا خون بہہ چکا تھا اور لوگ مسلسل ان سے نئے خلیفہ کی تقرری کے تقاضے کررہے تھے چنانچہ انہوں نے اطراف میں موجود صحابہ کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور حسرت و افسوس کے ساتھ کہا'

"اگر ابوعبیدہ حیات ہوتے تو خلافت ان کے حوالے کردیتا اور اگر میرا پروردگار مجھ سے سوال کرتا تو میں کہتا کہ میں نے تیرے نبیؐ سے سنا تھا کہ وہ اس امت کے امین ہیں۔ اگر ابوحذیفہ کا غلام سالم زندہ ہوتا تو اسے خلیفہ بنادیتا اور پروردگار سے کہتا کہ میں نے تیرے نبیؐ سے سنا تھا کہ "سالم اللہ تعالٰی سے بہت محبت کرتا ہے۔" واقعی اس خلیفہ کی باتیں غیر معمولی طور پر تعجب آمیز ہیں۔ وہ لوگوں سے کچھ کہتے اور کرتے کچھ اور تھے۔ کل سقیفہ میں انہوں نے اور حضرت ابوبکر نے انصار پر اتمام حجت کے لئے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ جملہ منسوب کرکے کہا تھا کہ "خلافت قریش میں ہے" اور آج وہ لوگوں کے سامنے ابوحذیفہ کے غلام کی موت پر تاسف کررہے تھے اس لئے کہ انہوں نے اس کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ سے کچھ سن رکھا تھا۔ وہ آنحضورؐ کی ان دسیوں احادیث کو نظر انداز کرگئے جو سوائے جناب امیر علیہ السلام کے کسی اور کی شان میں نہیں کہی گئیں اور ان باتوں کو بھی بھول گئے جو خود انہوں نے ابن عباس سے کی تھیں لیکن اس ادنٰی غلام کے بارے میں کہا جانے والا ایک جملہ انہیں ازبر تھا۔

استاد عبدالفتاح جیسے روشن فکر محقق اور انصاف پسند مورخ جب حضرت عمر کے اس قول پر پہنچتے ہیں تو بڑی جرات کے ساتھ اس سیاست کو بے نقاب کرتے ہیں جو انہوں نے جناب امیر علیہ السلام کو خلافت سے محروم کرنے کے لئے کھیلی تھی۔

وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ'

"جناب امیر علیہ السلام کی شان میں کہی جانے والی تمام احادیث نبویؐ انہیں

یاد تھیں اور وہ خود بھی آپ کی قدر و منزلت سے واقف تھے لیکن اس سیاست سے بھی بے دخل نہ ہوئے تھے جو قریش اپنے مفاد کے لئے کھیل رہی تھی۔ لہٰذا یا ذاتی پسند کے باعث یا قریش کے زیر اثر آکر انہوں نے خلافت منتقل کرنے میں غلط روش اختیار کی۔

ابھی حضرت عمر یہ تاسف ہی کر رہے تھے کہ مغیرہ بن شعبہ ان کے پاس آیا اور ان سے خلافت کے موضوع پر اظہار نظر کی اجازت طلب کرنے لگا۔ انہوں نے اجازت دی تو اس نے حضرت عمر کو ان کے بیٹے عبداللہ کے خلیفہ بنانے کا مشورہ دیا۔

حضرت عمر نے مغیرہ کو تھوڑی دیر گھورا پھر کہا،

"خدا مجھے موت دے! خدا کی قسم تو صرف برا چاہتا ہے۔ کیا مجھے ایک ایسے شخص کو خلیفہ بنانے کا مشورہ دیتا ہے جو اپنی بیوی کو طلاق دینے پر قادر نہیں! خطاب کی نسل سے لگاتار دو شخص خلافت نہیں سنبھال سکتے۔ جو کچھ عمر نے کیا وہ کافی ہے۔ خدا کی قسم میں نہ زندہ رہ کر اور نہ مر کر اس کی خلافت کی سنگین ذمہ داری کو قبول کر سکتا ہوں۔"

انہوں نے مزید کہا کہ،

"مرتے دم رسول اللہؐ قریش کے ان چھ افراد یعنی علی، عثمان، طلحہ، سعد بن ابی وقاص، زبیر اور عبدالرحمٰن بن عوف سے راضی و خوشنود تھے۔ میں نے انہی لوگوں کے درمیان خلافت کو قرار دیا ہے اور لوگ ان میں سے جسے چاہیں منتخب کر سکتے ہیں۔"

پھر انہوں نے ان تمام حضرات کو بلوانے کے لئے بھیجا اور جب یہ لوگ آگئے تو ان سب پر ایک نظر ڈالی اور کہا،

"کیا تم سب خلیفہ بننے میں دلچسپی رکھتے ہو؟"

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں لکھتا ہے کہ ان کے سوال دہرانے پر زبیر نے کہا

"کونسی چیز ہمیں اس سے روک سکتی ہے جبکہ آپ اس خلافت کے متولی رہ چکے ہیں۔؟ قریش میں کسی لحاظ سے بھی ہم آپ سے کمتر نہیں نہ اسلام میں اور نہ سابقہ میں۔"

خلیفہ نے کہا کہ "اگر تم لوگوں کو منظور ہو تو کچھ تمہارے بارے میں کہوں"

انہوں نے جواب دیا کہ اگر ہم نہ بھی چاہیں تو آپ کب معاف کرنے والے ہیں۔

حضرت عمر نے کہا'

"اے زبیر! جہاں تک تمہارا تعلق ہے تم بہت پست و ڈانواڈول انسان ہو۔ تم میں مومن کی رضایت اور کافر کا غصہ ہے' ایک دن انسان تو دوسرے دن شیطان۔ ان صفات کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ ہرگز تمہیں اس امت کی خلافت نہیں دے سکتا۔ پھر انہوں نے طلحہ پر ایک غضبناک نگاہ ڈالی اور پوچھا'

"بولوں یا خاموش رہوں؟" طلحہ نے جو اس سے پہلے ان کے انتخاب پر حضرت ابوبکر پر سخت نکتہ چینی کرچکا تھا (جیسا کہ ابن ابی الحدید لکھتا ہے) کہا کہ' ضرور بولئے آپ کبھی بھلائی کی بات نہیں کرتے![1]

حضرت عمر نے کہا کہ رسول اللہ وفات پاگئے لیکن وہ تمہارے اس جملے پر سخت نالاں تھے جو تم نے پردے کے بارے میں نازل ہونے والی آیۂ مبارکہ کی بابت کہا تھا۔

پھر عبدالرحمٰن کی طرف التفات کیا اور کہا'

---

[1] خلیفہ اول سے قرابتداری کے باعث طلحہ کی نظریں خلافت پر جم گئیں تھیں لیکن جب انہوں نے حضرت عمر کو خلیفہ بنایا تو اس نے ان پر سخت تنقید کی تھی۔

اے عبدالرحمٰن اگر مسلمانوں کے آدھے ایمان کا تمہارے ایمان سے موازنہ کیا جائے تو تمہارا ایمان ہی بھاری ہو گا لیکن تم جیسے کمزور و ضعیف لوگوں کو خلافت نہیں دی جاسکتی اور پھر خلافت کا چمک دمک سے کیا کام!

پھر جناب امیر علیہ السلام سے کہا کہ'

"خدا کی قسم اگر آپ میں ہنسی مذاق اور مزاح نہ پایا جاتا تو آپ ہی خلیفہ بنتے۔ خدا کی قسم اگر آپ لوگوں کی قیادت سنبھال لیتے تو انہیں صحیح راستہ پر گامزن کرتے اور حق و ہدایت کی طرف رہنمائی کرتے۔۔"

پھر عثمان سے کہا کہ'

"فرض کرو کہ تمہیں پسند کرنے کی وجہ سے قریش تمہیں خلیفہ بنادیتی ہے تو کیا تم بنو امیہ اور ابومعیط کے خاندان کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کردو گے۔ اگر تم ایسا کروگے تو عرب کے بھیڑیئے تمہیں چیر پھاڑ کھائیں گے اور تمہارے بستر راحت پر تمہیں قتل کر دیں گے اگر ایسا ہو تو میری بات یاد کرنا۔"

اور اسی طرح انہوں نے سعد بن ابی وقاص کے بارے میں بھی کچھ کہنے سے نہ چھوڑا اور اسے تند خو اور بدمزاج کہا۔

یہ وہ تاثرات تھے جو خلیفہ نے ان چھ افراد کے بارے میں دیئے۔ انہیں زیادہ تر مورخین نقل کرتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں کرکے حضرت عمر نے خود اپنی پہلی بات کو جھٹلایا اور غلط ثابت کیا کہ رسول اللہ وفات پاگئے تھے اور ان چھ لوگوں سے راضی تھے۔

چنانچہ حضرت عمر کی زندگی کے بارے میں بحث کرنے والے محقق و دانشور کو قدم قدم پر ایسی متضاد اور متناقض باتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک ختم نہیں ہوتی کہ دوسری سر اٹھالیتی ہے۔

انہوں نے صہیب کو اپنی بیماری کے دنوں میں لوگوں کی نماز پڑھانے کے لئے کہا اس لئے کہ نماز کی امامت کا خلافت سے کوئی سروکار نہیں لیکن حضرت

ابوبکر کو کرسی پر بٹھانے کے لئے خود انہوں نے جو دو دلیلیں پیش کی تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ آنحضورؐ کی بیماری کے دنوں میں ابوبکر نماز میں لوگوں کی امامت کرتے تھے۔

اسی طرح انہوں نے باتیں تو حضرت عثمان کے بارے میں بھی بہت کیں لیکن خلافت کا راستہ بھی انہی کے لئے ہموار کرگئے اگر انہیں ان کے بارے میں اپنی رائے پر اتنا اعتماد تھا تو پھر خلافت کیوں انہیں بخش دی اور زندہ و مردہ ہر طرح اس بات کی ذمہ داری لی حالانکہ اپنے بیٹے عبداللہ کو خلیفہ بنانے کی ذمہ داری وہ قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

انہوں نے بظاہر تو حضرت عثمان کی خامیاں بیان کیں اور درپردہ شوریٰ کی آڑ لے کر انہیں خلافت کی کرسی پر بٹھادیا۔ اور جناب امیر علیہ السلام کے بارے میں تمام اعترافات کے بعد بھی ان کے راستہ میں رکاوٹیں کھڑی کردیں۔

انہوں نے اس وقت عثمان کو خلیفہ بنایا جبکہ لوگوں کا دل حضرت علی پر آیا ہوا تھا اور وہ کسی کو بھی آپ کا مدمقابل خیال نہ کرتے تھے۔ اگر وہ قریش سے اتنے ہی خوفزدہ تھے تو کیسے ان سے پہلے حضرت ابوبکر نے قریش کے چیدہ چیدہ لوگوں کی مخالفت کے باوجود بھی انہیں خلافت دیدی تھی اور قریش کو دسیوں سال تک ان کے وجود کو برداشت کرنے پر مجبور کردیا تھا۔!

بہرحال حضرت عمر نے خلافت کو ان چھ افراد میں سے کسی ایک میں منحصر کردیا اور ابو طلحہ انصاری کو اپنے پاس بلا کر کہا'

"اے ابو طلحہ میرے کفن و دفن سے فارغ ہوکر انصار کے پچاس شمشیر بکف لوگوں کو اپنے ساتھ لے لینا۔ پھر ان لوگوں کو ایک گھر میں جمع کرکے اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہرہ دینا کہ وہ باآسانی کسی ایک کو خلافت کے لئے منتخب کرسکیں۔ اگر پانچ افراد ایک فیصلہ کرلیں اور ایک شخص مخالفت کرے تو اس کی گردن اڑا دینا اور اگر چار افراد ملکر ایک فیصلہ دیں اور دو قبول نہ کریں تو ان دونوں کی گردنیں اڑادینا۔ لیکن اگر تین ایک طرف ہوں اور تین دوسری طرف

تو یہ دیکھنا کہ عبدالرحمٰن بن عوف کس طرف ہیں۔ پھر دوسری طرف کے ان تین لوگوں کو موافقت و مصالحت کی دعوت دینا اگر قبول کرلیں تو صحیح ہے ورنہ ان کی گردنیں اڑادینا۔ اور اگر تمام لوگ ملکر کوئی فیصلہ نہ دے سکیں تو ان سب کی گردنیں اڑادینا اور خلافت کو مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑدینا۔"

اس طرح حضرت عمر کی وصیتوں کے سلسلے ختم ہوئے۔ جناب امیر علیہ السلام اور اس شوریٰ کے دوسرے افراد اپنے گھروں سے نکل پڑے یہ جاننے کے باوجود بھی کہ خلافت عثمان کے علاوہ کسی اور کو نہ ملے گی۔ آپ خاموشی کے ساتھ لوگوں کے جم غفیر کے درمیان سے عبور کررہے تھے۔ غم ابتداء میں تو آپ کی آنکھوں تک محدود تھا اور اب غصہ سے پورا چہرہ پسینہ میں ڈوب گیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ پسینہ کی جگہ یہاں خون بہہ نکلے گا۔

ابھی کچھ دیر نہ ہوئی تھی کہ آپ کے چچا عباس بن عبدالمطلب آپہنچے اور خلافت کی سرنوشت کے بارے میں پوچھنے لگے۔ آپ نے انہیں حضرت عمر کے فیصلے اور اس سے متعلق بہت سی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ آپ نے ان کی وصیت پر کہ،

"اگر تین افراد کوئی فیصلہ کرلیں اور تین افراد مخالفت کریں تو یہ دیکھنا کہ عبدالرحمٰن بن عوف کس طرف ہیں۔" وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ عبدالرحمٰن عثمان کا بہنوئی ہے یعنی ان کی سوتیلی بہن ام کلثوم بنت عقبہ کا شوہر ہے۔"[1]

عباس یہ سن کر متحیر ہوگئے اور آپ کو اس شوریٰ میں عدم شمولیت کا مشورہ دینے لگے۔

آپ بخوبی جانتے تھے کہ اس مرتبہ بھی خلافت میں آپ کے لئے جگہ کا کوئی امکان نہیں اس لئے کہ جب تک شوریٰ میں طلحہ جیسے کینہ ور اور خاندان بنی

---

[1] حضرت عثمان کی والدہ اروی بنت کریز پہلے عقبہ بن ابی معیط کے عقد میں تھیں جس سے ام کلثوم پیدا ہوئیں اور عبدالرحمٰن سے بیاہی گئیں۔

ہاشم کے دشمن موجود ہیں تو کیونکر خلافت آپ کو مل سکتی تھی چنانچہ اس بات کو آپ خطبہ شقشقیہ میں بھی بیان کرتے ہیں۔

"اور ان میں سے ایک شخص مجھ سے ذاتی عناد کی وجہ سے الگ ہوا۔"

باقی افراد میں سعد بن ابی وقاص تھا جو اپنے اموی چچازاد بھائی کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا اور عبدالرحمٰن تو حضرت عثمان کا بہنوئی تھا۔ اس وقت جب عباس نے آپ کو شوریٰ میں داخل نہ ہونے کا مشورہ دیا تو حضرت عمر کے بیٹے عبداللہ نے بھی عباس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ "میرے والد اس خلافت کو عثمان کے لئے چاہتے تھے" آپ نے فرمایا کہ آپ ان دونوں سے زیادہ واقف و دانا ہیں۔ آپ نے مزید فرمایا کہ

"میں شوریٰ میں داخل ہوا اس لئے کہ عمر بن خطاب نے مجھے خلافت کا اہل قرار دیا جبکہ اس سے پیشتر وہ دعویٰ کر چکا تھا کہ رسول اللہ فرماتے تھے کہ "خلافت و نبوت ایک گھر میں جمع نہیں ہو سکتیں۔" چنانچہ شوریٰ میں شامل ہو کر میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس کا فعل اس کی نقل کردہ روایت کے منافی ہے اور اس عمل میں منافقت ہے۔"

ابن قتیبہ روایت کرتا ہے کہ حضرت عمر جب شوریٰ کے ان چھ افراد میں سے کسی ایک کو منتخب کر چکے اور ان کے لئے خلافت کی شرائط کا تعین کر چکے (جنہیں ہم بیان کر چکے ہیں) تو ان سے کسی نے کہا'

"اے امیر المومنین ہمارے بارے میں کوئی بات کہئے جسے ہم نقل کر سکیں یا اسے نمونہ عمل بنا سکیں۔" انہوں نے کہا کہ' اے سعد تمہاری بد خلقی اور تند مزاجی نے تمہیں خلیفہ بننے سے روکا اس کے باوجود کہ تم جنگجو آدمی ہو اور اے عبدالرحمٰن معبود کی قسم مجھے صرف اس چیز نے تمہیں خلیفہ بنانے سے روکا کہ تم اس امت کے فرعون ہو اور اے زبیر! تمہیں اس لئے منتخب نہ کر سکا کیونکہ تم راضی مومن اور گستاخ کافر ہو۔ اور اے طلحہ تمہارا تکبر اور غرور آڑے آیا۔ اگر تم خلافت سنبھال لیتے تو اس کی انگوٹھی بھی اپنی بیوی کو پہنا دیتے اور اے عثمان تمہیں تمہاری خاندانی دوستی اور قبیلہ پرستی نے محروم

رکھا۔ اور اے علی تمہیں اس لئے منتخب نہ کرسکا کیونکہ تم خلافت میں بہت تمایل رکھتے ہو بلاشبہ تم اس امت کے سب سے زیادہ باکمال و بافضیلت شخص ہو۔ اگر تمہیں اس امت کی باگ ڈور دیدی جائے تو انہیں حق مبین اور صراط مستقیم پر گامزن کرو۔"[1]

جب حضرت عمر کا کفن و دفن ہوچکا تو ابو طلحہ نے شوریٰ کے افراد کو اکٹھا کیا اور مقداد بن اسود پچاس مسلمانوں کو لے آئے جن کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ وہ اس طرح شوریٰ کے اجلاس کی پہریداری اور مرحوم خلیفہ کی وصیت پر عمل کرنے آئے تھے۔

ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں لکھتا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ اور عمر بن عاص اس گھر کے دروازے پر بیٹھ گئے تھے۔ سعد بن ابی وقاص نے جو انہیں دروازے پر بیٹھے دیکھا تو زبردستی اٹھایا اور کہا کہ "تم لوگوں کو یہ بتلانے کیلئے یہاں بیٹھے ہو کہ اس اجلاس میں ہمارے ساتھ شریک تھے۔"

مورخین کے درمیان اس چیز میں کوئی اختلاف نہیں کہ دو دن گذر جانے کے بعد بھی شوریٰ کوئی فیصلہ نہ دے سکی۔ ہر شخص بذات خود خلافت کا امیدوار تھا۔ تیسرے دن ابو طلحہ نے شوریٰ کے اعضاء کو دھمکایا کہ اگر آج بھی وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکیں گے تو ہر طرح کے غلط نتائج کی ذمہ داری ان کی اپنی گردن پر ہوگی۔

طلحہ سمجھ گیا تھا کہ درحقیقت کشمکش صرف دو افراد کے درمیان ہے۔ کوئی اور ان کا مدمقابل نہیں ہے اور وہ حضرت علی و عثمان ہیں۔ بہرحال خاندان بنوتیم کی ان دلی کدورتوں نے اثر دکھایا جن کی آبیاری حضرت عائشہ کرتی رہتی تھیں![2]

---

[1] الامامہ والسیاسۃ (ابن قتیبہ) جلد اول صفحہ ۲۳۔
☆ ۔ ابن قتیبہ تیسری صدی ہجری کے مشہور و معروف مورخ ' فقیہ اور محدث ہیں۔
[2] طلحہ خاندان بنی تیم سے تھا اور حضرت ابوبکر کا چچازاد بھائی تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر کے خلیفہ بننے کے بعد خاندان بنوتیم اور بنو ہاشم کے تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے۔

مزید یہ کہ جناب امیر علیہ السلام اپنی رائے اور نظر خواہی میں خود مختار و مستقل تھے اور خلافت کو صحیح سمت میں لے جانا چاہتے تھے اور اس چیز کو طلحہ جیسے لالچی و حریص لوگ برداشت نہ کرسکتے تھے چنانچہ آپ کی یہی انفرادیت خلافت آپ سے چھن کر حضرت عثمان کو دیئے جانے کا فیصلہ کن سبب ثابت ہوئی۔ یہ وہ تلخ حقیقت ہے جس کی تصدیق آنے والے دنوں میں بھی ہوگئی جب جناب امیر علیہ السلام کا دور حکومت شروع ہوا۔

شوریٰ نے کسے منتخب کیا؟

شرح نہج البلاغہ اور تاریخ کی دوسری کتابوں میں مرقوم ہے کہ طلحہ نے یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ اقتدار کی اس رسہ کشی اور کھینچ تان میں ناکام رہیں گے، حضرت عثمان کے حق میں دستبردار ہونے کا اعلان کیا۔ مورخین کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جناب امیر علیہ السلام کو ناپسند کرتے تھے۔

حضرت زبیر نے جب دیکھا کہ طلحہ کا فیصلہ سراسر خاندانی دشمنی اور تعصب لرائی پر مبنی ہے تو ان کے ذہن میں وہ خاندانی رشتے تازہ ہوگئے جو وہ جناب امیر علیہ السلام سے رکھتے تھے۔ چنانچہ یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ خلافت کسی اور کو ملے گی وہ کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے،

"میں تم لوگوں کو شاہد و گواہ ٹھہراتا ہوں کہ میں نے اپنا حق خلافت حضرت علی بن ابی طالب کو دیدیا ہے۔"

حضرت زبیر کے بعد سعد بن ابی وقاص کھڑے ہوئے اور عبدالرحمٰن بن عوف کے حق میں مستعفی ہوگئے اس طرح خلافت کے لئے کل تین امیدوار باقی

رہ گئے تھے ہر ایک کا ایک حامی تھا نتیجتا" ہر شخص کے پاس دو ووٹ تھے۔

اس وقت عبدالرحمٰن بن عوف نے کھڑے ہوکر جناب امیر علیہ السلام اور حضرت عثمان سے پوچھا کہ ان دونوں میں سے کون ایک دوسرے کے حق میں دستبردار ہو گا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ جب کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی دونوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے بذات خود خلافت سے کنارہ کش ہونے اور اسے ان دونوں میں سے زیادہ بافضیلت و باکمال شخص کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے دونوں کے سامنے کچھ شرائط پیش کیں کہ وہ ہمیشہ حق کو افضلیت دیں گے اور نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کریں گے۔ اور نہ ہی اپنوں کو غیروں پر ترجیح دیں گے اور نہ امت کی اصلاح و ہدایت میں سستی برتیں گے۔

عبدالرحمٰن نے ان شرائط کو ایک ایک کر کے دونوں حضرات کے سامنے پیش کیا اور دونوں نے بالاتفاق قبول کیا۔ بعد میں ایسا لگتا ہے کہ وہ جناب امیر علیہ السلام کے ان شرائط کے قبول کرنے سے بوکھلا گیا۔ بہر حال اس کے لئے مناسب نہ تھا کہ تمام رشتوں کو یکسر نظرانداز کر کے اپنی بیوی کے بھائی حضرت عثمان کو چھوڑ دے اور خلافت جناب امیر علیہ السلام کے قدموں میں رکھ دے جیسا کہ سعد بن ابی وقاص ایسا کرنے کے لئے تیار نہ تھا اور اپنے اموی ماموں کی حمایت سے ہاتھ نہ اٹھا سکتا تھا۔

بہرصورت عبدالرحمٰن نے تنہائی میں سعد بن ابی وقاص اور میسور بن مخزمہ زہری سے الگ الگ مشورے کئے۔

جناب امیر علیہ السلام بخوبی جانتے تھے کہ تنہائی میں کی جانے والی ان ملاقاتوں کا واحد مقصد ایک ایسے طریقہ کار کی تلاش ہے جس کے ذریعہ خلافت باآسانی حضرت عثمان کے سپرد کی جاسکے۔ ایسا ہی ہوا اور ان ملاقاتوں کے بعد عبدالرحمٰن نے ایک نئی شرط کا اضافہ کیا جو آپ کے لئے قابل قبول نہ ہو سکتی تھی۔

اس وقت باہر سے لوگوں کی آوازیں اور ان کے نعرے باآسانی سنائی دے

رہے تھے۔ غریب و ستم رسیدہ لوگ' اہل زہد و تقویٰ اور خاندان بنی ہاشم اور ان کے طرفدار جو مسلمانوں کی اکثریت کو تشکیل دیتے تھے' حضرت علیؑ کے حق میں نعرے لگارہے تھے جبکہ دولتمند حضرات' سرمایہ دار طبقہ اور بنوامیہ کا خاندان حضرت عثمان کا نام لے رہا تھا۔ عمار بن یاسر اور مقداد بن اسود اور مخالف پارٹی کے ابن ابی سرح اور عبداللہ بن ربیعہ المخزومی کے درمیان کشیدگی بڑھنے والی تھی۔ سعد بن ابی وقاص نے جو یہ منظر دیکھا تو عبدالرحمٰن سے کہا کہ اس سے پہلے کہ لوگ ایک دوسرے کے دست بہ گریبان ہوں تم اپنا کام کر دکھاؤ۔ چنانچہ عبدالرحمٰن نے گذشتہ شرائط کے ساتھ اس شرط کو ضمیمہ کرکے کہ' وہ شیخین کی سنت پر عمل کریں گے اسے جناب امیر علیہ السلام کے سامنے پیش کیا تو آپ نے اسے ماننے سے انکار کردیا اور فرمایا'

"میں خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت پر عمل کروں گا۔ اور اگر کسی مسئلہ میں کتاب و سنت سے کوئی نص موجود نہ ہو تو اپنی رائے پر عمل کروں گا۔"

عبدالرحمٰن نے جب اس شرط کو حضرت عثمان کے سامنے رکھا تو انہوں نے باآسانی اسے قبول کرلیا۔ اس نے مذکورہ شرط کو دوبارہ جناب امیرؑ کے سامنے پیش کیا اس لئے کہ بخوبی جانتا تھا کہ آپ اس شرط کے آگے کبھی سر تسلیم خم نہ کریں گے۔ اور جب اس شرط کو حضرت عثمان کے سامنے رکھا تو انہوں نے اس مرتبہ بھی بغیر تکلف کے اسے قبول کرلیا۔ اس طرح خلافت اسی پروگرام کے مطابق حضرت عثمان کو مل گئی جو حضرت عمر ترتیب دے کر گئے تھے۔

حضرت امیر علیہ السلام حق بات کہنے میں کسی سے نہ ڈرتے تھے چنانچہ اس مسئلہ میں بھی غلط بات سے انکار کرنے میں آپ نے کوئی جھجک محسوس نہ کی۔ عوف کا بیٹا عبدالرحمٰن آپ کی اس حق گوئی سے اچھی طرح واقف تھا چنانچہ سعد اور ابن مخزمہ زہری سے توافق کرنے کے بعد اس نے اس جدید شرط کا اضافہ کیا تھا۔ آپ حضرت ابوبکر و عمر کے دور میں تمام مشکلات اور دینی و دنیوی مسائل کے عقدہ کشا تھے اور ان دونوں حضرات کے لئے آپ کی رائے

حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی مزید یہ کہ مسائل کی سوجھ بوجھ میں خود شیخین کا طرز عمل اور ان کی سیرت یکسر مختلف تھی اور دونوں نے بہت سے معاملات میں سنت نبویؐ سے انحراف کیا تھا لہٰذا سمجھ سے باہر ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف کونسی سیرت پر چلنے کی نصیحت کر رہا تھا جسے قبول کر کے وہ آپ کو خلیفہ بنا دیتا!

جب خود شیخین اپنے اپنے ذوق و سلیقہ کے مطابق چلتے اور اپنے اپنے مفاد و مصلحت کو مدنظر رکھتے تھے تو پھر جناب امیر علیہ السلام ان میں سے کس کی پیروی کرتے!

ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر آپ اس شرط کو بھی مان لیتے تو وہ ایک اور شرط کا اضافہ کرتے اور کرتے رہتے یہاں تک کہ خلافت حضرت عثمان کے دامن میں نہ چلی جاتی۔

اس معرکہ کو سر کرنے کے بعد گذشتہ خلافتوں کی طرح اس مرتبہ بھی آپ دل برداشتہ نہ ہوئے۔ کچھ روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ'

"نحن اهل بیت النبوه و معدن الحکمه امان لاهل الارض و نجاة لمن طلب ان لنا حقا "ان نعطه اخذناه و ان نمنعه نرکب اعجاز الابل"

"ہم خاندان نبوت اور سرچشمہ علم و حکمت ہیں۔ زمین پر بسنے والوں کے لئے امان اور فلاح کی تلاش کرنے والوں کے لئے کشتی نجات ہیں۔ ہمارا ایک حق ہے اگر ہمیں دے دیا جائے تو لے لیتے ہیں اور اگر اس سے محروم کر دیا جائے تو اونٹ کے پچھلے حصہ پر سوار ہو جاتے ہیں۔ (یعنی سختیاں جھیلتے اور

مشقتیں اٹھاتے ہیں)"[1]

پھر آپ نے عبدالرحمٰن کی طرف توجہ کرکے فرمایا'

"یہ پہلا دن نہیں ہے کہ تم نے ہمارے خلاف محاذ آرائی کی ہے ایسے میں ہمارے لئے صبر و شکیبائی ہے اور تمہاری باتوں پر ہم اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔" دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے اس کے گوشزد کیا کہ'

"بے شک تم نے اس سے وہی امید باندھی ہے جو تم دونوں کے رفیق (حضرت عمر) نے اپنے رفیق کار (حضرت ابوبکر) سے باندھی تھی۔ خدا تمہیں ایک دوسرے کا جانی دشمن بنائے"

ابوبلال عسکری لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عبدالرحمٰن اور حضرت عثمان کے خلاف کی گئی حضرت امیر کی اس بددعا کو بہت جلد قبول کیا۔ دونوں حضرات کو اس وقت موت آئی جب ایک دوسرے سے بہت دور ہوگئے تھے اور دلوں میں ایک دوسرے کے لئے رنجشیں پائی جاتی تھیں۔ عبدالرحمٰن نے کسی کو حضرت

---

[1] علمائے فن کے درمیان اس آخری جملہ کی تفسیر میں کہ 'اگر ہمیں محروم کردیا جائے تو ہم اونٹ کے پچھلے حصہ پر سوار ہوجاتے ہیں' اختلاف پایاجاتا ہے
ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ' خطبہ شقشقیہ کے ذیل میں لغت کی مایہ ناز شخصیت احمد بن ھروی سے دو تفسیریں نقل کرتے ہیں۔ پہلی تفسیر کے مطابق اونٹ پر بعد میں سوار ہونے والا شخص کیونکہ اس کے آخری حصہ پر ہوتا ہے اس لئے سختیاں جھیلتا اور مشقتیں اٹھاتا ہے۔ اسی وجہ سے غلاموں اور نوکروں کو پیچھے سوار کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جناب امیرؑ فرمانا چاہتے ہیں کہ اگر زمام حکومت ہمارے سپرد نہ کی جائے تو ہم سختیاں جھیلتے اور مشقتیں اٹھاتے ہیں تاکہ اپنے مقصد تک پہنچ جائیں جس طرح سے کہ اونٹ کی دم پر بیٹھنے والا تاریک راتوں میں اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔
دوسری تفسیر یہ ہے کہ اونٹ کی پیٹھ پر بعد میں سوار ہونے والا شخص پہلے شخص کے پیچھے اور تابع ہوتا ہے اور مہار بھی پہلے ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ چنانچہ اس جملہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم دوسروں کے تابع اور فرمانبردار ہوجاتے ہیں۔
مصنف نے حاشیہ میں دوسری تفسیر کو منتخب کیا ہے۔ سید رضی نہج البلاغہ (کلمات قصار ۲۲) میں دوسری تفسیر کو پسند کرتے ہیں۔ لغت کے مصادر بھی پہلی تفسیر کو ترجیح دیتے ہیں پھر جناب امیرؑ کی سیرت طیبہ میں کہیں یہ چیز نہیں ملتی کہ آپ ان خلفاء ظاہری کے تابع رہے ہوں چنانچہ ہم نے پہلی تفسیر کے مطابق معنی کئے ہیں سید جعفر مرتضیٰ عاملی بھی اسی تفسیر کو صحیح قرار دیتے ہیں۔

عثمان کے پاس بھیج کر ان کے غلط اقدامات اور بدعتوں کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ اسی وقت سے دونوں کے درمیان فاصلے اور بدگمانیاں بڑھتی گئیں [1]۔

ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں لکھتا ہے کہ،

جب حضرت عثمان نے اپنے لئے "طمار الزھراء" نامی عالیشان محل تعمیر کروایا تو اس میں لوگوں کو بڑے پیمانے پر مدعو کیا ان میں عبدالرحمٰن بن عوف بھی تھے۔ عبدالرحمٰن نے جب عالیشان محل اور رنگا رنگ کھانوں کو دیکھا تو حضرت عثمان سے کہا،

"اے عفان کے بیٹے تمہارے بارے میں جن چیزوں کی تردید کرتے آئے تھے آج انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میں تمہاری بیعت سے اللہ جل شانہ کی پناہ مانگتا ہوں۔"

یہ سن کر حضرت عثمان برہم ہوگئے۔ انہوں نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ اسے نکال باہر کرو اور لوگوں کو ان سے ترک معاشرت کرنے کے لئے کہا۔ ایسا ہی ہوا اور سوائے ابن عباس کے کوئی ان کے قریب نہ پھٹکتا تھا۔ ابن عباس بھی انہیں قران کریم کی تعلیم دینے اور فرائض و واجبات سکھانے جاتے تھے۔ پھر عبدالرحمٰن علیل ہوگئے جو کہ ان کی زندگی کی آخری علالت تھی اور حضرت عثمان عیادت کے لئے آئے تو انہوں نے خلیفہ سے کوئی بات نہ کی یہاں تک کہ وفات پاگئے [2]۔

یوں تیسرے دن کے اختتام سے کچھ عرصہ قبل وہ کھیل ختم ہوگیا جو حضرت عمر کی طرف سے ترتیب دیا گیا تھا۔ اس کا بنیادی کردار عبدالرحمٰن اور ان لوگوں نے ادا کیا جنہیں عزیزداری، دلی کدورتوں اور سسرالی رشتوں نے ایک مشترکہ مقصد پر لاکھڑا کیا تھا۔ اس طرح خاندان بنوامیہ کا چشم و چراغ اسی تخت و تاج سے سرفراز ہوگیا جس پر دسیوں سال قبل اس کے آباء و اجداد فخر کرتے

---

[1] کتاب الاوائل۔
[2] شرح نہج البلاغہ جلد اول صفحہ ۶۶۔

تھے۔اور جس کی خاطر انہوں نے اسلام سے سر سخت جنگیں لڑیں اور لڑتے رہے یہاں تک کہ تسلیم ہونے پر مجبور کر دیئے گئے۔ بظاہر تو یہ لوگ اسلام لے آئے تھے لیکن دراصل ایک مناسب وقت و موقعہ کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر جب حضرت عمر کے ہاتھوں ان کے ارادے تحقق پا گئے تو وہ حضرت عثمان سے لپٹ گئے اور انہیں اٹھائے اس طرح بھاگے گویا کہ ہوائی گھوڑوں پر سوار ہوں۔ خاندان بنی ہاشم سے کئی سال تلخیاں سہنے اور اسلام و کفر کی جنگوں میں مسلسل داغ اٹھانے کے بعد کہ جن میں حضرت علی علیہ السلام نے ان کے خون بہائے تھے' آج انہیں خوشیاں نصیب ہوئی تھیں۔ وہ حضرت عثمان کو اٹھائے مسجد پہنچے تو ان کا کہن سال سردار ابو سفیان جو کہ بڑھاپے کے سبب اپنی بینائی کھو چکا تھا' راستہ ٹٹولتا ہوا مسجد پہنچا۔ اس نے بنی امیہ کی طرف رخ کیا اور منہ پھاڑ کر وہ قہقہہ لگایا کہ جس میں نفرتیں اور کدورتیں تھیں۔ ایسا وقیح قہقہہ اس نے اسی دن لگایا تھا جب اس کی بیوی ہند شہید اسلام حضرت حمزہ کے ساتھ وہ سلوک کر رہی تھی جو درندے بھی اپنے شکار کے ساتھ نہیں کیا کرتے۔ اس دن وہ حضرت حمزہ کے جسد پر نیزے کی انی چبھاتا اور ان پر کھڑے ہو کر وہی قہقہہ لگاتا جو آج لگا رہا تھا۔ پھر اس نے ان لوگوں سے کہ جنہیں مسرت و شادمانی نے اندھا کر دیا تھا اور ان افراد سے بھی غافل کر دیا تھا جو ان پر کڑی نظریں رکھتے تھے' پوچھا کہ کیا ان کے درمیان غیر افراد بھی ہیں۔ جب انہوں نے نفی میں جواب دیا تو اس نے اپنی قدو قامت کو جسے عمردراز نے خم کر دیا تھا کھڑا کیا۔ اس لمحہ اس کے ذہن میں جوانی کی امنگیں دوڑنے لگیں اور آباء و اجداد کی آرزوئیں تازہ ہو گئیں۔ اور وہ بھول گیا کہ کچھ عرصہ پیشتر آنحضورؐ کی رسالت کا اقرار کر چکا ہے اور اسلام کو لبیک کہہ چکا ہے۔ اس نے کہا'

"اے بنی امیہ! خلافت کو گیند کی طرح سے پکڑ لو اور ایک دوسرے کے ہاتھوں میں دیتے رہو۔ اس ذات کی قسم جس پر ابو سفیان قسم کھاتا ہے کہ نہ جنت ہے اور نہ دوزخ۔ نہ حساب ہے اور نہ کتاب۔ میری ہمیشہ سے آرزو تھی کہ یہ (اقتدار) تمہارے پاس رہے اور تمہارے بچوں کو ورثہ میں ملے"

اس نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ نئے خلیفہ کی محفل سے اٹھ گیا جبکہ خلیفہ کا

خادم خاص اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ خلیفہ نے خادم کو اسے شہر سے باہر لے جانے کے لئے کہا۔ خادم نہیں جانتا تھا کہ اس کام میں کیا غرض درکار ہے۔ بہرحال خادم انہیں احد کی پہاڑیوں پر لے گیا۔ یہاں تک کہ اسے مسلمانوں کے مقبرہ تک پہنچا دیا۔ وہاں پہنچ کر ابو سفیان نے خادم سے کہا کہ اسے عبدالمطلب کے بیٹے حمزہ کی قبر پر لے چلے۔ قبر پر پہنچ کر اس کے چہرے پر وہی منحوس مسکراہٹ چھا گئی' اس نے کہا'

"اے ابو عمارہ (حضرت حمزہؓ)! کل جس چیز کے لئے تم سے شمشیر بہ کف لڑتے تھے آج وہ ہمارے بچوں کے ہاتھ لگ گئی ہے جو اس سے کھیل رہے ہیں۔"

پھر اس نے قبر کو پامال کیا اور یہ سوچ کر کہ اس طرح اس نے اپنا اور اپنے آباء و اجداد کا انتقام حضرت ہاشم اور ان کے خاندان سے لے لیا ہے' وہ واپس چلا آیا۔

گذشتہ خلافتوں کی طرح اس مرتبہ بھی جناب امیر علیہ السلام نے بڑے صبر و ضبط سے کام لیا تھا۔ آپ نے ان تمام لوگوں کے ساتھ مل کر قیام کیا جو خدا اور رسولؐ اور قرآن مجید پر سچا ایمان رکھتے تھے اور انہوں نے اپنی زندگیاں حق کی سربلندی اور عوام کی بھلائی کے لئے وقف کر رکھی تھیں۔ وہ ان آمرانہ طاقتوں اور ان کی تلواروں سے خائف نہ تھے جو ان کی بدکرداریوں کی نشاندہی کرنے والوں اور خدادادی نعمتوں اور غریب عوام کے اموال کے ضائع کرنے پر خاموش نہ رہنے والوں کے سروں پر پڑتی تھیں۔ آپ نے مسلمانوں کے انبوہ کثیر کے سامنے کھڑے ہو کر آرام و اطمینان کے ساتھ خطاب کیا اور اس طرز عمل کو واضح کر دیا جس پر آپ نے اس نئے دور میں چلنا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ'

"اے لوگو! تم جانتے ہو کہ میں اس خلافت کے لئے دوسروں سے زیادہ لائق و سزاوار ہوں۔ تاہم اس کا انجام تمہاری نظروں کے سامنے ہے۔ معبود کی قسم میں اس وقت تک مفاہمت کے راستہ کو ترک نہ کروں گا جب تک کہ

مسلمانوں کے امور روبراہ ہیں اور ظلم صرف مجھ پر ہوا ہو۔ تا کہ اس کا اجرو ثواب حاصل کر سکوں اور تمہارے ان اختلافات کی روک تھام کر سکوں جن کے نتائج بہت برے ہیں''[1]

اس طرح جناب امیر علیہ السلام نے مصالحت کی ایک راہ نکالی اور آپ اس راہ پر چلتے رہے۔ اپنی طاقت و توان کے مطابق آپ نے اسلام کو فروغ دینے اور مسلمانوں کو نصیحت و رہنمائی کرنے میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ آپ اسی وسعت قلبی کے ساتھ اپنی جان و مال نثار کرتے اورانہیں مفید مشوروں سے نوازتے رہے جس طرح سے کہ عہد گذشتہ میں کرتے رہے تھے۔ تاہم اس نئے خلیفہ اور اس کے خاندانی حلقہ نے یعنی بنی امیہ کے ان لوگوں نے جو ان کے معتمد خاص تھے' شیخین کی سیرت پر بھی چلنا گوارا نہ کیا۔ انہوں نے اسلامی حکومت کے ذرائع اور مال و دولت کو اس طرح لوٹنا شروع کر دیا گویا کہ یہ سب انہیں باپ دادا سے ورثہ میں ملا ہو۔ چنانچہ شقشقیہ میں آپ یوں ان لوگوں کی توصیف کرتے ہیں'

''یہاں تک کہ اس قوم کا تیسرا شخص پیٹ پھلائے لید اور چارہ کے درمیان اٹھ کھڑا ہوا اس کے ساتھ اس کے بھائی بند بھی کھڑے ہو گئے۔ جو اللہ جل شانہ کے مال کو اس طرح نگلتے تھے جیسا کہ اونٹ موسم بہار میں گھاس چرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا کہ جب اس کے سارے بل نکل گئے اور بد کرداریوں نے اسے اس کے انجام تک پہنچا دیا اور شکم خوری نے اوندھے منہ گرا دیا''

آپ نے بہت مختصر الفاظ میں سمجھا دیا کہ حضرت عثمان کو کیسے خلافت ملی اور پھر سیاسی ناکامیوں کے بعد ان سے قوت ارادی چھین لی گئی۔ اور ان کے اطراف میں موجود لوگ ان پر اتنے حاوی ہو گئے کہ انہیں صرف کھانے پینے تک محدود کر دیا اور خود فتنہ ڈالنے' فساد پھیلانے اور اللہ تعالیٰ کے مال کو

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۷۲۔

موسم بہار میں پائے جانے والے سبزے کی طرح سے چرنے لگے یہاں تک کہ لوگوں کے صبر کا پیانہ لبریز ہو گیا اور انہوں نے ان سب کے خلاف بغاوت کر دی۔ بالاخر وہ اپنی غیر عاقلانہ اور نادرست رفتار کی وجہ سے اپنے انجام کو پہنچے۔ تاہم مورخین دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے انہیں اس انجام سے ڈرایا تھا۔

کچھ مورخین نے انتہائی اختصار کے ساتھ حضرت عثمان و بنی امیہ کی نمایاں غلطیوں اور بدکرداریوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ لوگ لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان نے بنی امیہ کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دیا تھا اور تمام اسلامی مملکتیں اور ہر قسم کی آمدنی اور زکوۃ و خراج کی وصولیابی انہی لوگوں کے سپرد کر دی تھی۔ آرمینیہ کی مملکت انہی کے دور میں فتح ہوئی اور انہوں نے وہاں سے آیا ہوا پورا خمس مروان بن حکم کو بخش دیا۔ تاریخ ثبوت کے طور پر عبدالرحمٰن بن جنید جمحی کے اشعار بھی نقل کرتی ہے۔ خالد بن اسید کے بیٹے عبداللہ نے ان سے انعام و خلعت مانگا تو اسے چار لاکھ درہم عطا کئے۔ لیکن جو چیز سب سے زیادہ لوگوں کی توجہات کا مرکز اور مہاجر و انصار کی برہمی کا سبب بنی وہ یہ تھی کہ انہوں نے خلافت سنبھالتے ہی حکم بن عاص اور اس کی آل اولاد کی واپسی کا انتظام کیا۔ ان لوگوں کو جناب رسالتمآبؐ مدینہ سے نکال چکے تھے اور اس ضمن میں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کی شفاعت قبول نہ کی تھی۔ حضرت ابوبکر و عمر نے بھی آنحضورؐ کے اس حکم سے مخالفت کی جرات نہ کی تھی۔

حکم بن عاص محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آزار دیتا، ناسزا کہتا اور وہ کچھ کہہ گذرتا جو آنحضورؐ کی طبیعت پر گراں گذرتا۔ ایک دن جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے جا رہے تھے کہ حکم ان کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ کبھی آنحضورؐ کی نقلیں اتارتا اور کبھی تضحیک کی غرض سے آنکھ ناک ملا کر عجیب عجیب شکلیں بناتا۔ جب آنحضرتؐ نماز کے لئے قیام کرتے تو وہ پیچھے کھڑا ہو جاتا اور انگلیوں سے آپؐ کو نمایاں کرتا۔ ایک مرتبہ جبکہ وہ ناک و منہ سے آپؐ کی توہین کر رہا تھا کہ آپؐ نے اسے دیکھ لیا اور فرمایا کہ "اسی طرح

باقی رہ" چنانچہ اس کے بعد اس کی صورت مخزوں جیسی ہو گئی۔ یوں تو فتح مکہ کے دن وہ اور اس کے بیٹے اسلام لے آئے تھے اور بعد میں مدینہ آگئے تھے لیکن مسلمان ان لوگوں کے دین و ایمان میں طعن و تشنیع کرتے تھے۔ ایک دن آنحضورؐ ازواج میں سے کسی ایک کے زانو پر تھے کہ وہ نمودار ہو گیا۔ جناب رسالت مآبؐ چھڑی لے کر اس کے پیچھے بھاگے۔ آپؐ نے فرمایا'

"کون ہے جو مجھے اس بزدل کمینہ کے شر سے نجات دلائے۔ اگر وہ میرے ہاتھ لگے تو اس کی آنکھیں نکال لوں۔ معبود کی قسم وہ اور اس کی اولاد ہرگز میرے ساتھ ایک شہر میں نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ آنحضورؐ نے انہیں طائف میں بطن وج نامی جگہ بھجوا دیا جیسا کہ بلاذری انساب الاشراف میں لکھتے ہیں۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان کے دور خلافت کے آغاز تک یہ لوگ مدینہ سے باہر ہی رہے۔ جب حضرت عثمان نے انہیں واپس بلوایا تو مسلمانوں نے ان کے اس غلط اقدام پر کڑی نکتہ چینی کی۔ پھر جب حضرت عثمان کے دور خلافت میں اسے موت آگئی تو اس پر خیمہ لگایا گیا۔"

چنانچہ بلاذری عبدالرحمٰن بن حسان بن ثابت کے کچھ نصیحت آمیز اشعار نقل کرتا ہے جن میں شاعر نے حکم کے بیٹے مروان سے خطاب کیا تھا۔

استاد خطیب لکھتے ہیں کہ جب حضرت عثمان نے اسے مدینہ واپس بلایا تو مسلمانوں کی طرف سے ان پر شدید اعتراض ہوا۔ بالائے ستم یہ کہ انہوں نے اسے "قضاعہ" کی زکوۃ کی جمع آوری کا عہدہ دیا۔ جب وہاں سے جمع کی جانے والی زکوۃ تین لاکھ درہم تک پہنچ گئی تو خود اسے بخش دی۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن جناب رسالت مآبؐ نے اس کے خون کو مباح قرار دیا تھا اور پھر حضرت عثمان کی وساطت سے اس کی گلو خلاصی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود بھی اس نے آنحضورؐ کے خلاف سازش کی غرض سے مدینہ ہجرت کی تھی۔ چنانچہ اس ناشائستہ حرکت کے بعد جسے بیان کیا جا چکا ہے' آنحضورؐ نے اسے شہربدر کر دیا تھا۔ حضرت ابوبکر و عمر کے دور میں بھی عثمان نے وساطت کی بہت کوششیں کیں لیکن دونوں حضرات نے انہیں ماننے سے انکار کر دیا اور ان

سے صاف کہہ دیا کہ

"ہم کون ہوتے ہیں جو رسول اللہؐ کے نکالے ہوئے شخص کو واپس لائیں"[1]

ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں لکھتا ہے کہ جناب ختمی مرتبتؐ نے بازار مدینہ میں واقع "ہندون" نامی جگہ مسلمانوں کے نام کر دی تھی اور حضرت عثمان نے اسے چھین کر مروان کے بھائی حرث بن حکم کو بخش دیا۔ اسی طرح باغ فدک جو دختر گرامی رسولؐ جناب فاطمہ الزہراء علیہا السلام کا تھا' اسے مروان کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے مدینہ کے گرد و نواح کی چراگاہوں پر خود قبضہ کر کے اسے مسلمانوں کے مویشیوں کے لئے ممنوع کر دیا اور بنی امیہ کے مویشیوں کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔

اسی طرح مغربی افریقہ (طرابلس (TRIPOLITINE) سے طنبحہ تک) سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن ابی سرح کے قدموں میں ڈھیر کر دی اس کے بغیر کہ مسلمانوں میں سے کسی ایک کو بھی اس کے ساتھ شریک کریں جیسا کہ ابن ابی الحدید اور دوسرے مورخین لکھتے ہیں۔

عبداللہ بن سرح فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہو گیا تھا۔ اس نے مدینہ ہجرت کی اور کچھ عرصہ کاتب وحی بھی رہا۔ پھر شہر مکہ کی طرف پلٹ کر دوبارہ مشرک ہو گیا اور قریش کو جناب رسالت مآبؐ پر جھوٹ باندھنے کی داستانیں سنانے لگا۔ وہ ان سے کہا کرتا کہ'

"میں جس طرح محمدؐ کو چاہتا' چلاتا تھا۔ وہ مجھے قرآن سے عزیز حکیم لکھنے کے لئے کہتا میں کہتا کہ علیم حکیم لکھوا دیں۔ وہ جواب دیتا کہ دونوں صحیح ہیں۔ نیز وہ کافرین پر لعنت املاء کراتا اور میں اسے ظالمین کر دیتا۔ لہٰذا اگر وہ کچھ کہتا ہے تو میں بھی کہتا ہوں اور اس جیسے کلام کو لا سکتا ہوں"

"انساب الاشراف" میں مرقوم ہے کہ اس کے بارے میں یہ آیۂ مبارکہ

---

[1] علی بن ابی طالب (استاد خطیب)۔

نازل ہوئی۔

"ومن اظلم ممن افتری علی اللہ کذبا اوقال اوحی الی ولم یوح الیہ شی ومن قال سانزل مثل ما انزل اللہ ولو تری اذ الظالمون فی غمرات الموت و الملائکہ باسطوا ایدیھم اخرجوا انفسکم الیوم تجزون عذاب الھون بما کنتم تقولون علی اللہ غیر الحق و کنتم عن ایاتہ تستکبرون"[1]

"اور اس سے بڑھکر ظالم و ستم پیشہ کون ہو گا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے یا کہے کہ مجھ پر وحی کی گئی ہے حالانکہ وحی نام کی کوئی چیز بھی اس پر نہ آئی ہو یا دعویٰ کرے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے میں بھی اس جیسا کلام نازل کروں گا ------- اے کاش دیکھ سکتے جب ظالموں کا دم نکل رہا ہو گا۔ جب ملائکہ ان کی قبض روح کے لئے اپنا دست پر قہر و قدرت بڑھائیں گے (اور ان سے کہیں گے کہ) اپنی جانیں جسموں سے نکال پھینکو۔ آج کے دن تمہیں دردناک عذاب کا مزہ چکھایا جائے گا اس لئے کہ تم ناحق خدا پر جھوٹ باندھتے اور اس کی آیات کے سامنے غرور و تکبر دکھاتے تھے"

جب مکہ فتح ہوا تو عبداللہ بن سرح ان منجملہ افراد میں تھا جن کے خون کو رحمت عالمؐ نے مسلمانوں کے لئے مباح قرار دے دیا تھا۔ ادھر حضرت عثمان نے جناب رسالتمآبؐ کے حضور اپنے اس رضاعی بھائی کی معافی کی درخواست کی تاہم آنحضورؐ نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر جب انہوں نے اسے آنحضورؐ کی خدمت میں پیش کیا تو تین مرتبہ آنحضورؐ نے اس سے چہرے کو پھیر لیا۔ پھر حضرت عثمان کے مسلسل اصرار پر آپؐ نے صرف "ہاں" کہہ کر اسے معاف کر دیا لیکن مسلمانوں سے فرمایا'

"کیا تمہارے درمیان ایک بھی ایسا شخص نہ تھا جو اس کتے کا حساب صاف کر سکتا۔ میں اس لئے خاموش تھا کہ میرے امان دینے سے قبل تم میں سے کوئی اٹھ کر اس کی گردن اڑا دے"

---

[1] سورۃ انعام - ۹۳-

مسلمانوں میں سے جب کسی نے صفائی پیش کی کہ آنحضورؐ اشارہ کر دیتے تو آپؐ نے فرمایا،

"میں اشاروں سے قتل کے فرمان نہیں صادر کرتا اور انبیاء کبھی دزدیدہ نگاہیں نہیں رکھتے"[۵۱]

حضرت عثمان نے خلافت سنبھالتے ہی اسے مصر کا گورنر بنا دیا تھا۔ چنانچہ ۲۵ھ سے لے کر ۳۴ھ تک وہ بر سراقتدار رہا یہاں تک کہ محمد بن ابی حذیفہ نے اس کے خلاف بغاوت کی اور وہ عسقلان فرار کر گیا اور حضرت عثمان کے زوال تک وہیں مقیم رہا۔ کچھ راویوں کا کہنا ہے کہ اس کی موت افریقہ میں ہوئی۔ جناب رسالت مآبؐ نے اسے خدا اور رسولؐ کا دشمن قرار دیا تھا اور اس کے قتل کے احکامات جاری کئے تھے اگرچہ خانہ کعبہ کے پردوں میں آویزاں ہو جائے اور ان میں پناہ لے لے۔ حضور مقبولؐ کے اس فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تا ابد ایمان لانے والوں میں سے نہ تھا اگرچہ مسلمانوں کا رنگ و روپ ڈھال لیتا اور قدسیوں کا لباس پہن لیتا۔ اور جیسا کہ صادق و امین پیغمبرؐ نے اس کے بارے میں پیشن گوئی کی تھی وہ زندگی کے آخری سانس تک خدا اور رسولؐ کے سر سخت دشمنوں میں باقی رہا۔[۵۲]

ابن ابی الحدید خطبہ شقشقیہ کے فقروں کی تشریح کے ذیل میں لکھتا ہے کہ حضرت عثمان نے بیت المال سے اسے اسی دن دو لاکھ درہم دیئے جس دن ایک لاکھ مروان کے نام کر دیئے تھے۔ اس سے قبل انہوں نے اپنی بیٹی ام ابان مروان کی زوجیت میں دے دی تھی۔ چنانچہ بیت المال کے خزانچی زید بن ارقم چابیاں لئے ان کے پاس آئے اور رونے لگے۔

---

[۵۱] اگر کوئی عام لوگوں سے نظریں بچا کر کسی خاص شخص کو آنکھ مارے یا آنکھ سے کوئی اشارہ کرے تو اسے دزدیدہ نگاہ کہتے ہیں البتہ لغوی معنی کے اعتبار سے اس کا مفہوم مزید وسیع ہے "خائن آنکھیں" (خائنتہ الاعین)۔

[۵۲] انساب الاشراف، جلد اول صفحہ ۳۵۳۔
علی بن ابی طالب ۔ استاد عبدالکریم الخطیب ۔

حضرت عثمان نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ رشتوں کا پاس رکھنے اور صلہ رحم کرنے پر ان سے نالاں ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ '

"نہیں! لیکن مجھے اس بات پر رونا آتا ہے کہ میرے خیال میں آپ بیت المال سے اس تمام بذل بخشش کا حساب چکانا چاہتے ہیں جو آپ نے جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دور میں فی سبیل اللہ کی تھیں۔ خدا کی قسم جو ایک لاکھ درہم آپ نے مروان کے نام کئے ہیں وہ اس کے لئے بہت زیادہ ہیں"

حضرت عثمان نے کہا کہ '

"اے ارقم کے بیٹے! چابیاں ڈال جاؤ ہم تمہارے علاوہ کسی اور کو ڈھونڈ لیں گے"

ابو موسیٰ نے عراق سے انہیں بہت سا مال و دولت لا کر دیا تو انہوں نے اس سب کو بنی امیہ کے درمیان بانٹ دیا۔ اسی طرح حکم کے بیٹے حرث کی شادی اپنی بیٹی عائشہ سے کر دی اور زید بن ارقم کو بیت المال سے نکالنے کے بعد ایک لاکھ درہم دیئے۔

یوں امت مسلمہ کا مقدر بنی امیہ کے پیرو جوان کے ہاتھوں میں آگیا۔ وہ حساب کتاب اور روک ٹوک کے بغیر اس سے کھیل کھیلنے لگے۔ مدینہ میں مروان بن حکم' اس کے بچوں اور بھائیوں کا راج تھا۔ تمام امور انہی کے ہاتھوں میں تھے اور اندرونی و بیرونی احکامات بھی یہی لوگ صادر کرتے تھے۔ شام معاویہ کے زیر سایہ تھا اور ابن ابی سرح کہ جس کے بارے میں قہر آمیز آیۂ مبارکہ نازل ہوئی مصر کا گورنر تھا۔ اور کوفہ کہ جہاں خلافت کی ابتداء سے لے کر اب تک حضرت عمار بن یاسر' ابن مسعود اور سلمان فارسی جیسے جلیل القدر صحابہ رہ چکے تھے اور آخر میں سعد بن ابی وقاص تھے۔ حضرت عثمان نے انہیں معزول کر کے ولید بن عقبہ کو والی کوفہ بنا دیا تھا۔ وہی ولید کہ وہ اور اس کے بھائی بہن "آگ کے بچوں" کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ ہم نے ان کے اس نام سے مشہور ہو جانے کے مصدر و ماخذ کو اپنی

کتاب "سیرۃ المصطفیٰ" میں ذکر کیا ہے۔ عقبہ بن ابی معیط کی بنت کریز سے شادی کے نتیجہ میں چار بچے وجود میں آئے تھے۔ ولید' خالد' عمارہ اور ام کلثوم عقبہ کے بعد ولید کی ماں اروئی نے عفان سے شادی کی جس سے حضرت عثمان پیدا ہوئے تھے۔

عقبہ بن ابی معیط مکہ میں جناب ختمی مرتبتؐ کا ہمسایہ تھا۔ وہ بسا اوقات آپؐ کے ساتھ رہتا اور نشست و برخاست کرتا۔ چنانچہ بعثت کے ابتدائی سالوں ہی میں وہ مسلمان ہو گیا تھا۔

اس کے اسلام لانے کے سبب میں بتایا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے کھانے کا اہتمام کیا اور جناب رسالت مآبؐ کو اس کی دعوت دی۔ آنحضورؐ نے دعوت قبول کرنے سے انکار کیا۔ مگر یہ کہ عقبہ شہادتین زبان پر جاری کر دے۔ پھر جب اس نے شہادتین جاری کی تو آنحضورؐ نے اس کے یہاں کھانا تناول فرمایا۔ جب قریش کو معلوم ہوا کہ عقبہ مسلمان ہو گیا ہے تو انہوں کہا کہ "عقبہ بچہ بن گیا ہے"

اس کا ایک دوست تھا جو ان دنوں مکہ سے باہر تھا۔ جب وہ واپس آیا اور اسے عقبہ کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے عقبہ سے ترک رفاقت کر لی۔ چنانچہ جب عقبہ اس کے پاس آیا اور سلام کیا تو اس نے سلام لینے سے انکار کیا اور جب عقبہ نے بہت اصرار کیا تو اس نے کہا کہ'

"میں تمہارے سلام کا جواب نہیں دے سکتا اس لئے کہ تم بچہ بن گئے ہو"

عقبہ نے اس سے پوچھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے جو قریش کے دل میں ٹھنڈک پڑ جائے۔ اس نے کہا کہ'

"اس (پیغمبرؐ) کے پاس جاؤ' اس کے چہرے پر تھوکو اور جو سب سے بری ناسزا آتی ہو کہہ ڈالو"

عقبہ نے سرور عالمؐ کے ساتھ یہی کچھ کیا۔ رحمت عالمؐ نے چہرہ انور کو صاف کرنے کے علاوہ کچھ نہ کیا۔ پھر عقبہ کی طرف توجہ کر کے فرمایا'

"اگر میں نے مکہ سے باہر تمہیں دیکھا تو تمہاری گردن اڑا دوں گا"

عقبہ اسلام کی مخالفت اور پیغمبر اسلام کو ایذا رسانی کی اس پالیسی پر بدستور گامزن رہا اور اس حد تک آگے بڑھا کہ گند اور کوڑا کرکٹ لاکر آنحضورؐ کے دروازے پر ڈھیر کر دیتا۔ اس کے بارے میں یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی،

"یوم یعض الظالم علی یدیہ یقول یالیتنی اتخذت مع الرسول سبیلا" یالیتنی لم اتخذ فلانا خلیلا" لقد اضلنی عن الذکر بعد اذ جائنی و کان الشیطان للانسان خذولا"[1]

"وہ دن کہ جب وہ ستم گر کف افسوس ملتا رہ جائے گا اور کہے گا کہ اے کاش میں رسولؐ سے دوستی و مصاحبت کی کوئی راہ نکال لیتا۔ اے کاش میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا۔ اس نے ذکر (قرآن و سنت) کے مل جانے کے بعد بھی مجھے ان سے غافل و گمراہ کر دیا اور شیطان ہمیشہ سے انسان کی رسوائی کا سامان کرتا ہے"

بلاذری لکھتا ہے کہ جناب رسالتمآبؐ جب مدینہ ہجرت کر گئے تو عقبہ بن ابی معیط نے ان سے خطاب کرتے ہوئے کچھ اشعار کہے (جنکا مفہوم یہ ہے)

"اے کٹے ہوئے کان کی اونٹنی پر ہجرت کرنے والے! تم بہت جلد دیکھو گے کہ میرے نیزے کی انی تمہارے جسم میں ہو گی اور میری تلوار تمہارا حساب صاف کر دے گی"

جنگ بدر میں بھی وہ مشرکین کی طرف سے لڑا اور مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر کر لیا گیا۔ پھر جب تمام جنگی قیدیوں میں سے جناب رسالتمآبؐ نے صرف اسے قتل کر دینے کا حکم دیا تو اس نے کہا کہ،

"یا رسول اللہؐ میرے بچوں کی کون دیکھ بھال کرے گا؟"

---

[1] سورۃ فرقان ۲۹-۲۷-

آنحضورؐ نے جواب میں فرمایا کہ ''جہنم کی آگ''۔ چنانچہ اسی وقت سے اس کے بچے آگ کے بچوں کے نام سے مشہور ہو گئے۔

تاہم خود ''انساب الاشراف'' میں عامر شعبی سے روایت ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہونے کے بعد رحمت عالمؐ نے اس سے فرمایا کہ ''خدا کی قسم میں تجھے ضرور قتل کروں گا''۔ جب آنحضورؐ سے سوال کیا گیا کہ کیا تمام جنگی قیدیوں میں سے صرف اسے قتل کریں گے تو آپؐ نے فرمایا کہ،

''ہاں! اس لئے کہ اس کی اللہ تعالیٰ سے دشمنی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اس نے سجدے کی حالت میں پاؤں رکھ کر میری گردن دبائی اور اس وقت ہٹائی جب میں خیال کرنے لگا تھا کہ میری آنکھیں باہر نکل آئیں گی۔ اسی طرح ایک اور دن جبکہ میں سجدہ میں تھا اس نے بکری کی مینگنیاں لا کر میرے سر پر ڈھیر کر دی تھیں۔''

عقبہ کا بیٹا ولید جو حضرت عثمان کا سوتیلا بھائی ہوتا تھا (ماں کی طرف سے) پہلے پہل باپ کے زیر اثر رہا اور پھر بنی امیہ کے دامن میں پلا بڑھا۔ چنانچہ اس کے جسم میں بھی وہی پلید روح نفوذ کر گئی تھی کہ خود عربوں کے درمیان میں بھی اس کی کوئی نظیر نہ تھی۔ وہ ابو سفیان کی طرح کے ان آزاد رو لوگوں میں سے تھا جو فتح مکہ کے دن طوعاً" و کرہاً" اسلام لائے تھے۔ اور اس کے باوجود کہ جناب ختمی مرتبتؐ ان سے مشفقانہ سلوک کرتے اور بہت سے معاملات میں اس لئے نرمی برتتے کہ شاید اس طرح اسلام کے بارے میں پائی جانے والی ان کی دلی کدورتیں اور نفرتیں کم ہو جائیں لیکن یہ لوگ اسلام سے بیزاری کے اظہار کے لئے ہر وقت فرصت کی تلاش میں رہتے۔

(مشہور مورخ) ابن اثیر عبداللہ بن زبیر کے اس مقولہ کو لکھتا ہے کہ،

''میں جنگ یرموک میں موجود تھا۔ اس وقت میں کم سن تھا اس لئے لڑائی میں حصہ نہ لے سکتا تھا۔ جب محاذ آرائی شروع ہوئی اور تلواریں چلنے لگیں تو اچانک میری نگاہ کچھ لوگوں پر پڑی جنہوں نے جنگ سے ہاتھ روکا ہوا تھا۔ میں سوار ہو کر ان کے پاس پہنچا تو مڈبھیڑ ابو سفیان اور قریش کے ان سرشناس

چہروں سے ہوئی جو فتح مکہ کے دن ہی اسلام لائے تھے۔ انہوں نے بچہ سمجھ کر میرا خیال نہ کیا۔ معبود کی قسم جب روم کی فوجیں مسلمانوں پر حاوی ہونے لگتیں تو وہ ''بنی الاصفر زندہ باد'' کے نعرے لگاتے[۱]۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے روم کی فوجوں کو رسوا کیا اور میں نے والد ماجد کو یہ ماجرا سنایا تو وہ مسکرانے لگے۔'' انہوں نے کہا کہ،

''خدا انہیں موت دے! صرف دلی کدورتوں اور کینوں کے باعث انہوں نے جنگ سے ہاتھ روکا ہوا تھا۔ خدا کی قسم ہم ان کے حق میں رومیوں سے بہتر ہیں''

ایک مرتبہ جناب رسالت مآبؐ نے ولید بن عقبہ کو زکوۃ و صدقات وصول کرنے قبیلہ بنی المصطلق کے پاس بھیجا تو اس نے مدینہ آکر ان پر جھوٹا الزام لگایا کہ وہ دوبارہ کفر اختیار کر کے مرتد ہو گئے ہیں۔ جناب رسالت مآبؐ نے حقیقت حال معلوم کرنے اور زکوۃ کی وصولیابی میں تعاون کی غرض سے مسلمانوں کا ایک سریہ بنی المصطلق کے پاس بھیجا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ اسی طرح اسلام پر باقی ہیں جس طرح آنحضورؐ چھوڑ کر گئے تھے۔ لہٰذا محدثین دعویٰ کرتے ہیں کہ اسی مناسبت سے یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی،

"یایھا الذین آمنوا ان جاء کم فاسق بنباء فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالہ فتصبحوا علی مافعلتم نادمین"[۲] ''اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی اچھی طرح چھان بین کرو تاکہ یہ نہ ہو کہ تم لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال دو اور بعد میں تمہیں اپنے کیے پر نادم و پشیمان ہونا پڑے''

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ولید اور اس سے ملتے جلتے اموی خاندان کے لوگوں ہی نے حضرت عثمان کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ انہوں نے

---

[۱] اس زمانہ میں عرب اہل یورپ کو اسی نام سے پہچانتے تھے۔
[۲] سورۂ الحجرات آیۂ نمبر ۶۔

خلافت عثمانیہ کو صرف اپنے مفادات کی پاسداری تک محدود کر دیا تھا۔ یوں تو حضرت عثمان کے دور خلافت کے ابتدائی دو سالوں تک سعد بن ابی وقاص کوفہ کے گورنر تھے لیکن اس کے بعد ولید بن عقبہ کو یہ عہدہ دے دیا گیا۔ اس لئے کہ وہ ولید کہ جسے بارگاہ رب العزت سے "فاسق" کہا گیا تھا اس کی نظریں کوفہ کی امارت پر جمی ہوئی تھیں۔ چنانچہ وہ اس وقت تک اپنے سوتیلے بھائی کی منتیں سماجتیں کرتا رہا جب تک کہ حضرت عثمان نے سعد کو ہٹا کر اسے کوفہ کا گورنر نہ بنا دیا۔

(مشہور عالم کتاب) "الاغانی" کے مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان کے تخت پر صرف عباس بن عبد المطلب، ابو سفیان بن حرب' ولید بن عقبہ اور رسول اللہ ؐ کا نکالا ہوا شخص' حکم بن عاص جلوہ افروز ہو سکتے تھے۔ ایک دن ولید حضرت عثمان کے پاس آیا اور بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد حکم بن عاص آیا تو حضرت عثمان اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور بڑے پر تپاک انداز سے اسے اپنی جگہ بٹھایا۔ پھر جب وہ چلا گیا تو ولید نے حضرت عثمان سے کہا کہ اس نے جب انہیں حکم کی آؤ بھگت کرتے دیکھا تو بے ساختہ دو شعر کہے تھے۔ حضرت عثمان نے کہا کہ وہ قریش کا بزرگ ہے تاہم وہ شعر سناؤ۔ ولید نے کہا (جن کا مفہوم یہ ہے کہ)

"میں نے ایک شخص کی اس کے چچا سے گرما گرم دوستی و الفت دیکھی جبکہ اس کے چھوٹے بھائی کو نظر انداز کیا گیا تھا تو میرے دل میں یہ امید پروان چڑھی کہ عمرو خالد (حضرت عثمان کے بچے) بڑے ہوں اور میری عزت و احترام کریں"

ابھی کچھ دن نہ گذرے تھے کہ حضرت عثمان نے سعد بن ابی وقاص کو برطرف کر کے اسے والی کوفہ بنا دیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ جب وہ اس فرمان کو لئے کوفہ پہنچا اور سعد سے ملا تو سعد نے یہ جملہ کہا کہ'

"خدا کی قسم سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا تم ہمارے بعد ذہین و ہوشیار ہو گئے ہو یا ہم تمہارے بعد احمق بن گئے ہیں"

سعد نے اس لئے یہ جملہ کہا کیونکہ ولید مسلمانوں کے درمیان دین کی تضحیک کرنے اور دینی قدروں کی بے حرمتی کرنے میں خاصا مشہور ہو چکا تھا اور عام لوگ اسے فاسق کہا کرتے تھے۔

ولید نے سعد کے جواب میں کہا کہ "اے ابو اسحاق پریشان نہ ہو۔ سلطنت چیز ہی ایسی ہے۔ کچھ لوگوں کا ظہرانہ ہوتی ہے تو کچھ کا عشائیہ"

مسلمانو کی نگاہ میں سعد بن ابی وقاص جیسے صحابی کو ہٹا کر ولید جیسے فاسق و فاجر کو لانا جو کہ اکثر اوقات نشہ میں مست رہتا تھا' ایک ایسا سانحہ تھا جس پر خاموشی گناہ کے مترادف تھی۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ اہل کوفہ اس کے فسق و فجور سے اچھی طرح واقف تھے۔

یعقوبی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ ایک دن ولید نے کوفہ میں صبح کی نماز چار رکعت پڑھائی پھر محراب عبادت سے نکل کر نمازیوں کی طرف رخ کیا اور پوچھا کہ اگر وہ چاہیں تو وہ مزید نماز پڑھا دے!

اسی طرح ایک دن وہ مسجد میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ایک جادوگر بساط جمائے عجیب و غریب کرتب دکھانے میں مصروف تھا۔ نزدیک تھا کہ لوگ اس سے متاثر ہوتے اوران کے عقیدوں میں فتور آتا کہ قبیلہ ازد کے ایک مرد مومن نے تلوار نکال کر اس کا سر قلم کر دیا۔ اور ولید کے گوش زد کر دیا کہ اگر وہ ان چیزوں کو صحیح سمجھتا ہے تو اپنے تک ہی محدود رکھے۔ ولید آگ بگولا ہو گیا۔ وہ جادوگر کے انتقام کے طور پر جندب بن کعب نامی اس مرد مومن کو قتل کرنا چاہتا تھا کہ اس کے قبیلہ والے اس کام میں حائل ہوگئے۔ چنانچہ ولید نے اسے قید خانہ میں ڈال دیا۔ قید خانہ کے دربان نے جب اسے صبح شام عبادت کرتے دیکھا تو آزاد کر دیا۔ وہ مدینہ فرار کر گیا اور وہاں جا کر اس نے مدینہ کے لوگوں کو والئی کوفہ کی حرکتوں سے باخبر کیا۔ ادھر ولید نے اس دربان کے دو سو کوڑے رسید کئے اس لئے کہ وہ خدا کے ایک نیک بندے کو آزاد کرنے کے جرم کا مرتکب ہوا تھا۔

بہرحال اہل کوفہ ولید کے شر سے عذاب میں تھے۔ انہوں نے اس کے

بارے میں حضرت عثمان کو بھی تفصیل سے لکھا لیکن انہوں نے ولید کو برطرف کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر میں بھی جب مسلسل وفود کی آمد و رفت سے ولید کی کارستانیوں کا چرچا تمام عالم اسلام میں ہو گیا تو انہوں نے اسے ہٹا کر سعید بن عاص نامی ایک اور اموی کو اس کی جگہ مقرر کر دیا۔ بعد میں بھی ولید کو کلب اور بلقین کے علاقوں سے زکوۃ جمع کرنے بھیجا۔ اس چیز کو تاریخ یعقوبی اور تاریخ کی دوسری معتبر کتابیں رقم کرتی ہیں[له]۔

معاویہ شام میں حضرت عثمان کا گورنر تھا۔ اس کے بھائی یزید بن ابی سفیان کے بعد حضرت عمر نے اسے شام کا والی بنا دیا تھا۔

شاید ان تمام مذکورہ لوگوں میں اسلام کے بارے میں ناپاک عزائم کے لحاظ سے وہ سب سے زیادہ برا تھا۔ حالانکہ لوگوں کے ساتھ سیاست میں بہت نرم خو تھا۔ اس کی زکاوت و ہوشیاری نے اسے لوگوں سے وسعت قلبی دکھانے اور زیادہ تر شکیبائی سے کام لینے کی راہ دکھائی تھی اس لئے کہ یہ روش اسے لوگوں کے قریب کر دیتی اور اقتدار و سلطنت کو اس کے لئے ممکن بنا دیتی۔ پھر جب مال و دولت کے ضیاع اور پیسہ کے بل بوتے پر حمایتی اکٹھا کرنے پر اس کی تنقید کی جاتی تو وہ کہتا کہ

"بے شک یہ خدا کی زمین ہے اور ہم زمین پر اس کے خلیفہ ہیں۔ پس اگر ہم نے اس میں سے کچھ لیا تو ہمارا حق تھا اور اگر کچھ چھوڑ دیا تو ہمارے لئے جائز ہے۔"

خاندانی خصلتوں کے علاوہ معاویہ نے اپنے باپ ابو سفیان اور ماں ہند کی اکثر عادات و اطوار ورثہ میں لی تھیں۔ وہ عورت کہ سنگدلی' انانیت اور درندگی میں عورتوں کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان خصلتوں کی نمایاں مثال اقتدار طلبی تھی چاہے جس طرح اور جس طریقہ سے بھی حاصل ہو اور جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت عثمان کے دور خلافت میں اسے اپنے اور اپنے

له رجوع کریں تاریخ یعقوبی جلد دوم صفحہ ۱۶۲ (مطبوعہ نجف)۔

خاندان کے مفادات کے تحفظ کا بھرپور موقعہ ملا۔ وہی خاندان جس کے بچوں نے اسلامی تاریخ کے اس حصہ میں اس کے لئے خوشیوں اور مسرتوں کا پیغام دیا تھا۔

ایک طرف یہ لوگ تھے اور دوسری طرف عام مسلمان اور بلند منزلت صحابہ کرام تھے جو بڑی نگرانی اور غم وغصہ سے حضرت عثمان اور ان کے گورنروں کی بدکرداریوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ لوگ جب بھی ان افراد کے برے کاموں پر منہ کھولتے یا ان برائیوں کو حد میں رکھنے کی کوشش کرتے تو ضرب و شتم کی زد میں آجاتے اور بسا اوقات انہیں شہربدر بھی کر دیا جاتا۔

تاریخ یعقوبی اور دوسری معتبر تاریخیں اس ضمن میں لکھتی ہیں کہ جب حضرت عثمان نے قریش کے بزرگوں میں سے زید بن ثابت' عبداللہ بن زبیر' سعید بن عاص اور عبدالرحمٰن بن حرث کو قرآن کریم کی تدوین و جمع آوری پر مامور کیا اور یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا تو انہوں نے اس کے تیار شدہ نسخے اسلامی حکومت کے تمام شہروں اور ریاستوں میں بھجوائے اور گورنروں کو حکم دے دیا کہ جو نسخے لوگوں کے پاس پہلے سے موجود ہیں انہیں جمع کر کے نذر آتش کر دیا جائے۔

مورخین لکھتے ہیں کہ گورنروں نے اس حکم کی تعمیل میں بڑی پھرتی دکھائی چنانچہ جب عبداللہ بن مسعود نے اپنے نسخہ خاص کو اس علاقہ کے گورنر کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا تو عبداللہ بن عامر نے خط لکھ کر حضرت عثمان کو اس بات کی گذارش دی۔ حضرت عثمان نے جواب میں لکھا کہ اسے فوراً مدینہ بھیجا جائے۔ دراصل یہ مروان بن حکم اور اس کے مشیر تھے۔ جو حضرت عثمان کو تشدد کی سیاست پر عمل پیرا ہونے اور ان کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز اور ہر حرکت کو کچلنے کا مشورہ دیتے تھے۔

جب عبداللہ بن عامر کے پاس خلیفہ کا جواب پہنچا تو اس نے ابن مسعود کو رسیوں میں باندھ کر مدینہ روانہ کر دیا۔ جب ابن مسعود مدینہ پہنچے اور حضرت عثمان کی خدمت میں لائے گئے تو وہ مسجد نبویؐ میں لوگوں سے مصروف گفتگو

تھے۔ انہوں نے ابن مسعود کو دیکھ کر لوگوں کو بتایا کہ ان کے پاس ایک برا جانور آیا ہے۔ پھر خادموں کو اشارہ کیا کہ انہیں کوڑے ماریں اور پیر سے گھسیٹتے ہوئے مسجد سے باہر پھینک دیں۔ خادموں نے ایسا ہی کیا اور ان کی پسلیوں میں سے ایک پسلی بھی توڑ دی۔ مزید یہ کہ حضرت عثمان نے بیت المال سے انہیں ملنے والا وظیفہ بھی منقطع کر دیا۔ مسلمانوں نے صحابہ کرام میں سے ایک بلند مرتبت صحابی کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرنے پر حضرت عثمان کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہ بھی اتنی برہم ہوئیں کہ انہوں نے حضرت عثمان اور ان کے وزراء کی مذمت میں اپنی زبان کو آزاد چھوڑ دیا۔

ابن مسعود اپنے گھر کی طرف چل دیئے جبکہ درد نے انہیں عاجز و ناتواں کر دیا تھا اور بڑھاپے کے مارے نحیف جسم پر لگنے والے زخموں اور ضربوں نے ان کی کمر توڑ دی تھی اور جان لب پر آگئی تھی۔ وہ اسی درد و غم کو سہتے سہتے بیمار پڑ گئے اور بیماری بھی یہاں تک پہنچی کہ اطباء نے انکے وارثوں کو جواب دے دیا۔ حضرت عثمان نے جو یہ سنا تو ڈر کے مارے فوراً ان کی عیادت کے لئے گئے۔ انہوں نے جاتے ہی ابن مسعود کو مورد الزام ٹھہرانا شروع کیا اور کہا کہ "میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے"

ابن مسعود نے جواب دیا کہ تم نے اپنے خادموں کو جو حکم دیا اس کے بعد انہوں نے میرا وہ حشر کیا کہ پسلیاں توڑ دیں اور یہ خال کر دیا کہ میں ظہر و عصر کے درمیان فرق نہیں کر سکتا اور ان کے اوقات کی شناسائی نہیں کر سکتا۔ اور میرا جو بھی حال بنا وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔

حضرت عثمان نے جو کہ بظاہر ان کی دلجوئی اور اپنی گذشتہ غلطیوں کی تلافی کے لئے آئے تھے' ان سے کہا کہ'

"اے ابو عبد الرحمٰن تمہیں کس سے شکایت ہے۔۔۔۔؟"

انہوں نے حضرت عثمان سے منہ پھیر کر اطمینان سے جواب دیا کہ'

"اگر گلہ ہے تو صرف اپنے گناہوں کا اور اگر امید ہے تو صرف اللہ جل

شانہ کی رحمت و مغفرت سے"

حضرت عثمان نے ان سے پوچھا کہ کیا ان کے لئے ڈاکٹر کا انتظام کر دیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ڈاکٹر ہی نے تو انہیں بیمار کیا ہے۔ حضرت عثمان مسلسل اس کدو کاوش میں لگے ہوئے تھے کہ اپنی غلطیوں کا ازالہ کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ تک کہا کہ'

"میں خود کو تمہارے حوالہ کرتا ہوں جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا وہی تم بھی میرے ساتھ کرو"

انہوں نے کہا کہ'

"میں اس مسئلہ کو اس ذات اقدس کی صوابدید پر چھوڑتا ہوں جس کی سزا بھیانک اور جس کا عذاب بہت دردناک ہے۔ پھر میں کون ہوتا ہوں کہ خلفاء سے انتقام لینے میں پہل کروں"

حضرت عثمان نے ان سے پوچھا کہ آیا وہ ان کے لئے بذل و بخشش کا انتظام کریں۔ ابن مسعود نے جواب دیا کہ'

"تم نے اس دن اس سے محروم رکھا جب مجھے اس کی اشد ضرورت تھی اور آج دے رہے ہو جب میں اس سے بے نیاز ہوں"

حضرت عثمان نے کہا کہ ان کے بچوں کے کام آئے گا۔انہوں نے بڑے اعتماد بھرے لہجہ میں' گویا کہ صابروں کو دیئے گئے وعدہ ربوبی پر انہیں پورا یقین تھا' کہا کہ

"جس نے میری اولاد کو خلق کیا ہے وہ انہیں روزی بھی دے گا اور تم اور تم جیسوں سے بے نیاز بھی کر دے 'گا"

آخر میں حضرت عثمان نے ان سے اپنے کئے کی معافی چاہی لیکن انہوں نے معاف نہ کیا اور پروردگار سے چاہا کہ وہ ان کا انتقام لے چنانچہ حضرت عثمان ان کے پاس سے مایوس و ناکام واپس آگئے۔

ابن مسعود انہی زخموں کو برداشت کرتے رہے یہاں تک کہ زخموں کی تاب نہ لاکر خالق حقیقی سے جا ملے۔ کچھ روایتوں کے مطابق حضرت عمار بن یاسر نے اس وقت جبکہ خلیفہ مدینہ میں موجود نہ تھے، ان کی نماز پڑھائی اور پھر دفن کر دیا۔ جبکہ دوسری روایتوں میں آیا ہے کہ خود ابن مسعود وصیت کر گئے تھے کہ حضرت عثمان ان کے جنازے میں شریک نہ ہوں۔ ان کے بعد مقداد بن اسود کی وفات ہوئی اور حضرت عمار ہی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ چنانچہ جب حضرت عثمان کو ان دو افراد کی وفات کی خبر پہنچی اور یہ کہ حضرت عمار نے ان پر نماز پڑھائی ہے تو وہ حضرت عمار پر غصہ کرنے اور یہ کہنے لگے کہ،

"سوداء کے بیٹے پر آہ پڑے اے کاش میں ان لوگوں کی موت سے واقف ہوتا!!!"

پھر جب حضرت عمار کو بلوا کر اس پردہ پوشی کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ،

"انہوں نے مجھ سے عہد لیا تھا کہ نہ ان کے مرنے کی خبر آپ کو دوں اور نہ آپ ان پر نماز پڑھیں"[1]

چنانچہ حضرت عثمان ہر اس شخص کی درگت بنا دیتے تھے جو ان کے گورنروں یا رشتہ داروں میں سے کسی کی شکایت کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی انہیں نصیحت بھی کرنا چاہتا یا ان کی بہتری کی بات کرتا تو مروان کے اشاروں پر اس کا حشر بگاڑ دیا جاتا۔ اس لئے کہ اگر وہ واقعی ان مشوروں پر کان دھر لیتے تو پھر مروان اور اس جیسے لوگ برطرف کر دیئے جاتے۔

جب مدینہ منورہ کے مسلمانوں کو یہ احساس ہو گیا کہ حضرت عثمان کے گورنر اور بنی امیہ کے لوگ کسی کی عزت و آبرو کا خیال نہیں کرتے اور حالات بگڑتے ہی چلے جا رہے ہیں تو ان میں ایک گروہ تشکیل پایا۔ اس گروہ نے اس

---

[1] انساب الاشراف، شرح نہج البلاغہ جلد اول۔

وقت کی صورتحال کا بھرپور جائزہ لیا کہ جس میں حضرت عثمان کے وزراء دین کی تضحیک اور کتاب و سنت کے احکامات کی کھلی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ بہرحال کافی بحث و گفتگو کے بعد طے پایا کہ حضرت عثمان کو ایک تفصیلی و مدلل خط لکھا جائے جس میں ان تمام موارد کی نشاندہی اس طرح کی جائے کہ کسی قسم کے شک و تردید کی گنجائش باقی نہ رہے۔

انہوں نے اس خط کو حضرت عمار بن یاسر کے ہاتھ بھجوایا۔ خلیفہ نے حضرت عمار بن یاسر سے خط لیا اور اس کا ایک حصہ پڑھنے کے بعد ان سے پوچھا کہ وہ تمام لوگ کہاں ہیں جن کے اس خط میں دستخط موجود ہیں۔ حضرت عمار نے کہا کہ وہ آپ کے ڈر سے فرار کر گئے ہیں۔ حضرت عثمان نے کہا کہ اور ان میں سے صرف تم نے میرے خلاف اتنی جرات کر لی۔ حضرت عمار نے کہا "اس لئے کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں"

حضرت عثمان نے تردید کرتے ہوئے کہا کہ سمیہ کے بیٹے تم جھوٹ بولتے ہو

حضرت عمار نے کہا کہ "خدا کی قسم میں سمیہ کا بیٹا ہوں اور یاسر میرے والد تھے"

ان کا یہ جواب سن کر حضرت عثمان آگ بگولا ہو گئے۔ اتفاقاً اس وقت ان کے ساتھ مروان بھی موجود تھا۔ اس نے کہا اس سیاہ فام غلام نے لوگوں کو آپ کے خلاف ورغلایا ہے۔ اگر آپ اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیں گے تو باقی لوگ آپ سے خوفزدہ ہو جائیں گے۔

حضرت عثمان نے اس کی رائے پسند کی اور چھڑی لے کر حضرت عمار بن یاسر کو مارنا شروع کیا۔ پھر نوکروں کو اشارہ کیا اور انہوں نے آکر حضرت عمار کو اٹھا کر دے مارا۔ پھر حضرت عثمان کھڑے ہوئے اور انہیں کھینچ کر لات ماری جو ان کی شرمگاہ پر لگی جس کے باعث وہ بے ہوش ہو گئے۔ اور اسی بے ہوشی کے عالم میں انہیں باہر راستہ میں پھینک دیا گیا۔

کچھ مسلمان راستہ سے گذر رہے تھے کہ انہوں نے حضرت عمار کو اس

بے ہوشی کے عالم میں دیکھا۔ وہ فوراً انہیں اٹھا کر حضرت ام سلمہ (زوجہ جناب رسول اکرمؐ) کے گھر لے گئے۔ رات تک یہی بے ہوشی کا عالم چھایا رہا اور پھر ہوش میں آکر انہوں نے اپنی نمازیں قضا کیں۔ اس سانحہ کے بعد حضرت ام سلمہ نے بھی حضرت عثمان پر تنقید کی اور حضرت عائشہ نے ان پر الزام لگایا کہ ابھی آنحضورؐ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا کہ عثمان ان کی سنت کو بوسیدہ کئے دے رہا ہے۔

ان صبر آزما لمحوں میں حضرت عمار کے دل میں وہ درد بھری داستان تازہ ہو گئی جو قریش کے جاگیرداروں اور ستم پیشہ لوگوں سے وابستہ تھی۔ انہوں نے کہا کہ

"یہ پہلا دن نہیں ہے کہ مجھے راہ خدا میں آزار دیا گیا ہے"

حضرت عثمان کی اس ناشائستہ حرکت پر مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس لئے کہ وہ اکثر و بیشتر جناب رسالت مآبؐ سے سنتے رہے تھے کہ

"عمار انہیں جنت کی طرف بلا رہے ہیں اور وہ لوگ اسے دوزخ کی دعوت دے رہے ہیں"

"جس نے عمار کو غصہ دلایا اس نے اللہ تعالیٰ کو غضبناک کیا"

"عمار سر سے پاؤں تک ایمان میں ڈوبے ہوئے ہیں"

"عمار کو مبارک ہو کہ انہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا اور وہ حق کے ساتھ ہیں اور حق ان کے ساتھ ہے جہاں بھی چلے جائیں اور جس سمت بھی مڑ جائیں"

یہ اور نہ جانے کتنی احادیث نبویؐ لوگوں کو حضرت عمار بن یاسر اور حضرت یاسر کے خاندان کے بارے میں ازبر ہو گئیں تھیں۔ انہوں نے خلیفہ کی اس بدسلوکی کو خدا اور رسولؐ سے دشمنی اور اس عدالت سے محاذ آرائی کے مترادف سمجھا کہ آنحضرتؐ کی رسالت و تعلیمات پر عمل کرنے والے صحابہ اس

کی حمایت کرتے تھے۔ مخصوصا" وہ صحابہ کرام کہ جنہوں نے اسلام کے ابتدائی سالوں میں جناب ختمی مرتبتؐ کا ساتھ دیا تھا اور اسلام کی راہ میں کٹھن مشکلات اٹھائی تھیں۔

اس سانحہ کے بعد حضرت عمار کے ہم پیمان قبیلہ بنی مخزوم کے ایک شخص ہشام بن ولید مغیرہ کے خاندانی و قبائلی جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ چنانچہ وہ حضرت عثمان کے پاس پہنچا اور کہنے لگا کہ

"تم علیؑ سے ڈر گئے اور ہم پر تمہارا زور چل گیا اور تم نے ہمارے ایک بھائی پر اتنا تشدد کیا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گئے۔ خدا کی قسم اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں بدلہ میں بنی امیہ کے ایک نمایاں شخص کی جان لے لوں گا۔ حضرت عثمان نے کہا کہ تم تو قسری عورت کے بیٹے ہو"[1]

ایسا نہ تھا کہ حضرت عمار بن یاسر کے بارے میں حضرت عثمان نے پہلی مرتبہ یہ طرز عمل اپنایا ہو بلکہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زندگی میں بھی اس نوعیت کا ایک واقعہ پیش آچکا تھا۔

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مسجد نبویؐ کا سنگ بنیاد رکھ رہے تھے اور مسلمان ہمہ تن اس کی تعمیر میں مصروف تھے۔ حضرت علی علیہ السلام اس وقت کام کرتے اور یہ شعر زمزمہ کرتے جاتے کہ،

"لا یستوی من یعمر المساجدا

یداب فیھا قائما و قاعدا"

ومن یری عن الغبار حائدا""

"وہ لوگ جو مسجد نبویؐ کی تعمیر میں حصہ لے رہے ہیں اور اٹھتے بیٹھتے اس

---

[1] شرح نہج البلاغہ جلد اول صفحہ ۲۳۹۔

☆ زبردستی بنائی گئی بیوی کو قسری کہتے ہیں۔

کے کام میں شکیبائی اور ثابت قدمی دکھا رہے ہیں اور وہ لوگ جو دور سے بیٹھے گرد و خاک اڑتے دیکھ رہے ہیں' ہرگز برابر نہیں!"

حضرت عمار بن یاسر نے مولائے متقیانؑ سے اس شعر کو سیکھا اور آواز سے پڑھنے لگے۔ حضرت عثمان سمجھے کہ وہ ان پر طنز کر رہے ہیں۔ چنانچہ جیسا کہ سیرۂ ابن ہشام میں نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت عمارؓ سے کہا کہ

"اے سمیہ کے بیٹے میں نے تمہیں کچھ کہتے سنا ہے خدا کی قسم اس چھڑی سے تمہاری ناک پھوڑ دوں گا"

اس وقت ان کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس سے وہ کھیل رہے تھے۔

جناب رسالتمآبؐ نے جو ان کا یہ جملہ سنا تو فرمایا کہ'

"انہیں عمار سے کیا کام ہے وہ انہیں جنت کی طرف بلا رہا ہے اور وہ اسے جہنم کی طرف دھکیل رہے ہیں"

مسلمانوں نے حضرت عمار کے ساتھ پیش آنے والے اس حادثہ کو ان تمام حادثوں میں شامل کر لیا جو حضرت عثمان کے دور خلافت میں آئے دن رونما ہوتے رہتے تھے باوجودیکہ اصلاح کرنے والوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں تک کا احتساب کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ ان لوگوں نے حضرت عثمان کو خبردار کیا تھا کہ اگر وہ تشدد کی اس سیاست کو ترک نہ کریں گے تو لوگ ان کے خلاف بغاوت پر مجبور ہو جائیں گے۔

حضرت عمار بن یاسر اور وہ تمام لوگ کہ جنہوں نے باری تعالیٰ کی خوشنودی' انصاف و عدالت اور حق کی سربلندی کے لئے اپنی جانیں وقف کی ہوئی تھیں' ہرگز حضرت عثمان اور ان کے خادموں کے کوڑوں سے ڈرنے والے نہ تھے اس لئے کہ یہ بہرحال ابو سفیان و ابو جہل کے کوڑوں سے زیادہ خطرناک نہ تھے جو کفر پر پلٹنے کے لئے انہیں شکنجے دیتے تھے۔ لیکن صبر کے راستہ کو اپنا کر وہ ابو سفیان و ابو جہل اور قریش کے دوسرے آمروں پر غالب آگئے تھے اور جناب رسالتمآبؐ کی رسالت کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی۔ اور جس

طرح کل فتح انہی کی ہوئی تھی اس طرح آج بھی انہیں ہی کامیاب ہونا تھا۔

حضرت عثمان اور ان کے حواریوں کے بارے میں حضرت ابوذر غفاری کا موقف

ہماری نظر میں جس جامعیت و اختصار کے ساتھ مولائے متقیان علیہ السلام نے حکام وقت کے بارے میں حضرت ابوذرغفاری کے موقف اور حضرت ابوذر کے بارے میں سربراہان خلافت کے خیالات کی وضاحت کی ہے' وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ مدینہ سے وداع کرتے وقت آپ نے ان سے یہ جملے کہے تھے کہ'

اے ابوذر! تم نے اللہ سبحانہ کے لئے غضب کیا ہے۔ لہٰذا جس کے لئے غضب کیا ہے اسی سے امید رکھو۔ یقیناً یہ لوگ اپنے دنیاوی رجحانات کی وجہ سے تم سے خائف ہیں اور تم اپنے دین و ایمان کے سبب ان سے ڈرتے ہو۔ چنانچہ جس چیز کی وجہ سے وہ تم سے خائف ہیں وہ ان کے پاس رہنے دو اور ان کی جس چیز سے تم ڈرتے ہو اس سے فرار کر جاؤ۔ یہ لوگ کتنے محتاج و نیاز مند ہیں اس چیز کے جس سے تم انہیں روکتے اور منع کرتے ہو

اور کتنے بے نیاز ہو اس چیز سے کہ جس سے وہ تمہیں محروم کرتے ہیں۔ اگر تمہیں انس ہے تو حق سے اور اگر وحشت ہے تو باطل سے۔ اگر تم ان کی دنیا کو تسلیم کرلو تو وہ تمہارے خیر خواہ بن جائیں گے اور اگر اس سے تھوڑی سی دلبستگی بھی پیدا کرلو تو تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں گے[1]۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ دعوت اسلام کی ابتداء ہی میں اسلام لے آئے تھے۔ وہ اس خدائی دین کی تکمیل و اشاعت کے تمام مراحل میں بذات خود شریک رہے اور انہوں نے اپنے حصہ میں آنے والی تمام مشکلات اور شکنجوں کو برداشت کیا۔ ان کی خلوص نیت، صداقت اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں مرمٹنے سے سرشار جذبوں نے جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت متاثر کیا اور انہیں آنحضور کے اعوان و انصار کی صف میں ایک نمایاں حیثیت پر لاکھڑا کیا۔ چنانچہ اور صحابیوں کی بہ نسبت انہیں بارگاہ رسالت میں ایک خاص تقرب حاصل ہوا۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا کہ،

آسمان و زمین میں کوئی ابوذر سے زیادہ سچا اور صادق القول پیدا نہیں ہوا۔

غزوۂ تبوک میں سواری پیچھے رہ جانے کے باعث وہ مسلمانوں سے بچھڑ گئے تھے۔ لیکن سواری سے مایوس ہونے کے باوجود بھی انہوں نے پیدل سفر جاری رکھا اور مسلمانوں سے جاملے۔ آنحضورؐ نے جو انہیں سامان اٹھائے دواں دواں اپنی طرف آتے دیکھا تو یہ مشہور تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ،

"اے ابوذر! تم تنہا جیئو گے اور تنہا محشور ہوگے۔ یہ سعادت عراق کے کچھ لوگوں کو نصیب ہوگی کہ وہ تمہارا کفن و دفن کریں۔"

---

[1] واضح رہے کہ مولائے کائنات کے کلمات میں دنیا دین کے مقابلہ میں استعمال ہوئی ہے چنانچہ بظاہر اس سے دنیاوی لذتوں اور خواہشات میں غرق ہوجانا اور آخرت سے غافل ہوجانا مراد ہے۔

حضرت ابوذر غفاری جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد بھی اسلام کے سچے حامی و وفادار رہے۔ اسلامی تعلیمات کی اشاعت اور اسلامی قوانین کا نفاذ ان کی دلی تمنا تھی۔ ان کا شمار حق کے طرفداروں اور باطل سے نفرت کرنے والوں میں ہوتا تھا۔ وہ تمام کاموں میں وصئی رسول جناب امیر علیہ السلام کے نقش قدم پر چلتے اور محروموں اور ستم رسیدہ لوگوں کی دستگیری کرتے تھے۔ انہیں نہ آمروں کے غیض و غضب سے کوئی خوف و ہراس تھا اور نہ بھاری رقموں کے پیش کئے جانے سے ان کے نقطہ نظر میں نرمی آتی تھی۔

انہوں نے دیکھا کہ خلیفتہ المسلمین بیت المال کے خزانچی کو یہ ہدایات دے رہے ہیں کہ'

"یہ دولت ہماری دولت ہے اور یہ غنیمت ہماری غنیمت ہے۔ جسے مناسب سمجھیں گے دیں گے اور جسے مناسب نہ سمجھیں نہیں دیں گے۔"

نیز انہوں نے ولید بن عقبہ' مروان بن حکم اور ابن ابی سرح جیسے آمروں کو عیش و عشرت میں ڈوبتے اور فتنہ و فساد پھیلاتے دیکھا۔ یہ لوگ اس وقت دینی اقدار کو پامال کرتے تھے اور انہیں کسی کی عزت و شرف کا کوئی خیال نہ تھا۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ برسراقتدار ہونے کی وجہ سے یہ لوگوں کے ردعمل اور خشم و نفرت سے محفوظ ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے معاشرے میں طبقہ بندی' قبیلہ پرستی' اور زمانہ جاہلیت کی اس روح کو پلٹتے دیکھا جس سے اسلام نے سالہاسال جنگیں لڑیں تھیں۔ ان تمام طبقات میں تقسیم ہونے کے باوجود بھی ان لوگوں کی نظر میں کسی کی کوئی اہمیت نہ تھی مگر یہ کہ ان کے خاندان سے ہو یا ان کا فرمانبردار اور تابع ہو۔ جس حکومت کی بنیاد جناب رسالت مآبؐ نے رکھی' جس کی جڑیں لوگوں کے دلوں میں مستحکم کیں اور جس کے لئے ایسے اصول و ضوابط معین کئے جن کے سائے میں رہ کر ہر انسان کے تمام حقوق بحال کر دیئے جاتے ہیں۔ وہی حکومت کہ جس نے ہر قسم کی تفریق اور گورے کالے کے فرق کو مٹا کر آمریت کے خلاف آواز بلند کی اور صرف تقویٰ اور نیک کاموں کو امتیازات کا معیار بنایا' آج

اس میں اور ابو سفیان و ابو جہل کی حکومتوں اور روم و فارس کی سلطنتوں میں کوئی فرق باقی نہ رہ گیا تھا۔

حضرت عثمان کے دور میں جو کچھ بھی ہوا اسے دوسروں کی طرح حضرت ابوذر نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ ان لوگوں کی صف میں شامل ہوگئے جنہیں اسلام کی مصلحت جان سے زیادہ عزیز تھی۔ انہوں نے بھرپور زور لگایا کہ کسی طرح سے ان انحرافات اور بدعنوانیوں کی روک تھام کی جاسکے لیکن جب حکمراں طبقہ میں انہیں ایک فرد بھی ایسا دکھائی نہ دیا جو ان کی باتوں کو دل و جان سے قبول کرتا تو حضرت ابوذر کی یہ پکار اسلامی حکومت کے تمام گوشوں میں گونج اٹھی:

خدا کی قسم میں شمع حق کو بجھتے اور باطل کو سر اٹھاتے دیکھ رہا ہوں۔ سچوں کو جھٹلایا اور خود خواہی کے بتوں کو اوپر لایا جارہا ہے۔ ایسے میں شریف النفس لوگوں کی یہی جزاء ہوگی کہ ان سے پوچھ گچھ کی جائے اور ضرب وشتم کے بعد انہیں شہربدر کردیا جائے۔

مورخین لکھتے ہیں کہ یوں تو حضرت ابوذر کی اس حق خواہی اور باطل سے ٹکراؤ پر ہی خلیفہ ان سے ناراض تھے لیکن جس چیز کی وجہ سے خلیفہ ان پر برہم ہوئے وہ یہ تھی کہ جب بھی خلیفہ مروان بن حکم یا بنی امیہ و بنی عاص کے خاندان میں سے کسی پر بیت المال کی دولت لٹاتے اور زید بن ثابت کو اس کا کچھ حصہ دیتے تو حضرت ابوذر غفاری مسلمانوں کے کسی گروہ یا جماعت کو دیکھتے کے ساتھ ہی اس آیۂ مبارکہ کی تلاوت کرتے کہ '

"بشر الذین کفروا بعذاب الیم" "کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو"[۵۲]

پھر اس آیۂ کریمہ کی تلاوت کرتے کہ

والذین یکنزون الذھب والفضہ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم

---

[۵۲] سورۂ توبہ آیۂ نمبر ۳

بعذاب الیم[۱] -

''اور جو لوگ سونا چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے تو (اے پیغمبرؐ) تم انہیں ہولناک عذاب کی بشارت دو''

حضرت عثمان نے ان کے پاس کسی کو بھیجا اور ان سے خاموش رہنے اور اس غلطی کو نہ دہرانے کا تقاضا کیا۔ حضرت ابوذر نے اس شخص سے کہا کہ'

کیا عثمان مجھے خدا کی کتاب کی قرائت اور ان لوگوں پر الزام لگانے سے روکتا ہے جنہوں نے اس کے احکام کو چھوڑ رکھا ہے۔ خدا کی قسم اگر عثمان کو ناراض کرکے بھی خداوند کریم کو راضی و خوشنود کرلوں تو یہ میرے حق میں اس سے بہتر ہے کہ عثمان کی رضایت کی خاطر باری تعالیٰ کی ناراضگی مول لوں۔

چنانچہ حضرت ابوذر' حضرت عثمان اور ان کے وزراء کے بارے میں اپنے اسی مضبوط نقطہ نظر پر باقی رہے اور یہ امر حضرت عثمان پر نہایت گراں گزرا۔ وہ اس سوچ میں غرق ہوگئے کہ ان کے ساتھ کیا کرنا چاہئے۔

انہوں نے اندازہ لگایا کہ اگر انہیں جان سے مارڈالیں یا قید و بند کی صعوبتیں دیں گے تو یہ ان کے خلاف بغاوتوں کا نقطہ آغاز ہوگا اور اس طرح صحابہ سے ان کی کشیدگی ناقابل تلافی حد تک بڑھ جائے گی لیکن وہ انہیں مدینہ میں آزاد بھی نہ چھوڑ سکتے تھے اس لئے کہ ان کی موجودگی کبھی بھی حالات کو یکسر خراب کر سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے کسی کو یہ پیغام دے کر حضرت ابوذر کے پاس بھیجا کہ'

تم نے مجھے اور میرے دوستوں کو بہت تنگ کرلیا۔ اب ہمارے پاس سے دور ہوجاؤ اور شام میں جاکر رہو۔

چنانچہ خلیفہ نے انہیں شام بھجوا دیا تاکہ وہ معاویہ کے زیر نظر رہیں۔ دوسری طرف سے معاویہ کو ان پر سختی کرنے اور ان کے تمام کام زیر نظر

---

[۱] سورہ توبہ آیۂ نمبر ۳۴۔

رکھنے کی تاکید کی۔

حضرت ابوذر نے شام جاکر معاویہ کی فضول خرچیوں اور نمود و نمائش کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ معاویہ نے انہیں کسی کے ہاتھ تین سو درہم بھجوائے۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ ان کا وہ حق ہے کہ جس سے انہیں اس سال محروم کیا گیا تھا تو وہ لئے لیتے ہیں اور اگر یہ انعام و عطیہ ہے تو انہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں اور وہ اسے واپس لے جائے۔

ابن اثیر لکھتے ہیں کہ ایک رات معاویہ نے انہیں ایک لاکھ درھم بھجوائے۔ انہوں نے صبح ہوتے ہی اسے فقراء اور نادار لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ صبح کی نماز کے بعد معاویہ نے اس شخص کو بلا بھیجا جو حضرت ابوذر کو پیسے دے کر آیا تھا اور اس سے کہا کہ،

تم ابوذر کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ میرے جسم کو معاویہ کے تشدد سے نجات دے۔ اس لئے کہ یہ رقم اس نے کسی اور کو بھجوائی تھی اور میں آپ کے پاس لے آیا۔

اس شخص نے آکر جب حضرت ابوذر سے یہ جملے ادا کئے تو انہوں نے کہا کہ معاویہ سے کہو کہ ان کے پاس اس کے دیناروں میں سے کچھ بھی باقی نہیں ہے تاہم اگر وہ انہیں واپس لینا چاہتا ہے تو تین دن کی مہلت دے۔ وہ شخص معاویہ کے پاس پلٹ گیا اور اس نے حضرت ابوذر کا جواب اس تک پہنچا دیا۔

اس طرح حضرت ابوذر نے معاویہ کی فضول خرچی و زیادہ روی کے بارے میں جو نقطہ نظر اختیار کیا تھا وہ اس پر بڑی شد و مد کے ساتھ باقی رہے۔ معاویہ نے حضرت عثمان کو ایک خط لکھا جس میں انہیں اس صحابی رسولؐ کی سرگرمیوں سے واقف کیا اور شام میں ان کی موجودگی سے پیدا ہونے والے خطرات سے ڈرایا۔

جب معاویہ نے اپنے لئے خضراء نامی عالیشان محل تعمیر کروایا تو حضرت ابوذر اس کے پاس گئے اور کہنے لگے،

اے معاویہ! اگر یہ تم نے خدا کے مال سے بنوایا ہے تو بددیانتی ہے اور

اگر اپنے مال سے تعمیر کروایا ہے تو زیادہ روی ہے۔

اس طرح حضرت ابوذر غفاری کی شام میں بھی وہی سیاست رہی جس پر مدینہ میں گامزن تھے۔ اسی لئے حبیب بن مسلمہ فھری نے معاویہ کو مشورہ دیا کہ'

ابوذر پورے شام کو تمہارا مخالف بنادے گا لہٰذا اگر تمہیں شام سے کچھ دلچسپی ہے تو کوئی فکر کرو۔

شرح نہج البلاغہ میں جاحظ کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے۔ اس روایت کو قبیلہ بنی غفار کے ایک شخص کی زبانی نقل کیا گیا ہے۔ یہ شخص بیان کرتا ہے کہ وہ قنسرین و عواصم میں معاویہ کے مالی امور کا متولی تھا۔ ایک دن وہ معاویہ کے پاس آیا تو اچانک دروازے پر اس نے کسی شخص کی آواز سنی جو چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ'

اے خدا! بھلائی کا حکم دینے اور خود اس سے منہ پھیرنے والوں پر اپنی لعنت بھیج۔

اے خدا! ان لوگوں کو جو برائیوں سے مخالفت کرتے اور خود انہیں بے دھڑک انجام دیتے ہیں' اپنی رحمت و مغفرت سے دور رکھ۔ معاویہ اس آواز کو سن کر چونک پڑا۔ اس کے چہرے کا رنگ فق پڑ گیا اور وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا اس آواز کو پہچانتے ہو۔ میں نے تردید کی تو اس نے کہا کہ'

کون ہے جو مجھے جندب بن جنادہ (حضرت ابوذر) کے شر سے نجات دلائے۔ وہ ہر روز میرے دروازے پر آکر یہ نعرہ لگاتا ہے جسے تم ابھی سن چکے ہو۔

پھر اس نے حضرت ابوذر غفاری کو حاضر کرنے کا حکم دیا اور جب لوگ انہیں لے آئے تو ان سے کہا کہ'

اے خدا اور رسولؐ کے دشمن! تم روزانہ ہمارے پاس آتے اور اپنا کام دکھا کر واپس چلے جاتے ہو۔ یاد رکھو! کہ اگر میں امیرالمومنین کی اجازت کے بغیر محمدؐ کے اصحاب کو قتل کرنے والا ہوتا تو بہت پہلے تمہارا کام تمام کر دیتا لیکن اب ضرور تمہارے بارے میں خلیفہ سے استفسار کروں گا۔

غفاری غلام کہتا ہے کہ'
مجھے حضرت ابوذر سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اس لئے کہ وہ میری قوم کے ایک فرد تھے۔ چنانچہ جب میں نے ان پر نگاہ ڈالی تو گندمی رنگ کے ایک شخص کو دیکھا جس کا چہرہ اندر دھنسا ہوا تھا اور کمر خمیدہ تھی۔ انہوں نے معاویہ کو مخاطب کر کے کہا کہ'
میں خدا اور رسولؐ کا دشمن نہیں بلکہ تم اور تمہارا باپ خدا و رسولؐ کے دشمن ہیں۔ تم لوگ بظاہر اسلام لے آئے تھے۔ لیکن درپردہ دلوں میں شرک کو چھپائے رہے اور تم پر تو رحمت عالم نے لعنت بھیجی اور یہ بددعا دی کہ کبھی تمہارا پیٹ نہ بھرے۔
میں نے خود جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سنا کہ'
جب میری امت پر وہ شخص حاکم ہو جائے جس کی گردن موٹی ہو اور کھانا کھانے کے باوجود اس کا شکم سیر نہ ہو تو میری امت اس سے بچ کر رہے۔
معاویہ نے کہا کہ "میں وہ شخص نہیں ہوں"
"حضرت ابوذر غفاری نے جواب دیا نہیں تم ہی وہ شخص ہو اور اس بات کی خبر خود جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دی تھی۔ میں نے ان سے یہ بھی سنا تھا کہ'
اے خدا اس پر لعنت بھیج اور مٹی کے علاوہ کسی اور چیز سے اس کا پیٹ نہ بھر
(موت کی طرف اشارہ ہے)
نیز میں نے آنحضورؐ سے یہ بھی سنا کہ'
معاویہ کے جسم کا نچلا حصہ دوزخ کی آگ میں ہے
یہ سن کر معاویہ مسکرانے لگا۔ اس نے پھر ان کی حراست کے احکام جاری کئے اور حضرت عثمان کو ان کے بارے میں لکھا۔ حضرت عثمان نے جواب میں لکھا کہ انہیں ایک سخت سواری کی ننگی پیٹھ پر سوار کر کے مدینہ بھیج دیا جائے۔ معاویہ نے ایسا ہی کیا اور سواری ہانکنے والے کو حکم دیا کہ وہ کسی جگہ قیام کئے بغیر لگاتار سفر کو جاری رکھے۔ لہٰذا جب سواری مدینہ پہنچی

تو سفر کی صعوبتوں اور تکان سے حضرت ابوذر کی رانیں زخمیں ہوگئیں تھیں۔ انہیں جب حضرت عثمان کے پاس لے جایا گیا تو خلیفہ نے انہیں دیکھتے کے ساتھ کہا کہ'

اے جندب حقیر! خدا کبھی تمہاری آنکھیں ٹھنڈی نہ کرے

حضرت ابوذر نے جواب دیا کہ' میں جندب ہوں لیکن جناب رسالت مآبؐ نے میرا نام عبداللہ (خدا کا بندہ) رکھا تھا چنانچہ اپنے نام کی بہ نسبت میں نے جناب رسالت مآبؐ کے رکھے ہوئے نام کو منتخب کیا تھا۔

حضرت عثمان نے ان سے پوچھا کہ'

کیا تمہارے خیال میں میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالی کا ہاتھ بند ہے اور وہ فقیر اور ہم بے نیاز ہیں۔

حضرت ابوذر نے جواب دیا کہ اگر تم یہ نہیں کہتے تو کیوں اللہ تعالی کے مال کو اس کے بندوں پر خرچ نہیں کرتے۔ میں گواہ ہوں کہ میں نے جناب رسالت مآبؐ سے سنا کہ

جب ابوالعاص کے خاندان سے تیں لوگ جمع ہوجائیں گے تو وہ اللہ تعالی کے مال کو اپنی جاگیر (ایک کے بعد ایک کرکے اسے لوٹتے رہیں گے) اوراس کے بندوں کو اپنا نوکر بنالیں گے اور اس کے دین میں فتنہ و فساد ڈالیں گے۔۱

حضرت عثمان نے حاضرین سے پوچھا کہ کیا انہوں نے جناب رسالت مآبؐ سے یہ حدیث سنی ہے۔ ان سب نے انکار کیا تو انہوں نے جناب امیر علیہ السلام کو بلا بھیجا اور آپ سے حضرت ابوذر کی نقل کردہ حدیث کے بارے میں استفسار کیا۔ جناب امیر علیہ السلام نے فرمایا کہ انہوں نے اس حدیث کو تو جناب رسالت مآبؐ سے نہیں سنا تاہم یہ ضرور سنا ہے کہ'

"آسمان نے کسی پر سایہ نہ کیا اور زمین نے کسی ایسے کو پروان نہ چڑھایا جو ابوذر سے زیادہ سچا ہو۔"

یہ سننا تھا کہ سب نے ایک جان ہوکر تصدیق کی کہ انہوں نے یہ حدیث جناب ختمی مرتبتؐ سے سنی ہے۔

واقدی سے روایت ہے کہ حضرت عثمان اور حضرت ابوذر غفاری کے درمیان ردو کد شدت اختیار کرگئی اور بات اس حد تک آگے بڑھی کہ جب بھی حضرت عثمان انہیں ہر ممکنہ طریقہ سے خاموش کرانے کی کوشش کرتے تو وہ حضرت عثمان اور ان کے حواریوں کے بارے میں اتنا ہی سخت موقف اختیار کرتے۔ حضرت عثمان نے یہ دیکھا کہ ان کے پاس صرف دو صورتیں باقی رہ گئی ہیں۔ یا انہیں ہلاک کردیں اور یا مدینہ سے نکال باہر کریں۔ انہوں نے دیکھا کہ اگر وہ انہیں جان سے مارڈالیں گے تو سرزمین حجاز اور اس سے باہران کے خلاف نفرت و انتقام کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ اس لئے کہ لوگ حضرت ابوذر کے اسلامی تشخص اور حق بات پر ان کی پرزور صلابت و سرسختی کو سراہتے اور حکام وقت کے بارے میں ان کے افکار اور طرز عمل کی بھرپور حمایت کرتے تھے۔ انہوں نے جناب رسالت مآبؐ سے ان کی تعریف و توصیف بھی سنی تھی۔ چنانچہ حضرت عثمان نے انہیں مدینہ سے شہربدر کرنے کا فیصلہ کیا لیکن سوال یہ تھا کہ انہیں کہاں بھیجتے ؟۔

شہروں اور قصبوں میں کہ جہاں ان کی موجودگی سے وہی مسائل اٹھ کھڑے ہوتے جو شام اور مدینہ میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے ! لہذا ربذہ کے علاوہ کوئی اور ایسی جگہ باقی نہ رہی جہاں انہیں بھیج سکتے تھے اور نہ کوئی وہاں ان سے رابطہ کرسکتا تھا۔ چنانچہ مروان بن حکم کی نگرانی میں انہوں نے حضرت ابوذر کو ربذہ بھیجنے کا فرمان صادر کیا اور تمام صحابیوں کو ڈرا دھمکادیا کہ کوئی انہیں وداع کرنے نہ جائے۔

جب مروان بن حکم نے انہیں شہربدر کرنا چاہا تو لوگوں پر یہ امر سخت ناگوار گزرا کہ رسول اللہؐ کا نکالا ہوا شخص ان کے ایک ایسے جلیل القدر صحابی کو مدینہ سے نکال باہر کرے جسے آنحضورؐ نے منتخب کرلیا تھا اور انہیں بہت سے صحابہ کرام پر ترجیح دی تھی۔

تاہم حضرت عثمان اور ان کے جواریوں کے ڈر سے وہ انہیں وداع کرنے نہ آسکے۔ لہذا انہیں وداع کرنے والوں میں صرف حضرت امیرؑ آپ کے

بھائی عقیل، حسنین علیہما السلام اور حضرت عمار بن یاسر تھے۔
اس رخصت آخر میں جب امام حسن مجتبیٰ انہیں خراج عقیدت پیش کرنے آگے بڑھے تو مروان نے ان پر اعتراض کیا اور کہا کہ کیا وہ نہیں جانتے کہ امیرالمومنین نے ان سے گفتگو کرنے سے منع کیا ہے۔ جناب امیر علیہ السلام آگے بڑھے۔ آپ نے مروان کی سواری کے سر پر ہنٹر رسید کیا اور اس سے کہا کہ،

دور ہو! خدا تجھے دوزخ کا ایندھن بنائے

مورخین لکھتے ہیں کہ جب مروان نے اس بات کی شکایت حضرت عثمان سے کی تو وہ اس پر ناراض ہوئے۔

وصئی رسولؐ نے ان لمحوں میں حضرت ابوذر سے خطاب کرکے یہ جملے فرمائے۔

اے ابوذر! لوگوں نے تمہیں اپنی دنیا سے محروم کردیا ہے اور تم نے انہیں اپنا دین دینے سے انکار کیا ہے جس چیز سے انہوں نے تمہیں محروم کیا ہے تم اس سے کتنے بے نیاز ہو اور جس چیز سے تم نے انہیں روکا ہے وہ اس کے محتاج ہیں۔

حضرت عمار بن یاسر بولے،

معبود کی قسم! اگر آپ ان کی دنیا کو پسند کرلیتے تو وہ آپ کو امان دیتے اور اگر آپ ان کی حرکتوں پر راضی رہتے تو وہ آپ کو چاہنے لگتے۔ صرف دنیا کی چاہت اور موت سے فرار ہے کہ جس نے لوگوں کو آپ کی بات زبان پر لانے سے روک دیا ہے۔

اس طرح ہر ہر فرد نے اپنے حساب سے انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ اس رخصت آخر میں حضرت ابوذرؓ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ ان کی آنکھوں سے زاروقطار آنسو جاری ہوگئے۔ وہ کہنے لگے کہ

"میں حجاز کی سرزمین میں عثمان پر اور شام میں معاویہ پر بوجھ ہوں۔ وہ اپنے بھائی یا خالہ زاد کے شہر میں بھی مجھے بھیجنا پسند نہیں کرتا کہ کہیں وہاں کے لوگ بھی اس کے خلاف ہو جائیں۔ چنانچہ اس نے ایسے شہر میں میرا

ٹھکانہ قرار دیا ہے کہ جہاں خدا کے سوا میرا کوئی ناصر و مددگار نہیں۔ خدا کی قسم میں اس کے سوا کسی کی رفاقت نہیں چاہتا۔"

اس طرح حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی باقی ماندہ زندگی ربذہ میں لوگوں سے دور تنہائی کے عالم میں گذار دی۔ یہ ایک ایسی گنجان اور اجڑی بستی تھی کہ جہاں چرند پرند بھی رہنا گوارا نہ کرتے تھے۔

جب انہوں نے جان جان آفرین کے سپرد کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی آسانی کے لئے عراقیوں کا ایک کاررواں بھیجا جو حج کرنے مکہ جا رہا تھا۔ ان کی رفیقہ حیات نے دور سے اسے اشارہ کیا۔ جب یہ لوگ قریب آئے اور انہیں معلوم ہوا کہ یہ اس جلیل القدر صحابی کا جنازہ ہے کہ جس کی تعظیم و تکریم جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے تھے اور انہیں صحابہ کرام میں ایک خاص مقام حاصل تھا تو وہ تحیر میں پڑ گئے۔

انہوں نے اس محترم صحابی کی تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دیئے اور انہیں سپرد خاک کرنے کے بعد ان کی اہلیہ اور صاجزادی کو مدینہ واپس لے گئے اور یوں حضرت ابوذر کے بارے میں' یہ حدیث نبویؐ صحیح ثابت ہوئی کہ' "اے ابو ذرؓ! تم تنہا جیو گے تنہا سپرد خاک کئے جاؤ گے اور حشر کے دن بھی تنہا اٹھ کھڑے ہوگے یہ سعادت عراق کے کچھ لوگوں کے شامل حال ہوگی کہ وہ تمہیں غسل دیں گے اور سپرد خاک کریں گے"[1]

---

[1] شرح نہج البلاغہ جلد دوم صفحہ ۴۰۲

☆ ربذہ مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر عراق کی طرف واقع ہے۔

حضرت عثمان کے خلاف بغاوت اور ان کا انجام کار

جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ کے اس جلیل القدر صحابی کا کیا حشر ہوا اور کس حالت میں انہوں نے جہان فانی سے رخت سفر باندھا' تو اس وقت انہیں اس فاسد نظام سے لاحق خطرات کا صحیح اندازہ ہوا جس کی قیادت حکم بن عاص اور اس کی اولاد کر رہی تھی۔ یہ لوگ احکامات جاری کرتے' پابندیاں عائد کرتے' تعیش بھری زندگی گذارتے اور لوگوں کے اموال اور حکومت کے ذرائع سے جو دل میں آتا کر گذرتے۔ دوسری طرف خدا و رسول کے مقرب بندوں پر تشدد کیا جاتا اور انہیں اللہ و رسولؐ کے دیر و حرم سے نکال باہر کیا جاتا۔

جب لوگوں کو یہ سب باتیں معلوم ہوئیں اور انہوں نے دیکھ لیا کہ اس صنف کی قیادت کے انتخاب میں یہ لوگ سنجیدہ ہیں اور انہوں نے سربراہان مملکت کی بے راہ روی اور بھلائی کا حکم دینے اور برائیوں سے روکنے والوں پر

کئے گئے ظلم و ستم کو عبرت کی نگاہ سے دیکھا تو وہ تمام شہروں سے امت مسلمہ کو اس آمرانہ قیادت سے نجات دلانے کے لئے ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے مدینہ کو محاصرہ میں لے لیا۔ ایک طرف سے یہ لوگ تھے جن کے ہمراہ حضرت عائشہ تھیں۔ حضرت عثمان کے قتل کی ترغیب دینے میں یہ لوگ پیش پیش تھے۔

مورخین کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ طلحہ و زبیر حضرت عثمان کے سخت مخالفین میں سے تھے۔ حضرت عثمان طلحہ کے بارے میں کہتے تھے کہ،

"وائے ہو ابن حضرمیہ (طلحہ) پر میں نے اسے کس قدر زر (سونا) دیا اور وہ میرے خون کا پیاسا ہے۔ اے خدا اسے یہ سب دیکھنا بھی نصیب نہ ہو۔"

مورخین لکھتے ہیں کہ جب حضرت عثمان پر محاصرہ تنگ کر دیا گیا تو طلحہ نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال لی جس سے وہ لوگوں کی پہچان میں نہ آسکے اور پھر حضرت عثمان کے گھر کی طرف ایک تیر رہا کیا۔ نیز ان کے بارے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ جب مخالفین دروازے سے حضرت عثمان کے گھر میں داخل نہ ہو سکے تو طلحہ انہیں اپنے کسی دوست کے گھر لے گئے۔ وہاں سے مخالفین چھت پر چڑھ گئے اور پھر حضرت عثمان کے گھر میں گھسنے اور ان کا کام تمام کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

مورخین حضرت زبیر کے بارے میں بھی صراحت کے ساتھ رقم کرتے ہیں کہ وہ حضرت عثمان کے مخالفین سے کہتے تھے کہ انہیں قتل کر ڈالو اس لئے کہ انہوں نے لوگوں کی سنت بدل دی ہے۔ ان سے جب کہا گیا کہ ان کا بیٹا حضرت عثمان کے دروازے پر کھڑا ان کی حمایت کر رہا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ،

"میری نظر میں عثمان کو جان سے مارنے میں کوئی قباحت نہیں اگرچہ پہل میرے بیٹے ہی سے کیوں نہ ہو۔ بے شک کل پل صراط میں عثمان ایک سڑی ہوئی مردہ لاش کی مانند ہو گا۔"

حضرت عائشہ کہتی تھیں کہ،

"اس نعثل کو قتل کر ڈالو"

نعثل مدینہ میں باقی ماندہ یہودیوں میں سے ایک پلید و خبیث یہودی تھا۔ حضرت عائشہ نے اسے حضرت عثمان کے لئے استعارے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ جب حالات حضرت عثمان کے لئے ایک بحران کی شکل اختیار کر گئے اور حضرت عائشہ کو یقین ہو چلا کہ لوگ حضرت عثمان کو خلافت سے برکنار یا قتل کئے بغیر اپنے شہروں کو واپس نہ ہوں گے تو انہوں نے حج کے لئے مکہ روانگی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان حالات میں حضرت عثمان نے ان سے پناہ مانگی اور مروان بن حکم اور عبدالرحمن بن عتاب بن اسید کو ان کے پاس بھیجا۔ ان دونوں نے ان سے کہا کہ، "اگر آپ یہاں قیام کریں تو شاید اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ اس شخص کی مشکل حل کر دے۔"

انہوں نے کہا کہ انہوں نے سامان سفر تیار کر لیا ہے۔ ان پر حج واجب ہے اور وہ نہیں رک سکتیں۔ مروان اور اس کا ساتھی دونوں کھڑے ہو گئے۔ اور مروان کے ساتھی نے یہ شعر پڑھا (جسکا مفہوم کچھ یوں ہے) کہ

"قیس نے پورے شہر کو میری دشمنی کی آگ دکھائی اور جب یہ آگ شعلہ ور ہوئی تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔"

حضرت عائشہ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے مروان سے کہا کہ، "اے مروان مجھے تمہارے اس رفیق پر شک ہے۔ اس نے بہت سادگی سے میرے بارے میں قضاوت کر دی اور اگر میں چاہوں تو اسے سمندر میں پھینکوا سکتی ہوں۔"

مکہ کے سفر میں حضرت عائشہ نے عبداللہ بن عباس کو یہ نصیحت کی کہ

"اے ابن عباس ایسا نہ ہو کہ تم اس آمر سے لوگوں کو دور کرو اور اس کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات ڈالو اس لئے کہ اب لوگوں کی آنکھیں کھل چکی ہیں اور وہ مملکت کے گوشہ و کنار سے اس کام کو

انجام دینے کے لئے جمع ہوئے ہیں جس کا فیصلہ کیا جاچکا ہے۔ اور تم طلحہ بن عبید اللہ کو تو جانتے ہو کہ اگر اسے بیت المال کا حاکم بنا دیا جائے اور خزانوں کی چابیاں اس کے سپرد کر دی جائیں تو وہ اپنے چچازاد بھائی ابوبکر کی سیرت پر چلے گا۔"

حضرت عثمان کے قتل کے بعد حضرت عائشہ نے لوگوں سے ان کے بارے میں پوچھا تو لوگوں نے انہیں بتایا کہ وہ مارے جاچکے ہیں یہ سنکر ان کی خوشی کی کوئی انتہاء نہ رہی انہوں نے چشم زدن میں اپنی تمام آرزوئیں اور امنگیں ظاہر کر دیں اس لئے کہ انہیں مکمل اطمینان تھا کہ لوگ بہت جلد طلحہ سے بیعت کرلیں گے چنانچہ انہوں نے کہا کہ

"نعثل دور ہو! مرحبا اے مبارک ہاتھوں والے!! مرحبا اے شیر نر مرحبا اے ابن عم!"

فرط مسرت نے انہیں بے خود کر دیا تھا چنانچہ انہوں نے مزید کہا کہ "گویا میں ان کی انگلیوں کی طرف دیکھ رہی ہوں جن سے لوگ قطار در قطار بیعت کر رہے ہیں۔"

ان لمحات میں جب کہ عثمان کے جاں بحق ہونے کی خبر تازگی رکھتی تھی لوگوں کو حضرت عائشہ کی اس حالت پر بہت تشویش ہوئی اور یہ حقیقت ہے کہ اگر انہیں اپنے خاندان کے بر سراقتدار آنے کا اطمینان نہ ہوتا تو وہ ہرگز ان جذبات کا مظاہرہ نہ کرتیں بہرصورت جب ان کے جذبات قابو میں آئے اور انہوں نے اطراف میں موجود چہروں پر تمسخر آمیز مسکراہٹ دیکھی تو سمجھ گئیں کہ پس پردہ کوئی ایسی حقیقت ہے کہ جس سے ان کے جذبات میل نہیں کھاتے چنانچہ انہوں نے فوراً پوچھا کہ لوگوں نے حضرت عثمان کے بعد کیا کیا۔ جب انہیں یہ جواب ملا کہ لوگوں نے علی بن ابی طالب سے بیعت کرلی ہے تو انہوں نے اپنی ہی باتوں کی تردید شروع کر دی۔ کہنے لگیں کہ عثمان کو مظلومیت کے ساتھ قتل کیا گیا ہے اس لئے کہ لوگوں نے پہلے اس سے توبہ کروائی اور پھر اسے ہلاک کیا۔

اس بات کا خیال کئے بغیر کہ وہ ان لوگوں کے سامنے ہیں جو ان کی تمام حرکات و سکنات کو زیر نظر رکھے ہوئے ہیں انہوں نے یہ جملہ ادا کیا کہ "اے کاش! یہ حادثہ اس کے بعد پیش نہ آتا۔"

آزمائش کی ان کٹھن گھڑیوں میں جو حضرت عثمان پر گزریں، تاریخ حضرت عثمان اور ان کے حواریوں کے بارے میں طلحہ و زبیر و حضرت عائشہ کے اس سربخت اور منفی رویہ کے بارے میں لکھتی ہے۔ کچھ دن بعد انہی لوگوں نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ جناب امیر علیہ السلام سے ان کے انتقام کا مطالبہ کرنے لگے۔ انہوں نے خلیفۃ المسلمین کے خلاف اس خونی جنگ کا آغاز کیا جو جنگ جمل کی صورت میں نمودار ہوئی اس میں حضرت عائشہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور طلحہ و زبیر کے علاوہ وہ ہزاروں مسلمان اس جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے جنہیں ان تینوں نے دھوکہ دیا تھا۔

تاریخ اس بات کو بھی صراحت کے ساتھ سپرد قلم کرتی ہے کہ اس کے باوجود کہ خلیفہ اور اس کے حواری جناب امیر علیہ السلام کو پسند نہ کرتے تھے اور مروان آئے دن آپ کو شہید کرنے کی سازشیں کرتا اور حضرت عثمان کو آپ کے خلاف ورغلاتا رہتا تھا لیکن پھر بھی آپ نے ان لوگوں سے بزرگواری دکھائی اور وہ رویہ اختیار کیا جس میں سراسر نرمی، محبت اور اصلاح طلبی تھی تاکہ بات خون خرابہ تک نہ پہنچے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ طلحہ نے حضرت عثمان پر پانی بند کر دیا ہے تو آپ نے اس پر تنقید کی اور اسے پیغام بھجوایا کہ وہ انہیں ان کے کنوؤں سے پانی بھرنے دے اور اس کے بعد بھی جب طلحہ نے آپ کی بات نہ مانی تو آپ نے خود ان تک پانی پہنچوایا[1]۔

آپ نے کئی مرتبہ انہیں حملہ آوروں سے بچایا اور ان کے مخالفین کو سمجھایا کہ عثمان نے تمام بدعنوانیوں کو ختم کرنے اور اپنے والیوں کو معزول کرنے کا عہد کیا ہے۔ آپ کا یہ طرز عمل طلحہ، زبیر اور حضرت عائشہ پر سخت

---

[1] بلاذری کی انساب الاشراف میں نقل کردہ روایت۔

ناگوار گزرتا اور وہ آپ کی تمام اصلاحی کوششوں کو خاک میں ملانے کی سعی کرتے تاکہ مسائل مزید پیچیدہ ہوجائیں اور ایک بحران کی شکل اختیار کرلیں۔ اس وقت مروان بھی ہر اس اقدام کی مخالفت کرتا جو جناب امیر علیہ السلام کی وساطت سے انجام پاتا[1]۔

مورخ طبری لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان کے مخالفین نے انہیں توبہ کرنے کی دعوت دی اور انہیں قسم دی کہ وہ اس وقت تک ان کی جان نہ چھوڑیں گے جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عائد کردہ رعایا کے تمام حقوق بجا نہیں کردیتے۔ حضرت عثمان نے محسوس کیا کہ لوگ اپنے مطالبات میں سنجیدہ ہیں اور اگر وہ ان کے مطالبات کو تسلیم نہ کریں گے تو وہ انہیں ضرور قتل کرکے چھوڑیں گے۔ چنانچہ انہوں نے جناب امیر علیہ السلام کو بلوایا اور ان سے کہا کہ،

"اے ابوالحسن! جو کچھ لوگوں نے کیا وہ آپ کے سامنے ہے اور جو مجھ سے سرزد ہوا آپ اس سے بھی واقف ہیں۔ مجھے ان لوگوں سے جان کا خطرہ لاحق ہے لہٰذا آپ کسی طرح انہیں مجھ سے دور کیجئے۔ میں ان تمام چیزوں کو معاف کرنے کے لئے تیار ہوں جنہیں وہ پسند نہیں کرتے اور جو کچھ مجھ سے یا دوسروں سے چاہتے ہیں میں انہیں انجام دینے کے لئے تیار ہوں چاہے اس کام میں میری جان ہی کیوں نہ جائے۔"

جناب امیر علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ،

"لوگ تمہارے خون سے زیادہ انصاف کے پیاسے ہیں وہ صرف ایک سچے اور پائیدار معاہدہ ہی پر رضامند ہوسکتے ہیں اس سے پہلے بھی تم انہیں ایک بار زبان دے چکے ہو کہ ان تمام خرابیوں کی اصلاح کروگے لیکن جب میں نے انہیں تمہارے پاس سے ہٹادیا تو تم نے اپنے کسی وعدے کو وفا نہ کیا۔ چنانچہ اس بار بھی مجھے دھوکہ نہ دو اس لئے کہ تمہاری بہ نسبت میں انہیں حق دیتا

---

[1] تاریخ طبری جلد چہارم صفحہ ۱۲۹۔

ہوں۔"

حضرت عثمان نے کہا کہ "ٹھیک ہے آپ انہیں حق دیں خدا کی قسم میں ہر اس چیز کو انجام دینے کے لئے تیار ہوں جسے آپ کہیں گے۔"

جناب امیرؑ لوگوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے فرمانے لگے کہ "عثمان تمہارے تمام مطالبات تسلیم کرنے کی بات کرتا ہے اور تم سے انصاف کرنے کا دعویٰ کرتا ہے چنانچہ اس کی بات قبول کرو۔"

لوگوں نے کہا کہ انہیں منظور ہے لیکن وہ حضرت عثمان سے اس بات کا کوئی ثبوت لا دیں اس لئے کہ وہ صرف باتوں پر اپنا دل خوش نہیں کر سکتے آپ نے لوگوں کو جواب دیا کہ بلاشبہ یہ ان کا حق ہے اور آپ حضرت عثمان کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں لوگوں کے جواب سے باخبر کیا۔

حضرت عثمان نے ان معاہدوں کو پورا کرنے کے لئے مہلت مانگی اور پھر طے پایا کہ مدینہ میں رہنے والوں کے لئے حضرت عثمان کو تین دن کی مہلت دی جائے گی اور دوسرے شہروں میں ان کا فرمان پہنچنے تک انہیں مہلت ہوگی۔ اس عرصہ میں حضرت عثمان کو ہر بدعنوانی کا خاتمہ کرنا اور ہر اس گورنر کو برکنار کرنا تھا جسے لوگ ناپسند کرتے تھے۔ اس صلح نامہ میں ان سے وہ عہد و میثاق لئے گئے جو اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں سے نہیں لیتا اور مہاجر و انصار کے کچھ لوگوں کو اس پر گواہ ٹھہرایا گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے مدینہ کو خیرباد کہا اور اپنے اپنے شہروں کی راہ لی تاکہ حضرت عثمان ان سے کئے گئے وعدوں کو نبھا سکیں۔ ان تین دنوں میں حضرت عثمان نے اپنے آپ کو ایک محاذ آرائی کے لئے تیار کیا اور اسلحہ جمع کرنے کے ساتھ ساتھ خمیس کے غلاموں پر مبنی ایک لشکر ترتیب دینا شروع کیا[1]۔

جب تین دن گذر گئے اور حالات میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی نہ ان کی کسی

---

[1] "علی بن ابی طالب" استاد خطیب۔

ناپسندیدہ چیز کا خاتمہ ہوا اور نہ ہی کسی گورنر کو برکنار کیا گیا تو لوگ مشتعل ہوگئے۔ عمر بن حزم انصاری شہر سے باہر نکلے اور ذی الخشب کے مقام پر کوفہ و بصرہ کے لوگوں سے جا ملے۔ انہوں نے لوگوں کو حالات سے باخبر کیا اور پھر ان کے ساتھ مدینہ تک واپس آئے ان لوگوں نے کسی کو حضرت عثمان کے پاس بھیجا اور انہیں یہ پیغام دیا کہ

"کیا ہم اس شرط پر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے کہ آپ اپنی گزشتہ غلطیوں پر پشیمان ہوں گے اور ان کا ازالہ کریں گے۔ کیا آپ نے بارگاہ ربوبی میں ان چیزوں کا حلف نہ اٹھایا تھا؟

حضرت عثمان نے کہا کہ وہ ان تمام وعدوں پر باقی ہیں لوگوں نے پوچھا کہ پھر اس خط کے کیا معنی ہیں جو آپ کے پیام بر کے پاس سے برآمد کیا گیا ہے۔ لوگ اس مرتبہ بھی حضرت عثمان کا وہ خط ضبط کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے جو انہوں نے والی مصر کے نام لکھا تھا اس خط میں اسے مصر کے کچھ لیڈروں کی گردنیں قلم کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ یوں تو اس سے پہلے بھی طرفین کے درمیان صلح ہوگئی تھی اور اس وقت بھی حضرت عثمان نے بہت وعدے کئے تھے لیکن اس مرتبہ بھی انہوں نے والی مصر کو محمد بن ابی بکر کی گردن اڑانے کی ہدایات دی تھیں اور لوگوں نے ان کی اس تحریر پر دسترس حاصل کرلی تھی۔ حضرت عثمان نے جب اس خط سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو لوگوں نے کہا کہ "آپ کا سفیر اور آپ کی سواری ہے اور آپ کے کاتب کی تحریر جس پر آپ کی مہر لگی ہوئی ہے۔"

لوگوں نے کہا کہ اگرچہ ہم آپ ہی کو موردالزام ٹھہراتے ہیں لیکن آپ کے بارے میں ہمیں کوئی جلدی نہیں۔ آپ اپنے فاسق گورنروں کو برکنار کریں اور ان کی جگہ ایسے لوگ لائیں جو ہمارے جان و مال کی حفاظت کر سکیں۔ نیز ہم پر ہونے والے ہر ظلم کا احتساب کیا جائے حضرت عثمان نے کہا کہ اگر وہ ہر اس شخص کو مقرر کرنا شروع کردیں جسے لوگ چاہتے ہیں اور ان تمام لوگوں کو برکنار کردیں جنہیں لوگ ناپسند کرتے ہیں تو پھر وہ کس کام کے لئے ہیں اس

صورت میں تمام اختیارات تو لوگوں کے ہاتھ میں ہوں گے۔

لوگوں نے جواب دیا کہ معبود کی قسم یا ان کاموں کو انجام دو یا خلافت سے مستعفی ہو جاؤ یا پھر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ انہوں نے کہا کہ وہ اس لباس کو نہیں اتار سکتے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں پہنایا ہے[له]۔

اس طرح طرفین کے درمیان معاملات الجھتے چلے گئے اور مفاہمت کی کوئی امید باقی نہ رہی خلیفہ کے مخالفین جان گئے تھے کہ اگر حضرت عثمان مفاہمت کی راہ انتخاب کرنا بھی چاہیں تو ان کے اطراف میں موجود اموی خاندان کے لوگ انہیں ہرگز ایسا نہ کرنے دیں گے اور وہ مروان کی رضایت اور اس کی موجودگی کے بغیر کسی قسم کے پائیدار معاہدہ کی قدرت نہیں رکھتے۔

اس کے باوجود کہ طرفین جناب امیر علیہ السلام پر پورا اعتماد کرتے تھے اور خود آپ کی دلی آرزو تھی کہ طرفین کے درمیان موجود کشیدگی کو اس طرح حل کیا جائے کہ ہر فریق کو اس کا حق مل سکے اور امت مسلمہ پھر سے خیرو صلاح کی راہ پر گامزن ہوسکے لیکن اس سب کے بعد آپ نے خلیفہ کے مخالفین سے مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھی۔ دو مرتبہ کے تجربہ کے بعد کہ جس میں ہر مرتبہ عثمان نے عہد شکنی کی تھی، آپ نے طرفین کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

آپ نے ابن عباس اور دوسروں سے اس بات کا اظہار کیا کہ ''معبود کی قسم میں نے عثمان کا اتنا دفاع کیا کہ ڈرنے لگا کہ کہیں گناہگاروں میں نہ قرار پاؤں۔''

حضرت عثمان نے نہ صرف خداوندعالم سے کئے گئے عہد کو توڑا بلکہ اپنے گورنروں کو خط لکھ کر مخالفین کے قائدین اور سرخیل کی گردنیں اڑانے کا حکم دیا اس لئے کہ یہ لوگ ان جائز حقوق کا مطالبہ کرتے تھے جو انہیں اسلام نے دیئے تھے۔

له تاریخ طبری جلد پنجم صفحہ ۱۱۲۔

جب جناب امیر علیہ السلام بیچ سے ہٹ گئے اور مذاکرات کے تمام راستے بند ہوگئے تو محاصرہ تنگ ہونے لگا اور لوگ اپنے مطالبات کی منظوری سے مایوسی کے بعد حضرت عثمان پر مزید دباؤ ڈالنے لگے۔

حضرت عثمان کبھی مخالفین سے گفتگو کرتے اور کبھی ان کے مطالبات منظور کئے جانے کی باتیں کرتے تاکہ وقت گذار سکیں اس لئے کہ انہیں ابھی بھی شام سے اس رسد کے پہنچنے کی امید تھی جس کا تقاضا وہ معاویہ سے کر چکے تھے۔

دوسری طرف سے معاویہ اس کام میں تاخیر کر رہا تھا اور سستی دکھا رہا تھا تاکہ اس عرصہ میں انہیں قتل کر دیا جائے اور وہ لوگوں سے ان کا انتقام لے سکے یوں تو وہ بارہ ہزار کی فوج لئے شام سے روانہ ہوچکا تھا لیکن مدینہ سے کافی دور اس نے لشکر کو ٹھہرنے اور اس کے احکامات کا انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ انہیں چھوڑ کر وہ خود مدینہ کی طرف بڑھا اور جب حضرت عثمان کے پاس پہنچا تو انہوں نے رسد کے بارے میں پوچھا اس نے کہا کہ وہ شام کی فوج کو پیچھے چھوڑ آیا ہے تاکہ ان کی رائے معلوم کرسکے اور پھر اسے لیکر آئے۔ حضرت عثمان نے اس سے کہا کہ

"نہیں خدا کی قسم تم مجھے مروانا چاہتے ہو تاکہ میرے بعد تمہیں میرا انتقام لینے کا حق حاصل ہو۔ جاؤ اور اسی وقت انہیں لیکر آؤ۔"

معاویہ پلٹ گیا اور حضرت عثمان کے مارے جانے تک وہ اس لشکر کو نہ لایا[1]۔

اس حقیقت کا انکشاف مورخین کی ایک جماعت نے بھی کیا ہے اور اس وقت کے شواہد و قرائن سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے اس لئے کہ حضرت عثمان کے مخالفین کہ جنہوں نے مدینہ پر چڑھائی کی اور جو تبدیلی کی بات کرتے تھے محاصرہ تنگ کرنے سے قبل یہ لوگ آمد و رفت کرتے رہے اور انہوں نے

---

[1] تاریخ یعقوبی کی روایت۔

مذاکرات بھی جاری رکھے اس عرصہ میں حضرت عثمان کا تمام گورنروں سے رابطہ برقرار تھا ان لوگوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ مخالفین کا جواب تشدد سے دیا جائے اور اس کے بارے میں ان کی امیدوں کا واحد مرکز معاویہ اور شام کی فوج تھی۔ معاویہ کو بھی بڑی سرعت کے ساتھ ان سب باتوں کی خبریں ملتی رہتی تھیں اور جیسا کہ ہم ذکر کرچکے ہیں کہ جب حضرت عثمان کے شدید اصرار پر طرفین کے درمیان صلح برقرار ہوگئی اور لوگ اپنے اپنے شہروں کی راہ لینے لگے تو وہ اپنے تمام وعدوں کو توڑدیتے تھے اور جیسا کہ واضح ہے وہ صرف فرصت کی تلاش میں تھے کہ اس عرصہ میں شام کی فوجیں مدینہ کی مسافت طے کرلیں۔ اس بات کی امید بھی انہیں معاویہ نے دلائی تھی اور آخری وقت تک وہ انہیں یہ امید دلاتارہا۔ اگر وہ دل سے حضرت عثمان کو نجات دلانا چاہتا تو چند دنوں میں یہ کام کر دکھا سکتا تھا لیکن جیسا کہ ہم نے ذکر کیا یہ چیز خود حضرت عثمان سے بھی ڈھکی چھپی نہ تھی اور انہوں نے اس کے سامنے بھی اظہار ناراضگی کیا اور اسے فوجوں کے ساتھ پلٹنے کا حکم دیا۔

زیادہ تر مورخین دعویٰ کرتے ہیں کہ آخری دنوں میں کہ جب محاصرہ تنگ ہوتا چلا جارہا تھا، جناب امیر علیہ السلام نے حسنؑ و حسینؑ کو حضرت عثمان کی حفاظت کے لئے ان کے پاس بھیجا جس طرح سے کہ طلحہ و زبیر نے اپنے اپنے لڑکوں کو بھیجا تھا۔ یہ لوگ دروازے پر پہرہ دینے لگے اور مخالفین کو گھر میں گھسنے سے روکتے رہے اس کام میں ان میں سے کچھ زخمی بھی ہوئے۔ ساتھ ہی مورخین کا یہ بھی نظریہ ہے کہ خود طلحہ کی رہنمائی سے لوگ حضرت عثمان کے گھر میں گھس سکے مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب وصی رسولؐ کو حضرت عثمان کے مرنے کی خبر ملی تو غصہ سے آپ کا براحال ہوگیا۔ آپ دواں دواں حضرت عثمان کے دروازے پر پہنچے اور آپ نے حسین کو سزادی اور محمد بن طلحہ و عبداللہ بن زبیر کو ناسزا کہا اور خلیفہ کی صحیح سے حفاظت نہ کرنے کے سبب ان سب کو قصور وار ٹھہرایا۔

جو شخص بھی اس وقت کے حالات پر گہری نگاہ رکھتا ہو کہ جب سے لوگوں کو حضرت عثمان اور ان کے حواریوں سے خطرہ لاحق ہونا شروع ہوا تھا اور اسے

جناب امیر علیہ السلام کے نقطہ نظر اور آپ کی اصلاحی کوششوں سے مختصر سی واقفیت بھی ہو تو وہ پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ نے ہرگز اپنے صاجزادوں کو ان کی حفاظت کے لئے نہ بھیجا تھا۔ اختلافات حل کرانے کی ان فراوان کوششوں کے بعد جب آپ کو یقین ہوگیا کہ حضرت عثمان اور ان کے حامی اپنی سیاست سے دست بردار نہیں ہوں گے۔ چاہے انہیں اس کی کتنی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑجائے تو آپ اپنے گھر میں نظر بند ہوگئے اور آپ نے حقوق کا مطالبہ کرنے والوں کو ان کے حال پر چھوڑدیا اس لئے کہ بہرحال وہ عدالت کے خواہاں تھے اور جائز حقوق کی بحالی کے نعرے لگاتے تھے۔ ایسے میں بعید نظر آتا ہے کہ آپ فرزندان نبیؐ اور گلستان رسالت کے ان دو پھولوں کو انصاف نہ دینے والوں کی حفاظت کا حکم دیں گے حالانکہ آپ کی پوری زندگی حق و عدالت اور مظلوموں کی دادرسی میں گذری ہو۔

بہرحال محاصرہ تقریباً تین ماہ تک جاری رہا اور اس کے بعد طلحہ کی رہنمائی سے یہ لوگ حضرت عثمان کے گھر میں گھسنے اور انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوگئے۔مورخین کا کہنا ہے کہ اگرچہ ان کی دہلیز پر قدم رکھنے والوں میں محمد بن ابی بکر سرفہرست تھے تاہم ان کے قتل میں شریک نہ ہوئے۔

ایسا لگتا ہے کہ آخری لمحہ تک بھی خلیفہ کے مخالفین انہیں جان سے نہ مارنا چاہتے تھے اس لئے کہ ان کے دلوں میں ابھی بھی ایک موہوم سی امید تھی کہ یا خلیفہ خود خلافت سے مستعفی ہوجائیں گے یا ان کے مطالبات منظور کرلئے جائیں گے۔ لیکن جب مروان بن حکم نے ان کے ایک آدمی کو مار دیا تو وہ مایوس ہوگئے اور انہوں نے خلیفہ کا کام تمام کردیا۔

شرح نہج البلاغہ میں عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ ابوربیعہ مخزومی نے کہا کہ وہ حضرت عثمان کے پاس گئے تو حضرت عثمان ان کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کے پاس لے گئے اور لوگوں کی باتیں سنانے لگے۔ کوئی کہہ رہا تھا "کس چیز کا انتظار کررہے ہو؟" کوئی کہہ رہا تھا کہ جلدی نہ کرو شاید وہ پسپائی اختیار کریں اتنے میں وہاں سے طلحہ کا گذر ہوا۔

ابن عدیس بلوی طلحہ کو دیکھ کر اس کے پاس گیا اور پھر دونوں ایک دوسرے سے رازداری میں کچھ کہنے لگے اس کے بعد ابن عدیس بلوی لوگوں کے پاس آیا اور ان سے کہنے لگا کہ وہ نہ کسی کو عثمان کے پاس جانے دیں اور نہ وہاں سے کسی کو آنے دیں۔ ابوربیعہ کہتا ہے کہ حضرت عثمان مجھ سے کہنے لگے کہ یہ حکم طلحہ نے دیا ہے اے خدا مجھے طلحہ کے شر سے نجات دے اس نے لوگوں کو میرے خلاف ورغلایا ہے۔ معبود کی قسم مجھے یقین ہے کہ اس معرکہ میں وہ خالی ہاتھ رہے گا اور اس کی جان بھی جائے گی ابو ربیعہ کہتا ہے کہ وہ نکلنا چاہتا تھا کہ لوگوں نے مزاحمت کی اور بڑی مشکل سے اسے محمد بن ابی بکر کی وساطت سے باہر جانے کی اجازت ملی۔

ابن عباس یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ جب محاصرہ طولانی ہوگیا تو گروہ انصار میں سے ابن عیاض نامی ایک صحابی نے حضرت عثمان کو آوازدی اور انہیں تسلیم ہونے کے لئے کہا ابھی وہ تسلیم ہونے کے لئے کہہ ہی رہے تھے کہ خلیفہ کے ایک حامی (کثیر بن صلت کندی) نے نشانہ لیکر ان کی طرف تیر رہا کیا اور انہیں مار ڈالا اس پر مصری مشتعل ہوگئے اور انہوں نے حضرت عثمان سے قاتل کو ان کے حوالہ کرنے کا مطالبہ کیا اور حضرت عثمان نے صاف انکار کیا اور ان سے کہا کہ وہ ان کی حمایت کرنے والے شخص کو ان کے حوالہ نہیں کرسکتے۔

نیتجتا" مخالفین ان پر ٹوٹ پڑے اور ان کے قتل میں مختلف شہروں کے لوگوں کے علاوہ انصار کے کچھ لوگوں کا بھی ہاتھ تھا۔

شرح نہج البلاغہ میں یہ بھی مرقوم ہے کہ حضرت عثمان کی مخالفت کرنے میں طلحہ کی شدت پسندی دیکھ کر جناب امیر علیہ السلام نے اس سے فرمایا کہ وہ کیوں عثمان کی جان کے پیچھے لگا ہوا ہے اس نے جواب دیا کہ وہ اس وقت تک ان کے پیچھے لگا رہے گا جب تک کہ بنی امیہ اس کے حقوق بحال نہیں کردیتے۔

مدینہ ہو یا مدینہ سے باہر اسلامی حکومت کے دوسرے نقاط ہوں حضرت

عثمان کے قتل سے ان تمام لوگوں کو خوشی ہوئی جن کے ذاتی مفادات وابستہ تھے جیسا کہ طلحہ، زبیر' سعد بن ابی وقاص اور حضرت عائشہ کا نام اس ضمن میں لیا جاسکتا ہے اور اس سے ان تمام لوگوں کو بھی سکون ہوا جو حضرت عثمان کے بہت سے اقدامات کی وجہ سے انہیں ناپسند کرتے تھے اور مروان بن حکم سمیت بنی امیہ کے دوسرے لوگوں کو نظام حکومت سپرد کرنے کے مخالف تھے. اگرچہ ان دونوں لوگوں کی راہیں الگ اور مقاصد جدا تھے لیکن حضرت عثمان کے جاں بحق ہونے سے ان پر اچھا اثر پڑا تھا البتہ جہاں تک جناب امیر علیہ السلام کا تعلق ہے تو اس مسئلہ میں ان کا نقطہ نظر یکسر مختلف اور سب سے منفرد تھا آپ نے پوری کوششیں کیں کہ معاملات اس نہج تک نہ پہنچیں آپ نے کئی مرتبہ خلیفہ اور ان کے مخالفین کو اعتدال سے کام لینے اور مذاکرات کے ذریعہ باہمی مسائل کو حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ ایسا نہ ہو کہ حقوق کی بحالی میں لوگوں پر جذبات غالب آجائیں اور ضمناً" دہشت گردوں کو اپنے ناپاک عزائم حاصل کرنے کا موقعہ مل جائے آپ نے خلیفہ کو عدالت سے کام لینے' ستم رسیدہ لوگوں کو انصاف دینے اور امت مسلمہ کے مقدر سے کھیل کھیلنے والوں اور ان کے مقدسات کی توہین کرنے والوں کو برکنار کرکے دیندار اور باصلاحیت لوگوں کو ان کی جگہ معین کرنے کا پر خلوص مشورہ دیا۔

اس مدت میں آپ خلیفہ اور ان کے مخالفین کے درمیان آمد و رفت بھی کرتے رہے اور مخالفین کے مطالبات کی منظوری کے لئے خلیفہ کو ایک مناسب مہلت فراہم کرنے میں بھی کامیاب ہوئے لیکن خود خلیفہ اور اس کے حواریوں کی طرف سے آپ کو شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ آخرکار آپ اپنے گھر میں محصور ہوگئے اور ظالم و مظلوم کی اس رسہ کشی میں تقدیر کے فیصلوں کا انتظار کرنے لگے لیکن پھر بھی آپ کی دلی آرزو تھی کہ مسائل صحیح سمت میں آگے بڑھیں اور وہ سب پیش نہ آئے جو پیش آیا۔

اس بارے میں آپ نے اپنے نقطہ نظر کو ایک مختصر سے جملہ میں واضح کردیا جو ایک طویل و عریض کتاب سے بھی زیادہ جامع اور بلیغ ہے آپ فرماتے ہیں کہ'

"میں عثمان کے واقعہ کو تمہارے لئے یوں خلاصہ کرتا ہوں کہ اس نے خود غرضی کی اور اس خود غرضی میں انتہاء کر دی اور تم بھی اس پر ایسے برہم ہوئے کہ تمام حدوں سے تجاوز کر گئے اور اللہ تعالیٰ خود غرض اور برہمی میں حد سے گذرنے والوں کے لئے الگ الگ حکم رکھتا ہے!"[۱]

---

[۱] امام علیہ السلام فرمانا چاہتے ہیں کہ عثمان نے تمام معاملات میں اپنے آپ کو ترجیح دی اور تمام چیزیں اپنے سے مخصوص رکھیں اس خود سری میں وہ تمام حدوں کو عبور کر گیا اور اس کے لئے یہ سب جائز نہ تھا اسی طرح جس انداز میں لوگوں نے اس پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا یہاں تک کہ اسے قتل کر ڈالا، انہیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے تھا اور اللہ تعالیٰ دونوں فریقوں کو ان کے کئے کی سزا دے گا۔ اس سے پہلے امام علیہ السلام کے کلمات کچھ اس طرح سے ہیں کہ "اگر میں اس کے قتل کا حکم دیتا تو قاتلوں میں شمار کیا جاتا اور اگر اس کے قتل کی ممانعت کرتا تو اس کے حامیوں اور مدد کرنے والوں میں قرار پاتا البتہ جس نے اس کی حمایت کی وہ اس کی مخالفت کرنے والوں سے بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور جس نے اس کی مخالفت کی وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس کی حمایت کرنے والوں سے بہتر ہے۔"

امامؑ اور خلافت

"لوگوں کے اژدہام نے مجھے تعجب میں ڈال دیا تھا۔ وہ چاروں طرف سے مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے اور اس طرح مجھ سے لپٹ گئے تھے جیسے کہ بھیڑ بکریاں اپنی چراگاہ میں پناہ لیتی ہیں ان کے ڈالے گئے دباؤ سے میرے پہلو شل ہونے لگے تھے اور نزدیک تھا کہ حسنؑ و حسینؑ کچلے جاتے .... لیکن جب میں اٹھ کھڑا ہوا تو ایک گروہ نے بیعت توڑ ڈالی ' دوسرے نے میری اطاعت سے انکار کیا اور دین سے بھی خارج ہوگئے اور تیسرے نے بغاوت و سرکشی کا راستہ اپنایا۔"

مسلمانوں کو حضرت عثمان کے سانحہ سے برآمد ہونے والے نتائج کا بڑی شدت سے انتظار تھا یعنی یہ کہ ان کی برکناری یا وفات کے بعد کون خلافت کی باگ ڈور سنبھالتا ہے۔ اس لئے کہ کئی لوگ خلافت کے امیدوار بن بیٹھے تھے ان میں ایسے بھی تھے جن کا کام مسائل کو الجھانا اور لوگوں میں اشتعال انگیزی پھیلانا تھا جیسا کہ طلحہ و زبیر اور حضرت عائشہ اس کام میں مہارت رکھتے تھے ان سب میں طلحہ سب سے زیادہ خلافت کا دیوانہ تھا اور اس کا یہ حال ہوگیا

تھا کہ مطلوبہ نتائج برآمد ہونے سے پہلے حضرت عثمان کے بھتیجے جی وہ بیت المال کا متولی بن بیٹھا تھا اور نماز میں لوگوں کی امامت کرنے لگا تھا۔

یوں تو اور لوگوں کی بہ نسبت حضرت عمر کی شوریٰ کے باقی ماندہ چار افراد خلافت کے زیادہ مشہور امیدوار نظر آتے تھے لیکن ان سب میں جناب امیر علیہ السلام سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ مدینہ اور مدینہ سے باہر رائے عامہ آپ کے حق میں تھی یہاں تک کہ حضرت عثمان کے مخالفین میں سے بھی کسی ایک نے آپ کو نظر انداز نہ کیا تھا اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ جن مقاصد کے لئے انہوں نے یہ تحریک چلائی تھی وہ صرف آپ کے زیر سایہ رہ کرہی حاصل ہوسکتے ہیں پھر ان سے طلحہ وزبیر کی طبیعت بھی ڈھکی چھپی نہ تھی اور وہ طلحہ و زبیر اور حضرت عثمان اوران کے حواریوں میں چنداں فرق کے قائل نہ تھے۔ اور ابھی چند دنوں پہلے اس سانحہ میں انہیں بہت قریب سے دیکھ چکے تھے۔

بلاذری ”انساب الاشراف“ میں لکھتے ہیں کہ طرفین کے درمیان مفاہمت کی کوششوں سے مایوسی کے بعد جناب امیر علیہ السلام خانہ نشین ہوگئے تھے چنانچہ جب لوگوں نے حضرت عثمان کا کام تمام کردیا تو لوگوں کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ ان کے لئے ایک ایسا قائد و پیشوا ہونا چاہئے جسے سب مانتے ہوں چنانچہ انہوں نے حضرت علی علیہ السلام کے گھر کا رخ کیا راستہ بھر وہ یہ نعرے لگاتے رہے کہ علی بن ابی طالب ہمارے امام ہیں۔ گھر پہنچ کر انہوں نے آپ کی بیعت کرنے کا تقاضا کیا۔ امام علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ یہ ان کا حق نہیں بلکہ جنگ بدر کے مجاہدوں کا حق ہے اور جسے اہل بدر پسند کریں گے وہی خلیفہ ہوگا چنانچہ تمام اہل بدر آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگے کہ ”ہماری نظر میں کوئی بھی آپ سے زیادہ اس مقام کا حقدار نہیں ہے۔“

مورخ طبری اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان کے قتل کئے جانے کے بعد صحابہ کرام حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کہنے لگے کہ ”لوگوں کے لئے ایک قائد و پیشوا کا ہونا ضروری ہے اور ہمیں آج اس کام کے لئے کوئی بھی آپ سے زیادہ حقدار دکھائی نہیں دیتا“ ---- امام علیہ

السلام نے ان سے فرمایا کہ ایسا نہ کرو اور حاکم بنانے کے بجائے مجھے وزیر ہی رہنے دو انہوں نے جواب دیا کہ وہ ان کی بیعت کئے بغیر نہ جائیں گے چنانچہ وہ اپنے اس مطالبہ پر ڈٹے رہے یہاں تک کہ حضرت نے اس شرط پر انہیں بیعت کی اجازت دی کہ مسجد میں بیعت لی جائے اور تمام لوگ رضامند ہوں![1]

تیسری روایت کے مطابق آپ نے لوگوں کے مزید اصرار کے باوجود بھی انہیں بیعت کی اجازت نہ دی چنانچہ انہوں نے مالک بن اشتر نخعی کو ثالث بنایا جو کوفہ سے آئے ہوئے وفد کی سربراہی کر رہے تھے مالک نے آپ سے دست بیعت مانگا تو آپ نے منع کر دیا اس پر مالک نے اس وقت موجود مسائل اور خطرات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائی اور دلائل کے ذریعہ آپ کو بیعت لینے پر مجبور کر دیا اور لوگ چاروں طرف سے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ اس وقت زبیر کھڑے ہوئے انہوں نے حمد و ثناء الٰہی کرنے کے بعد لوگوں سے خطاب کر کے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جمہوریت کو پسند کیا ہے اور اس کے ذریعہ ہوس انسانی کی نفی کی ہے اور کیونکہ باہمی صلاح و مشورے کے بعد علی کو منتخب کیا گیا ہے لہٰذا وہ ان سے بیعت کریں۔

"امامت و سیاست" میں ابوثور سے ایک روایت نقل کی گئی ہے ابوثور کہتا ہے کہ،

"جب حضرت عثمان کے قتل کے بعد بیعت کرنے کی باری آئی تو میں حضرت علی کے پیچھے ہولیا اس وقت ان کے چاروں طرف لوگوں کا ہجوم لگا ہوا تھا جو ان سے بیعت کر رہا تھا یہاں تک کہ وہ بنی مازن کی دیواروں تک جا پہنچے لیکن یہ ہجوم آپ کو کجھور کے ایک درخت تک لے گیا اور میرے اور ان کے درمیان حائل ہو گیا اس وقت میں نے دیکھا کہ ہر طرف سے لوگ اپنے ہاتھ آپ کے ہاتھ پر رکھ رہے تھے اور آپ کے دست بیعت کو تھامے ہوئے تھے پھر جب وہ آپ کو مسجد میں لیکر آئے تو جس نے سب سے

---

[1] تاریخ طبری جلد پنجم۔

پہلے منبر پر چڑھ کر آپ کے ہاتھ پر بیعت کی وہ طلحہ تھا۔ اس وقت اس کی انگلیاں مفلوج (شل) ہوگئیں تھیں۔

آپ نے ان پر ایک نگاہ ڈالی اور فرمایا کہ ''زیادہ وقت نہ لگے گا کہ یہ عہد شکنی کریں گی۔''

طلحہ کے بعد زبیر اور دوسرے صحابہ کرام اور پھر مدینہ میں موجود تمام مسلمانوں نے آپ سے بیعت کی۔![1]

خود امام علیہ السلام نے بھی آپ سے بیعت کئے جانے کے بارے میں مسلمانوں کے طرز عمل اور ان کے شدید اصرار کو اپنے مشہور اور معروف خطبہ شقشقیہ میں بیان کیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ'

لوگوں کے اژدہام اور انبوہ کثیر نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ وہ چاروں طرف سے مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے اور اس طرح مجھ سے لپٹ گئے تھے جیسا کہ بھیڑ بکریاں اپنی چراگاہ میں (چرواہے کے ساتھ) سکون کا احساس کرتی ہیں۔ انہوں نے مجھ پر اتنا دباؤ ڈالا کہ دونوں پہلو شل ہونے لگے اور نزدیک تھا کہ حسن و حسین کچلے جاتے لیکن میں نے ان کی زمام امور تھام لی تو ان میں سے کچھ نے عہد شکنی کی۔ کچھ نے خوارج کا روپ اپنایا اور کچھ نے بغاوت و سرکشی کی گویا کہ انہوں نے یہ فرمان الٰہی نہ سنا تھا کہ ''اس آخرت کے گھر کو ہم نے صرف ان لوگوں سے مخصوص رکھا ہے جو نہ زمین پر سرکشی کے ارادے رکھتے ہیں اور نہ فساد پھیلاتے ہیں اور عاقبت تو صرف پرہیز گاروں اور خدا سے ڈرنے والوں کی ہے (کیوں نہیں انہوں نے اچھی طرح سنا اور سمجھا تھا لیکن دنیا کی چمک دمک نے انہیں اسیر کر لیا تھا اور اس کے زر و جواہرات پر ان کے دل آگئے تھے۔) اس پاک و منزہ ذات کی قسم کہ جس نے دانے میں شگاف ڈالا اور جسموں میں روح پھونکی اگر بیعت اور نصرت و حمایت کرنے والوں کی موجودگی سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوگئی ہوتی اور اگر خداوند عالم نے علماء سے یہ

---

[1] ابن قتیبہ کی مشہور عالم کتاب' الامامہ والسیاسہ۔

عہد نہ لیا ہوتا کہ وہ ظالم کی شکم پری اور مظلوم کے فاقوں پر چین سے نہ بیٹھیں گے تو میں افسار خلافت رہا کر دیتا اور اس کے آخر کو بھی اس پیالہ سے سیراب کرتا جس سے اس کے اول کو کیا تھا۔ پھر تم دیکھتے کہ میری نظر میں تمہاری دنیا بکری کے منہ سے نکلنے والی چھینک سے بھی زیادہ بے قیمت ہے[1]۔

حضرت عثمان کی وفات کے تین یا پانچ دن بعد جب فساد سے بھرپور فضا میں آپ نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ دیکھا تو اس وقت آپ سے بیعت کی گئی۔ آپ سے انصار و مہاجرین اور ان تمام لوگوں نے بیعت کی جو مختلف شہروں سے آئے ہوئے تھے اور قریش کے چند افراد کے علاوہ کہ جن میں مروان بن حکم ' سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن عمر جیسے لوگ تھے 'کسی نے آپ کی بیعت سے انکار نہ کیا۔

اگر مروان اور دوسرے امویوں نے آپ کی بیعت سے منہ موڑا تو یہ ان کے لئے کوئی حیرتناک بات نہ تھی اس لئے کہ بنی ہاشم اور دوسرے برسراقتدار آنے والوں کے بارے میں ان کی دیرینہ تاریخ اس بات کی تائید کرتی ہے۔ البتہ جہاں تک سعد بن ابی وقاص کا تعلق ہے تو وہ خود خلافت کا امیدوار تھا اگر حالات اسے اس بات کی اجازت دیتے تو وہ اس سلسلہ میں کوئی کوتاہی نہ کرتا وہ پہلے سے اس کے بارے میں سوچ رہا تھا اس لئے کہ حضرت عمر نے جن چھ افراد کو خلافت کا امیدوار بنایا تھا' ان میں وہ بھی شامل تھا۔ اسے اس کی حیثیت سے زیادہ رتبہ مل گیا تھا۔ اس لئے کہ ہمارے خیال میں اس سے پہلے نہ کبھی اس کے سر میں خلافت کا سینگ سمایا تھا اور نہ لوگوں نے یہ تصور قائم کیا تھا کہ آنے والے ایام میں وہ اسے جناب امیر علیہ السلام کا حریف سمجھنے لگیں گے۔ تاہم جب اس نے دیکھا کہ لوگوں نے طلحہ و زبیر کی بھی چھٹی کر دی ہے جو اس سے کہیں زیادہ وجاہت رکھتے تھے ' صحابہ کرام میں بھی ان کا خاص مقام تھا اور کوفہ و بصرہ میں بھی خاصی شہرت تھی تو پھر وہ کیا حیثیت رکھتا ہے

---

[1] خطبہ نمبر ۳ (نہج البلاغہ)۔

چنانچہ اس کے بعد اس نے خلافت کے امور میں مداخلت نہ کی لیکن خاندان بنی امیہ سے اظہار ہمدردی کی خاطر بیعت بھی نہ کی۔ وہی خاندان جس سے وہ ماں کی طرف سے منسلک ہوتا تھا اس نے ہمیشہ سے اس خاندان کا ساتھ دیا تھا حتیٰ اس وقت بھی جب حضرت عثمان نے اسے معزول کر کے اپنے سوتیلے بھائی ولید بن عقبہ کو وہاں کا گورنر بنا دیا تھا۔

خلیفہ رسولؐ اس کی ان تمام باتوں سے واقف تھے جیسا کہ خاندان بنی امیہ کے رجحانات اور طلحہ و زبیر کا انجام آپ سے ڈھکا چھپا نہ تھا۔ چنانچہ اپنے بارے میں ان لوگوں کے خیالات اور نقطہ نظر کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ'

اے خدا قریش سے بدلہ لینے میں میں تیری مدد کا خواستگار ہوں۔ اس لئے کہ انہوں نے مجھ سے تمام رشتے توڑ دیئے تھے اور میرے صبر کے پیانہ کو لبریز کر دیا تھا۔ اس وقت میں نے نگاہ اٹھا کر جو دیکھا تو اپنے اہل خانہ اور گھر والوں کے علاوہ کسی کو اپنا حامی و مددگار اور غمگسار نہ پایا[1]۔

ایک اور موقعہ پر آپؑ نے فرمایا کہ'

مجھے قریش سے کیا سروکار خدا کی قسم میں نے اس وقت ان پر تلوار اٹھائی تھی جب وہ کافر تھے اور اب بھی جبکہ وہ دھوکہ کھا چکے ہیں ان سے جنگ کروں گا اور جیسا کہ کل ان کا حریف تھا' آج بھی ہوں[2]۔

جب سعد بن ابی وقاص کو آپ کی بیعت کے لئے کہا گیا تو اموی خاندان کی دلجوئی کی خاطر اس نے آپ سے کہا کہ اسے آپ پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اپنے حامیوں کو اس سے زبردستی بیعت لینے کی ممانعت کی۔ اسی طرح جب عبداللہ بن عمر سے بیعت طلب کی گئی تو اس نے انکار کیا۔ آپ نے اسے کسی سے ضمانت لانے کے لئے کہا کہ وہ آپ کے خلاف ہونے والی سرگرمیوں میں کسی کا ساتھ نہ دے گا۔

---

[1] نہج البلاغہ (اردو) - خطبہ نمبر ۲۱۵-
[2] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۳۳ -

لیکن جب اس نے اس چیز کی ضمانت لانے سے بھی انکار کیا تو آپ خود اس کے ضامن بن گئے اور لوگوں سے اسے چھوڑنے کے لئے کہا تاہم خود اس کے گوشزد کیا کہ بچپن سے لے کر اس سالخوردگی تک وہ ویسا ہی بد اخلاق ہے۔

بیعت سے فارغ ہوکر مولائے متقیان نے پہلے دن سے اپنی تمام تر توانائیاں حضرت عثمان کے دور حکومت کی بدعنوانیوں کو ختم کرنے میں صرف کیں۔ اس دور میں حکومت کے ہر شعبہ کو نقصان پہنچا تھا اور ہر چیز کو تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ آپ نے ان تمام مشکلات کی طبقہ بندی کی اور ان میں ان اہم امور کو اولیت دی جن سے لوگ عاجز آگئے تھے۔ چنانچہ سب سے بڑا درپیش مسئلہ حضرت عثمان کے والیوں کا تھا جن کی وجہ سے انہیں اس بحران سے دوچار ہونا پڑا تھا جس میں ان کی جان بھی چلی گئی تھی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد آپ ترتیب وار ان مسائل کو لے کر آگے بڑھے۔ تاہم یہ مصروفیات اس بات کا سبب نہ بنیں کہ آپ لوگوں کے لئے ان خطوط فکری کو واضح نہ کر سکیں جن پر آپ نے مستقبل میں چلنا تھا۔ چنانچہ ابھی خلافت سنبھالے چند دن ہی گزرے تھے کہ آپ منبر پر تشریف لے گئے اور عوام الناس سے خطاب کرکے آپ نے ان تمام غلط قوانین کو منسوخ کرنے کا اعلان کیا جو بیس سال سے بھی زیادہ رائج رہے تھے۔ آپ کو پورا یقین تھا کہ اگر حضرت عمر مال غنیمت کی تقسیم میں لوگوں کے تشخص اور اسلام میں ان کے سابقہ کو مدنظر رکھتے تھے تو انہیں اسلامی قوانین سے زیادہ اپنے مفادات کی فکر تھی۔ اسی طرح اگر حضرت عثمان نے اپنے عزیزوں کو بیت المال پر ہاتھ صاف کرنے کی کھلی چھوٹ دی ہوئی تھی تو وہ زمانہ جاہلیت اور امویت کے اس رنگ و روپ کو رونق بخشنا چاہتے تھے جو اس اسلام سے سیاسی منافرت رکھتا تھا جو کسی کو کسی پر امتیاز نہ دیتا تھا۔

آپ لوگوں کے اس عظیم الشان مجمع کے سامنے کھڑے ہوئے تھے جو آپ سے ہرگز ان چیزوں کی توقع نہ رکھتا تھا جس کا عہد رفتہ میں مظاہرہ ہو چکا تھا۔

چنانچہ آپ نے ان سے فرمایا کہ '

اے لوگو! میں تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہوں۔ جو تمہارے لئے ہے

وہی میرے لئے ہے اور جس میں تمہارا نقصان ہے اس میں میرا نقصان ہے بے شک میں تمہیں تمہارے نبیؐ کی سنت پر چلانا چاہتا ہوں اور تمہارے درمیان ان چیزوں کو رائج کرنے کا خواہاں ہوں جن کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔

اس طرح آپ نے اپنی سیاست کے بنیادی اصولوں کو لوگوں پر واضح کر دیا۔

آپ کے فرمودات میں یہ بھی تھا کہ '

آگاہ رہو! زمین کا ہر وہ ٹکڑا جسے عثمان نے کسی کو بخشا ہو یا وہ تمام مال و دولت جو اللہ تعالیٰ کے مال میں سے لوگوں کی نذر کیا گیا ہو گا بیت المال میں واپس ہو گا۔ اس لئے کہ اس حق اللہ کو کوئی چیز ضائع نہیں کر سکتی۔ چنانچہ اگر میں نے دیکھا کہ اس سے شادیاں کی گئی ہیں یا اسے کنیزوں کی خریداری میں صرف کیا گیا ہے اور شہروں میں بانٹ دیا گیا ہے تو اسے پلٹا کر رہوں گا۔ بے شک وسعت و گنجائش عدل میں ہے اور اگر عدالت کسی پر اتنی ہی ناگوار گزرتی ہے تو ظلم اس سے زیادہ اس پر عرصہ حیات تنگ کرے گا۔

اے لوگو! ایسا نہ ہو کہ تم میں جو لوگ دنیا کی چمک دمک میں ڈوب کر زمینوں اور نہروں کے مالک بن بیٹھے ہیں اور ان کے قبضہ میں گھوڑے اور کنیزیں ہیں ' اگر میں کل یہ چیزیں ان سے لے لوں اور ان فرائض کی جانب ان کی توجہ دلاؤں جنہیں وہ بخوبی پہچانتے ہیں تو وہ کہیں کہ علی بن ابی طالب نے ہمیں ہمارے حقوق سے محروم کر دیا ہے۔

اگر مہاجرین و انصار میں سے کوئی شخص جناب رسالتمآبؐ کی ہم نشینی کی بنا پر اپنے کو دوسروں سے بہتر سمجھنے لگے تو وہ یاد رکھے کہ یہ برتری کل بارگاہ ربوبی میں ملے گی اور اس کا اجر و ثواب بھی وہی ذات اقدس دے گی۔

یاد رکھو! تم میں سے جس کسی نے بھی خدا اور رسول کی دعوت کو قبولیت کا شرف بخشا وہ ہماری قوم کا فرد بن گیا' ہمارے دین میں داخل ہو گیا اور اس نے ہمارے قبلہ کو تسلیم کر لیا۔ چنانچہ اسلامی حقوق کی انجام دہی اور اسلامی حدود کی رعایت اس پر واجب ہو گئی۔

پس تم لوگ خدا کے بندے ہو اور یہ مال خدا کا مال ہے جسے تمہارے درمیان مساوات اور بغیر کسی تفریق کے تقسیم کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں پرہیزگاروں کے لئے اس سے بہتر صلہ موجود ہے۔ جب کل آپہنچے گی تو خدا کے یہاں ایک دوسرے کا خوب لحاظ رکھیں گے اور تم سے کوئی بھی ' چاہے عرب ہو یا عجم ' اس کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔

چنانچہ اپنے اس تاریخی بیان کے ذریعہ آپ نے اس سیاست کو لوگوں کے ذہنوں میں ترسیم کر دیا جس کی بنیاد عدالت خواہی پر رکھی جاتی تھی اور جو ایک کو دوسرے پر برتری دیئے بغیر سب کے حق میں تھی۔

نتیجتاً " قریش اور دوسرے مہاجرین میں سے بہت سے لوگوں کے لئے یہ برداشت کرنا مشکل ہوگیا کہ وہ غلام اور نوکر طبقہ کی طرح مراعات سے برخوردار ہوں۔ خاص طور پر طلحہ و زبیر جنہیں حضرت عمر نے آپ کے برابر لاکھڑا کیا تھا۔ ان دونوں نے کوفہ و بصرہ کی امارت کے خواب دیکھے تھے لیکن یہ خواب پورے نہ ہوئے تھے اور اب جناب امیر علیہ السلام اپنے تاریخی بیانات میں انہیں غلاموں کے برابر کئے دے رہے تھے اور کسی شہر کا والی بنانے کے لئے تیار نہ تھے۔ جب انہوں نے یہ تقاضا آپ سے کیا تو آپ نے انتہائی پیار و محبت اور نرمی سے ان سے کہا کہ '

"میں پسند کرتا ہوں کہ تم دونوں میرے ساتھ رہو میں تم سے محظوظ ہوں گا اور تمہاری آراء و انظار کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھوں گا۔ بے شک تمہاری جدائی سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔"

جناب امیر علیہ السلام نے ان دونوں کے بارے میں اپنے اس نقطہ نظر میں تبدیلی نہ کی اس لئے کہ آپ دونوں کی نیتوں سے واقف تھے اور انہیں بچپن سے لیکر اب تک دیکھتے چلے آرہے تھے کل ہی آپ نے انہیں حضرت عثمان کے خلاف بیج بوتے دیکھا ان کا یہ غضب نہ رضاء الٰہی کی خاطر تھا اور نہ اسلام کے لئے ان کے دل پسیج گئے تھے بلکہ صرف اقتدار کا نشہ تھا۔ انہوں نے آپ کے بیانات میں سن لیا تھا کہ آپ کسی کے لئے خاص مراعات کے قائل نہیں

ہیں اور وہ آپؑ کے اس جدید دور میں صرف اس مختصر سے وظیفہ کو حاصل کر سکیں گے اور اس طرح پابندیوں کا وہ دور شروع ہوجائے گا جس کی بنیاد حضرت عمر نے رکھی تھی چنانچہ انہوں نے کچھ عرصہ کے لئے خاموشی اختیار کی لیکن پس پردہ اس نئے حکم کی مخالفت کرنا شروع کر دی۔

ضمنا" انہوں نے بنی امیہ سے اتحاد بھی کرلیا اور انہیں جناب امیر کے بارے میں حضرت عائشہ کی دھواں دار تقریروں اور منفی رجحانات سے مزید تقویت پہنچی۔ حضرت عائشہ کو جب حضرت امیر سے بیعت کئے جانے کی خبر ملی تو نزدیک تھا کہ غم و غصہ سے وہ جان دے دیتیں انہوں نے آپ کے خلیفہ بننے پر یوں تبصرہ کیا تھا کہ "اے کاش اس کے بعد یہ حادثہ پیش نہ آتا۔ وہ یہ کہتی ہوئی الٹے پاؤں مکہ پلٹ گئیں کہ عثمان کو مظلومیت کے ساتھ قتل کیا گیا ہے اور وہ اس کے لہو کا خراج لیں گی۔ جب عبیدہ بن ابی سلمہ نے ان کے گوشزد کیا کہ سب سے پہلے انہوں نے ہی اپنی بات کی تردید کی ہے اس لئے کہ کہتی تھیں کہ نعثل کو قتل کر ڈالو وہ کافر ہوگیا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ اس لئے کہ لوگوں نے پہلے اس سے توبہ کروائی تھی اور پھر اسے قتل کیا تھا اور اگرچہ اور لوگوں کی طرح انہوں نے یہ جملہ کہا تھا لیکن ان کا دوسرا قول پہلے سے بہتر ہے۔"

مورخ طبری عبیدہ بن ابی سلمہ کے ان اشعار کو نقل کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت عائشہ کے اس جواب میں کہے تھے۔

فمنک البداء و منک الغیر   و منک الریاح و منک المطر

و انت امرت بقتل الامام   و قلت له انه قد کفر

فھبنا اطعناک فی قتله   وقاتله عند نامن امر

ولم یسقط السقف من فوقنا   ولم تنکسف شمسنا والقمر

آپ ہی شروع کرتی اور آپ ہی پھوٹ ڈالتی ہیں

آپ ہی ہوا دیتی اور بارش برساتی ہیں

آپ ہی نے خلیفہ کے قتل اور ان کے کافر ہونے کا فتویٰ دیا بالفرض اگر ہم نے انہیں قتل کرنے میں آپ کی اطاعت بھی کی ہو تب بھی ہماری نظر میں قاتل وہ ہے جس نے اس کا حکم دیا۔ نہ آسمان ہم پر ٹوٹ پڑا اور نہ چاند سورج کو گرہن لگا۔

اس میں شک نہیں کہ طلحہ وزبیر اور حضرت عائشہ کے اغراض و مقاصد میں حد درجہ اختلاف تھا ان میں سے ہر ایک دوسرے کے خون کو جائز و مباح سمجھتا تھا تاہم طلحہ کے سبب حضرت عائشہ کچھ زیادہ ہی حضرت عثمان کی دشمن بنی ہوئی تھیں بہت سے مسلمانوں نے خود ان کی زبان سے سنا تھا کہ اس نعثل کو قتل کر ڈالو یہ کافر ہوگیا ہے لیکن اب انہیں مفادات کی وجہ سے کل کے دشمن آج کے دوست بن گئے تھے اور اس نئی حکومت کے مقابلہ میں صف باندھ کے کھڑے ہوگئے تھے۔ امتیازات سے برخوردار اور غریبوں کا خون چوسنے والے ان ناسوروں نے اس نئی حکومت کے خلاف نفرت پھیلانی شروع کردی تھی اس لئے کہ یہ حکومت ہر انسان کو اس کا جائز حق دیتی تھی اور کسی کو دوسرے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ دیتی تھی۔

جناب امیر علیہ السلام کے مخالفین میں حضرت عائشہ پیش پیش تھیں اور آپ کے خلاف بغاوت میں بھی انہی کا زیادہ ہاتھ تھا آپ کے خلیفہ بننے سے لیکر جنگ جمل تک رونما ہونے والے واقعات اس بات کی بخوبی تائید کرتے ہیں۔

مورخین کی ایک جماعت لکھتی ہے کہ اس مخاصمت کے کئی اسباب تھے ان کی پہل جناب رسالتمآبؐ کی حیات میں اس وقت ہوئی جب آنحضورؐ جناب سیدہ کی طرح آپ کو بھی اپنے سے دور نہ ہونے دیتے اور تمام مسلمانوں پر افضلیت دیتے تھے اور بلاشبہ وہ اس مقام و منزلت کو اپنے اور اپنے باپ کے لئے چاہتی تھیں۔ نیز آپ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی صاحبزادی کے شوہر تھے کہ جن کے شرف، بلند اخلاق اور اسلام کی راہ میں ان کی بے بہاء قربانیوں نے آنحضورؐ کے دل میں گھر کرلیا تھا چنانچہ جب بھی جناب رسالتمآبؐ ان کا ذکر خیر کرتے

تو حضرت عائشہ اپنی حسادت کو مخفی نہ رکھ پاتیں مزید بر آں آپؐ ہی کی وساطت سے حضرت ماریہ قبطیہ کا دامن اس تہمت سے پاک ہوا جو حضرت عائشہ ان پر لگا رہی تھیں اور آنحضورؐ کی غزوۂ بنی المصطلق سے واپسی پر جب لوگوں نے ان کے بارے میں اپنی زبانیں کھولیں تو حضرت عائشہ ہی نے آنحضورؐ کو انہیں طلاق دینے کا مشورہ دیا تھا۔ اس واقعہ کو "حدیث افک" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بغض و دشمنی کے یہ اسباب اسی طرح جمع ہوتے رہے اور یہ نوبت آگئی کہ غصہ کے مارے وہ ہوش و حواس کھونے والی تھیں۔ انہوں نے اپنی اس عداوت کا آخری ثبوت حضرت عثمان کی وفات کے بعد دیا تھا[1]۔

بہرحال جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں جناب امیر علیہ السلام سے معرکہ آرائی کے اسباب و علل متعدد تھے جناب امیر علیہ السلام نے بھی اپنے ایک خطبہ میں اس دشمنی و عناد کا انکشاف کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ'

"جہاں تک ان صاحبہ (عائشہ) کا تعلق ہے تو عورتوں کی بے عقلی ان پر چھاگئی ہے اور کینہ و عناد ان کے سینہ میں لوہے کے کڑھاؤ میں موجود لوہے کی طرح ابل رہا ہے جو کچھ انہوں نے میرے ساتھ کیا اگر ان سے کسی اور کے ساتھ کرنے کے لئے کہا جاتا تو ہرگز تیار نہ ہوتیں۔ اس سب کے باوجود ان کی حرمت اپنی جگہ ہے اور حساب و کتاب اللہ تعالیٰ پر ہے۔"[2]

جناب امیر علیہ السلام کو پہلے دن سے صرف طلحہ و زبیر' حضرت عائشہ اور امویوں کی طرف سے کھڑی کی جانے والی مشکلات کا سامنا نہ تھا بلکہ معاویہ بھی آپ کا حریف تھا اور اس کا وجود آپ کی خلافت کے لئے ان سب سے زیادہ

---

[1] مصنف حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی کتاب "سیرۃ المصطفیٰ" میں غزوۂ بنی المصطلق کے ضمن میں ذکر کیا ہے کہ داستان افک کو جس طرح سے مورخین نے نقل کیا ہے وہ جھوٹ اور بے بنیاد ہے اور یہ تہمت حضرت عائشہ کے بجائے حضرت ماریہ قبطیہ پر لگائی گئی تھی اس وقت جبکہ آنحضورؐ سے ان کی آغوش میں حضرت ابراہیم آگئے تھے۔ تاہم جناب امیر علیہ السلام کی طرف سے کرائی جانے والی تحقیقات کے بعد ان کی بے گناہی ثابت ہوگئی تھی۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۵۶۔ (اردو ۱۵۴)۔

خطرناک تھا اس لئے کہ وہ ان لوگوں سے کہیں زیادہ سلطنت واقتدار کا رسیا تھا۔ اس کی اقتدار طلبی اس کے ان آباء واجداد کی اقتدار طلبی کا پھل تھی جنہوں نے سالہا سال پیغمبر اکرمؐ سے اقتدار کی جنگیں لڑی تھیں اور جب حضرت عثمان کے دور میں اسے مکمل آزادی ملی تو اس نے پیسہ کے بل بوتے پر حمایتی جمع کرنے اور لوگوں کو خریدنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی چنانچہ وہ لالچی اور دنیا دار لوگوں پر مشتمل ایک ایسی فوج تشکیل دینے میں کامیاب ہوگیا جو حکومت سے نہیں بلکہ اس سے وفادار تھی اور اس کے ذاتی مفاد کے لئے کام کرتی تھی۔ بغاوت کا سر کچلنے کے لئے حضرت عثمان نے اس سے کئی مرتبہ مدد چاہی لیکن وہ آخری وقت تک صرف وعدے ہی دیتا رہا۔

جناب امیر علیہ السلام معاویہ کی ان سیاستوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ آپ جانتے تھے کہ وہ آپ کے خلاف ایک مسلحانہ جنگ کا آغاز کرے گا اور رائے عامہ کو غلط فہمی کا شکار کرنے کے لئے حضرت عثمان کے خون کا بہانہ بنائے گا آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اسے شام کے علاوہ کوفہ و بصرہ کی امارت بھی بخش دی جائے تو بھی وہ آپ کے خلاف سرتسلیم خم نہ کرے گا اور اگر آپ ابن عباس اور مغیرہ بن شعبہ کے کہنے پر اسے کچھ عرصہ کے لئے شام میں باقی رہنے دیں گے تو وہ آپ کے خلاف طاقت کا استعمال کرے گا اور دلائل کو سامنے رکھ کر آپ کے خلاف زبان کھولے گا۔ بہرحال جب تک آپ کی فوجوں کے مقابلہ میں شام کی فوجیں اس سے زیادہ وفادار تھیں آپ اس کے بارے میں کسی مطلوبہ نتیجہ تک نہ پہنچ سکتے تھے۔

مزید برآں آپ کی حکیمانہ سیاست متقاضی تھی کہ معاویہ سمیت حضرت عثمان کے تمام گورنروں کو برکنار کرنے میں سختی سے کام لیں اس لئے کہ آپ حضرت عثمان سے آخری لمحوں میں اس چیز کا پر زور مطالبہ کر چکے تھے اور دوست و دشمن آپ کے اس مطالبہ سے واقف تھے لہٰذا کیونکر ممکن تھا کہ کل اتنا شدید موقف اختیار کرنے کے بعد آج اتنی نرمی دکھاتے کہ معاویہ جیسے کو شام میں باقی رہنے دیتے۔ اگر ایسا کرتے تو لوگوں کو کیا جواب دیتے!

مولائے متقیانؑ کو اقتدار سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آپ کی نظر میں حکومت حق و انصاف کو معاشرے میں رائج کرنے اور مظلوم و ستم رسیدہ لوگوں کی دادرسی کا ایک وسیلہ بیش نہ تھی چنانچہ آپ کے نزدیک معاویہ کو ایک دن کے لئے بھی باقی رکھنا باطل سے سمجھوتہ کرنے، لوگوں کو گمراہ کرنے، دین میں شگاف ڈالنے اور غلط طریقہ سے اپنے اغراض و مقاصد حاصل کرنے کے مترادف تھا اس لئے محال تھا کہ آپ اتنی نچلی سطح پر آکر اس قسم کی سیاست میں ہاتھ ڈالتے لہٰذا آپ نے معاویہ کو باقی رکھنے کا مشورہ دینے والوں کو یہ جواب دیا کہ،

"میں گمراہ لوگوں کو اپنا دست و بازو نہیں بنا سکتا۔"

استاد عبدالفتاح عبدالمقصود حضرت عثمان اور ان کے گروہ کے بارے میں جناب امیر علیہ السلام کی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ،

حضرت علی کی سیاست کا جائزہ لینے والا بخوبی آپ کی رائے کی درستی کا اندازہ لگا سکتا ہے اس لئے کہ انہوں نے حضرت عثمان کے گورنروں کو ہٹاکر ایماندار اور اصولوں کے پابند لوگوں کو ان کی جگہ معین کیا تھا۔ وہ یہ نتیجہ بھی باآسانی نکال لے گا کہ آپ سیاسی بصیرت کو کام میں لاتے تھے اور پورا عالم اسلام آپ کو دل و جان سے قبول کرتا تھا اس لئے گورنروں کے سلسلہ میں آپ نے وہی کچھ کیا جسے لوگ دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے چنانچہ تمام اسلامی ریاستیں آپ کے زیر سایہ آگئیں البتہ جہاں تک شام کا تعلق ہے تو اس پر اقتدار کا اندھا' حاکم تھا جس کے اقرار و انکار کی کوئی اہمیت نہ تھی اور اس کا طرز عمل اس کی سرکشی کا نتیجہ تھا اس لئے کہ وہ اس سلطنت کو واپس لئے بغیر چین سے بیٹھنے والا نہ تھا جو اس کے حریف کے قبضہ میں چلی گئی تھی۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ اگر امام علیہ السلام اسے اس منصب پر برقرار رہنے دیتے تو وہ لوگوں کے سامنے کہیں زیادہ اپنی قدرت و حاکمیت کے مظاہرے کرتا اس لئے کہ وہ لوگوں کو باور کرا دیتا کہ جس شخص کی اس نے بیعت سے انکار کیا وہی اسے اپنا والی بنانے پر مجبور ہے وہ سمجھتا کہ آپ نے یہ قیمت اس کا منہ بند کرانے اور آپ پر حضرت عثمان کے خون کا الزام نہ لگانے کے لئے ادا کی

ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنی خلافت کو درپیش ان تمام مشکلات کا مقابلہ اپنی حکیمانہ سیاست سے کیا اگر آپ کی خلافت کے مقدر میں کامیابی نہ لکھی تھی تو اس کے اسباب کچھ اور تھے جن میں سب سے اہم سبب یہی تھا کہ آپ نے سانحہ عثمان کے بعد اس وقت خلافت سنبھالی تھی جب دوسرے شہروں سے آئے ہوئے مسلمان ابھی مدینہ میں موجود تھے۔ یوں تو وہ سب حضرت عثمان کی سیاست پر رنجیدہ تھے اور مل کر ان کے خلاف اظہار ناراضگی بھی کر چکے تھے لیکن ان سے چھٹکارا پانے میں صرف کچھ لوگوں نے مدد کی تھی جن کے اغراض و مقاصد یکسر مختلف تھے کچھ افراد کے علاوہ کہ رضائے الٰہی جن کا نصب العین تھا اور ستم رسیدہ انسانیت کے لئے جنہوں نے قیام کیا تھا' ان میں سے زیادہ ترلوگوں کا محرک اخلاص کے علاوہ دوسری چیزیں تھیں۔ چنانچہ انتہائی بحرانی حالات میں جب کہ قریش کے زیادہ تر لوگ آپ سے نفرت کرتے تھے اور مخالفت و سرکشی کے ایک ایسے ماحول میں جہاں مال و دولت نے تمام اقدار کی جگہ لے لی تھی 'آپ نے خلافت کا بیڑا اٹھایا۔

پھر بھی کوئی آپؑ کے بارے میں یہ تصور قائم نہ کر سکتا تھا کہ آپ اسلام کی قیمت پر کسی سے سمجھوتہ کریں گے یا بیت المال کے ایک سکہ کو بھی غلط جگہ استعمال کریں گے چنانچہ ایک لازمی سی بات تھی کہ ہر طرف سے آپ کے لئے مشکلات کا طوفان اٹھ کھڑا ہو گا اس لئے کہ آپ لوگوں کو خدا کی کتاب اور اس کی سنت پر چلانا چاہتے تھے اور ایک ایسی مثالی اور آئیڈیل خلافت کی بنیاد رکھنے پر بضد تھے جو ان کے لئے تازگی رکھتی تھی۔

آپ کی نظر میں مسلمانوں کے خلیفہ کا اولین فرض یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قوانین اور کتاب شریعت کو ہر قسم کی بے جا توجیہات اور انحرافات سے بچائے 'زمین پر فتنہ و فساد کی روک تھام کرے اور حاکم طبقہ یا کسی خاص گروہ کے مفادات کو مدنظر رکھے بغیر حکومت کے اثاثوں کی پاسداری کرے۔ آپ نے بغیر کسی کم وکاست کے ان اصولوں کو نافذ کرنے اور استحکام بخشنے کی کوشش کی

اور دوسروں کے برخلاف جنہوں نے سنت رسولؐ کو چھوڑ، ظالم و جابر حکمرانوں کا شیوہ اپنایا تھا، آپ نے رتی برابر بھی سنت رسولؐ سے انحراف نہ کیا۔ آپ نے معاویہ کو شام سے ہٹانے کی کوشش بھی کی اور اس مقصد کے لئے سھل بن حنیف کو والی شام بناکر بھیجا لیکن سرحدوں پر موجود معاویہ کے آدمیوں نے انہیں شہر میں داخل نہ ہونے دیا اور وہ واپس ہوگئے۔ مسلمانوں کو ان کی واپسی کا خاصا افسوس ہوا اور یہ یقین ہوگیا کہ معاویہ تسلیم ہونے کے بجائے آپ کے خلاف لڑائی کا ایک محاذ کھولے گا اور بیس سال سے جب سے کہ وہ شام میں برسراقتدار آیا تھا، اپنی جمع کی ہوئی تمام توانائیوں کو آپ کے خلاف بروئے کار لائے گا۔

ایسا ہی ہوا اور وہ مسلسل آپ کی نافرمانی میں لگارہا۔ وہ اور اس کی پارٹی جن کے ہاتھ حضرت عثمان کے خون سے رنگے ہوئے تھے اور جس نے امید کے آخری لمحہ بھی خلیفہ کو دھوکہ دیا تھا، آج وہی آپ کے خلاف اس خون کی کاشت کررہا تھا۔ نیز اس نے آپ کے مخالفین طلحہ وزبیرو حضرت عائشہ کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ ان لوگوں کو تقویت پہنچانے اور ان کا کارزار وسیع کرنے کے لئے اس نے بڑے پیمانہ پر مال و دولت لٹایا اور ہر ممکنہ طریقہ سے انہیں آپ کی مخالفت اور بغاوت کی ترغیب دی اس حدتک کہ اس نے شام اور اس کے گردونواح میں ان کے لئے بیعت لینا بھی شروع کردی۔

اس سلسلہ میں شرح نہج البلاغہ میں مرقوم ہے کہ جب حضرت امیر علیہ السلام نے معاویہ کو لکھا کہ لوگوں نے ان کے مشورہ کے بغیر عثمان کو قتل کیا تھا اور آپس کی صلاح اور پورے اتفاق رائے سے انہوں نے آپ کی بیعت کی ہے چنانچہ آپ کا یہ پیغام پہنچتے ہی وہ بھی آپ کی بیعت کرے اور شام کے شرفاء کو مدینہ بھیجے تو اس نے خاندان عمیس کے ایک فرد کو زبیربن عوام کے پاس اپنا یہ پیغام دے کر بھیجا کہ،

"خدا کے بندے اور مومنوں کے امیر حضرت زبیربن عوام کے نام۔ معاویہ بن ابی سفیان کی طرف سے سلام قبول کریں۔ عرض یہ تھی کہ میں نے اہل

شام سے آپ کے لئے بیعت لے لی ہے اور انہوں نے اسے دل و جان سے قبول کیا ہے۔ کوفہ وبصرہ کے لوگ تو ویسے ہی آپ کے مرید ہیں چنانچہ وہاں علی بن ابی طالب قدم نہیں جما سکتے اور اس کے بعد ان کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ نیز میں نے آپ کے بعد طلحہ کے لئے بیعت لی ہے۔ چنانچہ آپ عثمان کے انتقام کا نعرہ لگائیں اور لوگوں کو اپنی طرف کھینچیں آپ دونوں کی جانب سے پوری سنجیدگی اور ہوشیاری کا مظاہرہ ہونا چاہئے۔ میں خداوند عالم سے آپ دونوں کی کامیابی اور آپ کے دشمن کی نابودی کی امید کرتا ہوں۔"

روایت میں یہ بھی ہے کہ جب معاویہ کا یہ خط حضرت زبیر کے پاس پہنچا تو ان کی خوشی کی انتہاء نہ رہی انہوں نے طلحہ کو بھی اس سے باخبر کیا اور بقول راوی کے دونوں کو معاویہ کے اس منصوبہ میں ذرہ برابر بھی تردد نہ ہوا۔

مورخین اسی مقام پر لکھتے ہیں کہ اقتدار میں شراکت سے مایوسی اور یہ یقین کر لینے کے بعد کہ اس نئی خلافت کے زیر سایہ رہ کر ان کی کسی خواہش کی تکمیل نہ ہوسکے گی' انہوں نے چھپ کر بغاوت کا جال پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ دوسری طرف سے حضرت امیر کے خلیفہ بننے کی خبر سننے کے بعد حضرت عائشہ نے مکہ میں سکونت اور بنو امیہ کے اس حلقہ میں شمولیت اختیار کر لی تھی جس میں مکہ میں حضرت عثمان کا معزول والیٔ عبداللہ بن عامر بھی تھا۔ ان کا کام لوگوں کو بغاوت اور موجودہ حکومت سے محاذ آرائی کی ترغیب دینا تھا چنانچہ جب بھی ان کے پاس کچھ لوگ جمع ہوجاتے تو وہ کہتیں کہ'

"اے لوگو! یہ بہت بڑا سانحہ اور عظیم گناہ ہے چنانچہ بصرے میں موجود اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے اٹھ کھڑے ہو تمہارے لئے اہل شام کافی ہیں۔ شاید اس طرح اللہ تعالٰی عثمان اور مسلمانوں کا انتقام لے سکے۔"

عبداللہ بن عامر نے حضرت عائشہ کو بصرے چلے جانے کا مشورہ دیا اس لئے کہ اس کی نظریہ تھی کہ بصرہ میں انہیں زیادہ مقبولیت حاصل ہوگی اور لوگ ان کی مدد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے چنانچہ طلحہ وزبیر سے مشورہ اور سب کے متفقہ فیصلہ کے بعد وہ بصرے چلی گئیں۔ انہوں نے خط لکھ کر آنحضورؐ کی

دوسری ازواج کو بھی گھر کی دہلیز سے باہر نکلنے اور جناب امیرؑ سے کی جانے والی اس جنگ میں ان کی مدد کرنے کی دعوت دی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ حضرت عمر کی صاحبزادی حضرت حفصہ نے ان کی اس دعوت کو قبول کرلیا تھا لیکن جب ان کے بھائی عبداللہ نے انہیں سمجھایا اور ان پر یہ آیۂ کریمہ تلاوت کی کہ،

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلیه الاولی[۵۸]

"اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور اگلے زمانہ جاہلیت کی طرح سے اپنی آرائش نہ کرتی پھرو" تو وہ اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوگئیں۔

شرح نہج البلاغہ میں لکھا گیا ہے کہ جب جناب امیرؑ نے ذی قار کے مقام پر قیام کیا تو حضرت عائشہ نے حضرت حفصہ کو خط لکھ کر آگاہ کیا کہ جب سے علی کو ہماری قوت و طاقت کا اندازہ ہوا ہے تو وہ عاجز و درماندہ گھوڑے کی طرح ہم سے خوفزدہ ہوگئے ہیں اگر آگے جائیں گے تو ماردیئے جائیں گے اور اگر پیچھے ہٹیں گے تو ذبح کردیئے جائیں گے چنانچہ حفصہ نے اپنی کنیزوں کو بلوایا جو گاتی تھیں اور ڈف بجا بجا کر حفصہ کے یہ جملے گنگناتی تھیں کہ،

کیا خبر ہے کیا خبر ہے

علی کا سفر ہے

عاجز و ناتوان گھوڑے کی مانند

اگر آگے بڑھے گا تو مارا جائے گا

اور اگر پیچھے ہٹے گا تو ذبح کردیا جائے گا

عام عورتیں اور لڑکیوں نے آکر اس گانے کو سننا شروع کردیا تھا کہ اس بات کی خبر حضرت ام کلثوم کو ہوئی۔ انہوں نے چہرے پر نقاب لگائی اور اجنبی خواتین کے ساتھ حفصہ کے گھر پہنچیں پھر جب گھر پہنچ کر انہوں نے نقاب ہٹائی

---

۵۸ سورۃ احزاب نمبر ۳۳۔

تو حفصہ انہیں دیکھ کر شرمندہ ہوگئیں اور گانا بھی رکوادیا۔ حضرت ام کلثوم نے ان سے کہا کہ،

"اگر آج تم نے ان کے خلاف اپنی شماتت کا اظہار کیا ہے تو اس سے پہلے بھی ان کے بھائی کے خلاف اس قسم کے کام انجام دے چکی ہو اور خداوند عالم نے تمہارے بارے میں کیا کچھ نازل نہ کیا۔"

حضرت ام سلمہ نے بھی اپنے طور پر حضرت عائشہ کو بہت سمجھایا اور نصیحت کی تھی انہوں نے خدا کی کتاب کا حوالہ بھی دیا جس نے عورتوں پر سے جہاد کو ساقط کیا ہے اور آنحضورؐ کی ازواج کو گھر کی چاردیواری سے باہر نکلنے سے منع کیا ہے اور وہ حدیث نبویؐ بھی یاد لائی جب وہ آنحضورؐ کا سر دھلا رہی تھیں اور حضرت عائشہ پانی ڈال رہی تھیں اس وقت آنحضورؐ نے فرمایا تھا کہ تم میں سے کون اونٹ پر سوار ہوگی اور حواب کے کتے اس پر بھونکیں گے۔ اس پر انہوں نے خدا کی پناہ مانگی تھی تو آنحضورؐ نے حضرت عائشہ کے کندھے پر ہاتھ مار کر فرمایا تھا کہ،

"خبردار جو یہ کام کیا"

مورخین کا کہنا ہے کہ یہ سب نصیحتیں حضرت ام سلمہ نے خط لکھ کر حضرت عائشہ کو کی تھیں۔ اس خط میں انہوں نے حضرت عائشہ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس پردے کو چاک نہ کریں جسے رسول اللہ ڈال کر گئے ہیں لیکن حضرت عائشہ نے یہ تمام باتیں سنی ان سنی کر دیں، سفر کو جاری رکھا اور بغاوت میں پورا حصہ لیا۔ وہ بنی امیہ اور قریش کے دوسرے قبیلوں کے ان لوگوں کو اکٹھا کرتی رہیں جنہیں مروان بن حکم، یعلی بن امیہ اور عبداللہ بن عامر، حضرت علیؑ پر غلبہ پاجانے کی صورت میں اقتدار اور مال و دولت کے وعدے دیتے تھے۔

حضرت عائشہ کی لشکر کے ساتھ روانگی اور وہاں پیش آنے والے واقعات

مورخین کا دعویٰ ہے کہ طلحہ و زبیر کو مکہ آنے کی دعوت حضرت عائشہ نے دی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ مکہ میں جمع ہو کر سب ایک ساتھ بصرہ کی جانب روانہ ہوں۔ چنانچہ طلحہ و زبیر جناب امیر علیہ السلام کے پاس آئے اور آپؑ کے پاس آکر عمرہ کی ادائیگی کے لئے مکہ جانے کی اجازت طلب کرنے لگے۔

خلیفتہ المسلمین نے ان کے گوشزد کیا کہ وہ عمرہ کی ادائیگی کی خاطر نہیں بلکہ فساد اور تخریب کاری کے ارادوں سے مکہ جا رہے ہیں۔ لیکن وہ اس وقت تک اجازت دینے پر اصرار کرتے رہے جب تک کہ آپ نے انہیں اجازت نہ دے دی اور یوں وہ مکہ المکرمہ چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر وہ حضرت عائشہ سے جا ملے۔

جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو عبداللہ بن عامر اور طلحہ کے اتفاق رائے

سے ان لوگوں نے بصرے کی جانب پیشقدمی کا آغاز کیا۔

"مورخ ابن قتیبہ" لکھتے ہیں کہ جب طلحہ، زبیر' حضرت عائشہ اور ان سب کے حامی بصرہ روانگی کے لئے تیار ہو گئے تو سعید بن عاص نے ان تینوں کے پاس جاکر کہا کہ'

"عبداللہ بن عامر نے تمہیں تو بصرہ کی طرف بلایا ہے حالانکہ حضرت عثمان کے دور میں جبکہ وہ وہاں کا گورنر تھا' وہ بصرہ کو چھوڑ کر غلاموں کی طرح سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ وہ وہاں کا مفرور گورنر ہے اور ایک نکالے ہوئے شخص کی مانند وہاں پلٹ رہا ہے۔ اس نے تمہیں لوگوں کی موجودگی اور مال و دولت کے دلاسہ تو بہت دیئے ہیں۔ یاد رکھو کہ مال و دولت تو اس کے پاس ہے لیکن آدمی بہرحال نہیں ہیں۔"

مروان بن حکم نے کہا کہ اے دو بزرگوں تمہیں کس چیز نے روکا ہے کہ علیؑ کی طرح لوگوں سے اپنے لئے بیعت طلب کرو۔ اگر وہ تمہاری بیعت کر لیں گے تو تم علیؑ سے کی جانے والی بیعت کی ٹکر لے سکتے ہو اور اگر وہ تمہاری بیعت سے انکار کر دیں گے تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ لوگوں کی نظروں میں تمہاری کیا حیثیت ہے۔

طلحہ نے کہا کہ جو چیز ہمیں روکتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں نے وسیع پیانہ پر ان سے بیعت کی تھی لہٰذا ہم کیسے اسے توڑنے کی جرات کر سکتے ہیں۔

حضرت زبیر نے کہا کہ عثمان کی نصرت و حمایت میں سستی دکھانا اور خود علیؑ کی بیعت کے آگے سر تسلیم خم کر دینا اس کام میں آڑے آتا ہے۔ ولید نے ان سے کہا کہ'

"اگر تم نے کچھ برا کیا تھا تو اچھا بھی کیا ہے۔ اور اگر کل کچھ غلط کیا تھا تو آج تم صحیح بھی کر رہے ہو۔ آج کے دن تمہاری حالت کل سے بہتر ہے۔"

مروان نے کہا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میری امیدوں کا مرکز شام ہے۔ اور تمہاری آرزوؤں کا محور بصرہ ہے لیکن پھر بھی میں ہر قیمت پر تمہارے

ساتھ ہوں۔

مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب ان لوگوں نے بصرہ روانگی پر اتفاق نظر کر لیا تو طلحہ و زبیر نے حضرت عمر کے صاحبزادے عبداللہ کو اس مہم میں اپنے ساتھ ملانے کی کافی کوشش کیں۔ یہ دونوں ان کے پاس گئے اور ان سے کہنے لگے کہ'

''ہماری ماں عائشہ لوگوں کی صلاح و بہتری کے لئے اس راہ کو اختیار کرنے پر مجبور ہوگئی ہیں۔ چنانچہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں اس لئے کہ آپ کو بھی حضرت عائشہ کے طریقہ کار کو اپنانا چاہیے۔ اگر لوگوں نے ہم سے بیعت کر لی تو ہم میں آپ ہی اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔''

عبداللہ نے کہا ''تم لوگ مجھے میرے گھر سے نکال کر علی بن ابی طالبؑ کے جال میں پھنسانا چاہتے ہو۔''

مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ انہوں نے عبداللہ بن عمر کو ساتھ لے جانے کی مزید ایک اور کوشش بھی کی چنانچہ طلحہ نے ان سے کہا کہ'

''اے اللہ کے بندے! کیا معلوم کہ ہم نے کتنے حقوں پر ڈاکہ ڈالا ہو چنانچہ تختہ الٹ دیں تو پھر حق و عدالت سے حکم کریں گے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک طرف سے علیؑ اپنی بیعت نافذ کروانا چاہتے ہیں اور دوسری طرف سے معاویہ ان کی بیعت کو مسترد کر رہا ہے۔ ہماری نظر میں اس کام کو شوریٰ کے حوالہ کر دینا چاہیے۔ لہٰذا اگر آپ ہمارے ساتھ ہوں گے تو معاملات قدرے سدھر جائیں گے ورنہ تباہی و بربادی ہے۔''

عبداللہ بن عمر نے طلحہ کو ان لفظوں میں جواب دیا

''اگر تمہاری باتیں صحیح ہیں تو یہ ایک شرف ہے جس سے میں محروم ہو رہا ہوں اور اگر غلط ہیں تو یہ ایک فتنہ ہے جس سے مجھے چھٹکارا ملا۔ یاد رکھو! کہ عائشہ کا گھر ان کی اماری سے بہتر ہے۔ نیز تمہارے حق میں بھی مدینہ بصرہ سے اور تھوڑا سا جھک جانا تلوار چلانے سے بہتر ہے۔ جہاں تک شوریٰ کا تعلق ہے

تو وہ اس وقت بھی موجود تھی جب علیؑ منتخب کئے گئے تھے۔ وہ جیت گئے اور تم لوگ ہار گئے۔ مزید یہ کہ صرف وہ لوگ اس فیصلہ پر نظر ثانی کا حق رکھتے ہیں جنہوں نے انہیں پہلے منتخب کیا تھا۔"

اس طرح عبداللہ بن عمر کے سلسلہ میں ان لوگوں کی تمام کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔ انہوں نے ان کی باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی اس لئے کہ نمایاں تھا کہ ذاتی مفادات اور نفسانی خواہشات نے انہیں یہ راستہ اختیار کرنے اور تین ہزار مسلح افراد پر مبنی لشکر تشکیل دینے پر مجبور کیا تھا۔

انہوں نے بصرہ کے شرفاء و عمائدین کو بھی جناب امیرؑ کے خلاف ہونے والی اس محاذ آرائی میں شریک کرنا چاہا اور اس ضمن میں کعبہ بن میسور، احنف بن قیس، منذر بن ربیعہ سے مدد بھی چاہی لیکن انہیں یہاں بھی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار طلحہ و زبیر اور حضرت عائشہ کی سربراہی میں یہ لشکر بصرہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ اسے لالچی اور کینہ پرور لوگوں نے تشکیل دیا تھا۔ جو حضرت عثمان کے انتقام کے بہانہ اپنے غلط مقاصد کو حاصل کرنا اور خلافت کو اس کے اہل سے چھیننا چاہتے تھے۔

یہ چیز ان لوگوں کے رویوں سے واضح تھی اور مورخ ابن اثیر "الکامل" میں اس کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ مروان نے طلحہ و زبیر کے پاس جاکر کہا کہ وہ ان میں سے کس سے بیعت کرے اور نماز کے لئے ان میں سے کس کی امامت کا اعلان کرے۔ عبداللہ بن زبیر نے اپنے والد کا نام دیا اور محمد بن طلحہ نے اپنے والد کا نام پیش کیا۔ جب حضرت عائشہ نے دونوں کو اس طرح لڑتے جھگڑتے دیکھا تو مروان کے پاس پیغام بھیج کر اس سے پوچھا کہ کیا وہ لوگوں کے درمیان پھوٹ ڈالنا چاہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان کی بہن کا بیٹا عبداللہ امامت کے فرائض انجام دے گا اور بصرہ پہنچنے تک عبداللہ ہی امامت کے فرائض انجام دیتا رہے گا۔ معاذ بن عبیداللہ کہتا ہے کہ،

"معبود کی قسم اگر ہم لوگ کامیاب ہو جائیں گے اور علی بن ابی طالب پر

غلبہ حاصل کرلیں تو آپس میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ خلافت کو نہ زبیر طلحہ کے لئے چھوڑ سکتا ہے اور نہ طلحہ زبیر کے لئے۔"

طلحہ و زبیر کے ساتھ موجود ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ اگر وہ کامیاب ہو جائیں گے تو حکومت کو کس کے سپرد کریں گے انہوں نے کہا کہ ہم اسے لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیں گے جسے چاہیں منتخب کرلیں۔

اس نے کہا کہ پھر تو انہیں خلافت عثمان کے فرزند کے لئے چھوڑ دینی چاہیے اس لئے کہ وہ عثمان کے خون کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔

انہوں نے جواب دیا کہ وہ مہاجرین کے بزرگوں اور مشائخ کو نظرانداز کر کے خلافت عثمان کے یتیموں کے سپرد نہیں کر سکتے۔

مورخ طبری' ابن قتیبہ اور دوسرے مورخین لکھتے ہیں کہ یہ لوگ ابھی بصرے کے سفر میں تھے کہ پانی کے قریب ایک کتے نے حضرت عائشہ کے اونٹ کا راستہ روک کر ان پر بھونکنا شروع کیا۔ انہوں نے فوراً پوچھا کہ یہ کونسا پانی ہے۔ لوگوں نے جواب دیا کہ یہ پانی "حواب" کا ہے۔ ان کے منہ سے بے ساختہ یہ کلمات نکلے کہ "انا للہ و انا الیہ راجعون" (ہم اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف پلٹنا ہے) وہ میں ہی ہوں اور میری نجات اس میں ہے کہ مدینہ کی راہ لوں۔ لوگوں نے اس (قسم کی باتوں) کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ حضور مقبولؐ اپنی ازواج سے فرماتے تھے کہ'

"گویا کہ میں تم میں سے کسی ایک پر حواب کے کتوں کو بھونکتا دیکھ رہا ہوں"

انہوں نے میری جانب رخ کر کے فرمایا کہ

"اس سے ڈرو کہ تم وہ عورت ہو جاؤ"

محمد بن طلحہ نے ان سے لاکھ کہا کہ خدارا ان باتوں کو چھوڑیئے اور آگے بڑھتی جائیں لیکن وہ نہ مانیں۔ چنانچہ محمد بن طلحہ نے عربوں کی ایک جماعت

کو پیش کیا جنھوں نے یہ گواہی دی کہ یہ پانی حواب کا نہیں ہے۔ نیز عبداللہ بن زبیر ان کے پاس آگئے اور کہنے لگے کہ وہ رات کی ابتداء ہی میں اس پانی کو عبور کر چکے ہیں۔

اسی طرح ابن قتیبہ روایت کرتے ہیں کہ جب ان لوگوں نے خیبر کی سرزمین "اوطاس" پر قیام کیا تو سعید بن عاص مغیرہ بن شعبہ کے ہمراہ حضرت عائشہ کے پاس آیا اور سواری سے اتر کر کہنے لگا کہ '

"اے ام المومنین آپ کہاں تشریف لے جا رہی ہیں" انہوں نے جواب دیا کہ بصرہ

اس نے پوچھا کہ وہاں جاکر کیا کیجئے گا؟

انہوں نے جواب دیا کہ عثمان کے خون کا انتقام لوں گی

اس نے کہا کہ عثمان کے قاتل تو خود آپ کے ساتھ ہیں۔

پھر وہ مروان بن حکم کے پاس گیا اور اسی قسم کے سوال دہرانے کے بعد زبیر نے قتل کیا ہے اور دونوں خلافت کے دعویدار ہیں۔

مغیرہ بن شعبہ نے بھی اس قسم کی سخت باتیں کیں۔

راوی کہتا ہے کہ ان باتوں کا لوگوں پر کچھ اثر نہ ہوا تاہم سعید بن عاص نے جنگ جمل اور صفین میں سے کسی ایک میں شرکت نہ کی۔

ہمیں اس روایت کی صحت میں نہ صرف شبہ ہے بلکہ کافی حد تک اطمینان ہے کہ یہ روایت مخدوش اور بے اعتبار ہے۔ اس لئے کہ مغیرہ بن شعبہ ہمیشہ تخریب کاروں کی صف اول میں رہا ہے۔ یہ بات اس دور کے حالات کے جائزہ سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ حضرت عثمان کے خلاف ہونیوالی سرگرمیوں میں بھی وہ طلحہ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ اور بہت بعید نظر آتا ہے کہ ان میں اتنی جرات ہو کہ اتنے بڑے لشکر کے سامنے کہ جن میں طلحہ و زبیر بھی ہوں وہ کھلے عام جناب امیر علیہ السلام کی حمایت کا اعلان کریں۔

بہر صورت یہ لشکر آگے بڑھتا رہا اور اس سے پہلے کہ بصرہ تک پہنچتا، (بصرہ میں حضرت امیر کے گورنر) عثمان بن حنیف نے ابو اسود دؤلی اور عمران بن حصین کو ان کے پاس بھیجا تاکہ شاید گفتگو کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اہل بصرہ کو ان فسادیوں کے شر سے محفوظ رکھے۔

گفتگو کا آغاز ابو اسود نے کیا اور طلحہ سے کہا کہ،

"تم لوگوں نے نہ عثمان کو ہمارے مشورے سے قتل کیا تھا اور نہ ہم سے پوچھ کر علیؑ کی بیعت کی تھی پس کیسے ہو سکتا ہے کہ عثمان جسے مارا جا چکا ہے، ہم اس کے حق میں تحریک چلائیں اور علیؑ جن کی بیعت کی جا چکی ہے، ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔"

اس کے بعد عمران بن حصین نے بھی ملتے جلتے کلمات کہے لیکن طلحہ کے پاس ان دونوں کے لئے ایک ہی جواب تھا۔ اس جواب کو مورخین یوں نقل کرتے ہیں کہ،

"تمہارا خلیفہ خلافت کے معاملات میں کسی کا عمل دخل قبول نہیں کرتا اور ہم نے اس پر بیعت نہ کی تھی۔ معبود کی قسم! اس کا خون ضرور بہنا چاہئے۔"

ابو اسود نے عمران سے کہا کہ طلحہ کا سارا غصہ اقتدار اور کرسی کی خاطر ہے ان دونوں نے زبیر سے بھی بات چیت کی لیکن زبیر کا یہ جواب تھا کہ،

"یقیناً میں اور طلحہ دو دل میں ایک جان ہیں۔"

زبیر نے یہ بھی کہا کہ ہمارے عثمان کے ساتھ کچھ مسائل تھے اگر وہ ہماری بات مان لیتا تو ہم ضرور اس کی مدد کرتے۔ ان دونوں نے پھر حضرت عائشہ کی جانب رخ کیا اور ان سے کہنے لگے کہ،

"اے ام المومنین یہ آپ نے کونسے راستہ کا انتخاب کیا ہے۔ کیا جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو اس کا حکم دیا تھا۔"!! انہوں نے جواب دیا

"عثمان مظلومیت کے ساتھ مارا گیا ہے ہم نے تم لوگوں پر تازیانے اور لاٹھیاں پڑنے پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا تھا کیا عثمان کے قتل کے بعد بھی اپنے خشم و نفرت کا اظہار نہ کریں۔"

ابواسود نے کہا کہ آپ کو ہمارے تازیانوں اور لاٹھیوں سے کیا کام آپ ناموس رسول اکرمؐ ہیں انہوں نے آپ کو چاردیواری میں رہنے کا حکم دیا ہے اور آپ لوگوں کو ایک دوسرے سے لڑوا رہی ہیں۔ انہوں نے سوالیہ انداز میں پوچھا کہ کیا کوئی ان سے جنگ بھی کر سکتا ہے۔ ابواسود نے کہا کہ کیوں نہیں! آپ سے بہت معرکہ کی لڑائی ہوگی۔

جاریہ بن قدامہ سعدی نے ان سے ایک بار پھر کہا کہ'

"اے مادر ملت معبود کی قسم عثمان کا مار دیا جانا آپ کے گھر سے باہر نکلنے اور اس بدبخت اونٹ پر سوار ہوکر اسلحہ کی زد میں آنے سے زیادہ آسان ہے۔ خداوند عالم نے آپ کے لئے ایک شان و شوکت اور چاردیواری قرار دی تھی لیکن آپ نے چاردیواری سے قدم باہر نکالا اور اس شان و شوکت کو خاک میں ملا دیا۔ بے شک جو آپ کو جنگ کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے وہ مرتے ہوئے بھی دیکھ سکتا ہے اگر آپ اپنی مرضی سے آئی ہیں تو واپس ہوجائیں اور اگر زبردستی لائی گئی ہیں تو اس سلسلہ میں لوگوں سے مدد طلب کریں۔ یہ اور نہ جانے کتنے ایسے مواقع آئے کہ اہل بصرہ نے طلحہ، زبیر اور حضرت عائشہ کو نصیحتیں کرنے میں کمی نہ کی لیکن یہ لوگ اپنی ضد پر قائم رہے اور بصرہ میں داخل ہوگئے جہاں لالچی 'دنیادار اور کینہ پرور لوگوں کا ایک گروہ ان سے جاملا۔ اس کے علاوہ کچھ سیدھے سادھے لوگ بھی تھے جنہیں آنحضورؐ کی زوجہ اور خلیفہ اول کی بیٹی حضرت عائشہ نے دھوکہ دیا تھا۔

مورخ طبری لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کے بصرے میں داخل ہوتے ہی وہاں کے گورنر عثمان بن حنیف ان کے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ'

"تمہیں کس چیز نے حضرت علیؑ کا دشمن بنا دیا ہے کہ تم تو ان کے خلاف بغاوت کرنے پر تیار ہو اور جنگ کرنے پر آمادہ ہو۔"

انہوں نے جواب دیا کہ وہ ہم سے زیادہ خلافت کا حقدار نہیں ہے اور اسے جو کرنا تھا وہ بہرحال کرچکا ہے۔

عثمان بن حنیف نے کہا کہ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم سے اس (آمد) کا سبب دریافت کروں اور انہیں جلد جواب ارسال کروں۔ عثمان بن حنیف نے ان سے چاہا کہ ان کا جواب پہنچنے تک وہ مسجد کی امامت بدستور جاری رکھے۔ انہوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔

طبری مزید لکھتے ہیں کہ دو دن کے اندر ہی ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور انہوں نے عثمان بن حنیف پر حملہ کرکے اسے اپنی حراست میں لے لیا اور اس پر اتنا تشدد کیا کہ اس کی بھنوؤں' پلکوں اور داڑھی کے بال نوچ ڈالے اور اگر انہیں انصار کا ڈر نہ ہوتا تو جان ہی سے مار ڈالتے۔

ابن قتیبہ لکھتے ہیں کہ کافی طویل گفتگو اور مذاکرات کے بعد طرفین کے درمیان طے پایا تھا کہ دارالامارہ' مسجد اور بیت المال عثمان بن حنیف کی زیر نگرانی رہے گا اور ان کے آدمی جہاں جانا چاہیں جاسکتے ہیں اور یہ کہ حضرت امیرؑ کا حکم آنے تک طلحہ و زبیر کو صرف شہر میں داخلہ کا حق حاصل ہوگا چنانچہ اس اتفاق و مفاہمت کے بعد شہر میں امن و امان بحال ہونے لگا اور عثمان بن حنیف اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے ابھی چند دن ہی گذرے تھے کہ ایک تاریک رات میں جب کہ بارش ہو رہی تھی انہوں نے ایوان امارت پر حملہ کردیا اور اس کے گرد موجود چالیس پہریداروں کو ٹھکانہ لگانے کے بعد والی بصرہ عثمان بن حنیف کو اپنا قیدی بنالیا۔ مروان نے ان کے چہرے اور سر کے بالوں کو بری طرح نوچ ڈالا اور پھر یہ لوگ بیت المال پر قابض ہوگئے۔

مورخ یعقوبی اپنی تاریخ میں اس واقعہ کا اضافہ بھی کرتے ہیں کہ جب صبح کی نماز کا وقت ہوا تو نماز کی امامت کے بارے میں طلحہ و زبیر کے درمیان مخاصمت اس حد تک جاپہنچی کہ دونوں ایک دوسرے کو محراب عبادت سے ہٹانے لگے یہاں تک کہ نماز قضاء ہونے لگی اور لوگ چیخنے لگے کہ "اے اصحاب محمد نماز شروع کرو! نماز شروع کرو!!

اس وقت حضرت عائشہ نے دونوں کے درمیان مصالحت کرائی اور کہا کہ ایک دن طلحہ کے بیٹے محمد اور دوسرے دن زبیر کے بیٹے عبداللہ امامت کے فرائض انجام دیں گے۔

مورخ مسعودی مروج الذہب میں لکھتے ہیں کہ حملہ آوروں نے عثمان بن حنیف کے ستر آدمیوں کو قتل کیا۔ ان میں سے پچاس لوگ اپنے امیر کے باغیوں کے ہاتھوں اسیر ہوجانے کی وجہ سے مزاحمت کرتے ہوئے مارے گئے اور ایک بڑی تعداد میں لوگ زخمی ہوئے تب جاکر باغیوں کو بصرہ میں مکمل اقتدار حاصل ہوا۔

بہرحال طلحہ و زبیر اور جناب امیر علیہ السلام کے مخالفین کے بارے میں لکھنے والے تمام تاریخی مصادر وماخذ پورے اتفاق کے ساتھ لکھتے ہیں کہ جنگ کا نعرہ لگانے والے ان لوگوں پر غم و غصہ کی لہر اس طرح سے چھائی ہوئی تھی کہ انہوں نے جھوٹ اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا اور خلیفہ المسلمین پر تہمت لگانے سے بھی دریغ نہ کیا۔

حالانکہ بصرے کا والی عثمان بن حنیف سنجیدگی کے ساتھ گفتگو اور مذاکرات کے ذریعہ مسائل کو حل کرنا چاہتا تھا تاکہ اس تباہ کن جنگ سے بچ سکے جس کی بھینٹ ہزاروں مسلمان چڑھ گئے۔ لیکن اول تو یہ لوگ مذاکرات پر راضی نہ ہوئے اور جب ہوئے تو انہوں نے دھوکہ دہی اور فریب کاری سے تمام معاہدوں کو توڑ ڈالا اور مختصر سے وقت میں بہت سے لوگوں کا کام تمام کرنے کے بعد عثمان بن حنیف کو اپنی قید میں لے لیا اور خود ایوان صدارت پر جا بیٹھے۔ انہوں نے آنحضرتؐ کی زوجہ اور خلیفہ اول کی بیٹی حضرت عائشہ کے ذریعہ بہت سے قبیلوں اور گروہوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا اس لئے کہ عوام الناس کے جوش و جذبات سے کھیلنے میں عورتوں کا اپنا ایک الگ کردار ہے خصوصاً اس وقت جب کہ وہ ایک شخصیت کی حامل بھی ہوں۔

جب جناب امیر علیہ السلام کو طلحہ و زبیر اور حضرت عائشہ کی مخالفانہ سرگرمیوں کی اطلاع ملی اور یہ کہ انہوں نے آپ کے خلاف اعلان بغاوت کیا

ہے تو آپ کو معاویہ کا حساب صاف کرنے والے تمام پروگرام ملتوی کرنے پڑے۔ آپ نے مہاجر و انصار پر مشتمل ایک ایسا لشکر ترتیب دیا جس میں جنگ بدر و احد کے غازی اور وہ ممتاز صحابہ کرام شامل تھے جنہوں نے آڑے وقتوں میں جناب رسالت مآب صلی علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ آپ ان سب کو لئے بصرہ کی جانب روانہ ہوئے اور بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ ابھی بھی آپ کے دل میں ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید یہ لوگ اپنی غلطیوں کی شناسائی کرلیں اوراس گمراہی و ضلالت سے پسپائی اختیار کرکے باقی مسلمانوں کی صف میں شامل ہوجائیں۔ ابھی آپ راستہ میں تھے کہ والئی بصرہ عثمان بن حنیف اس حالت میں آپؑ سے آملے کہ باغیوں نے ان کے آنکھ، کان، ناک کاٹ دیئے تھے۔ آپؑ نے اپنے غصہ کو قابو میں رکھا اور ان سے انتہائی شفقت و محبت کا اظہار کرنے کے بعد آگے بڑھ گئے یہاں تک کہ بصرہ کی حدود نظر آنے لگیں۔ یہاں پہنچ کر آپ نے قیام کیا اور مخالفین کی طرف اپنے نمائندے دوڑاکر انہیں نصیحتیں کیں اور اس جنگ کے غلط نتائج سے ڈرایا۔ تاہم مخالفین کے رویہ میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔

اسی دوران آپؑ نے کچھ لوگوں کو کوفہ کی جانب بھی دوڑایا تاکہ باغیوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم پر پلٹانے میں ان سے مدد طلب کی جائے اور ایک طویل بحث و تمحیص کے بعد اہل کوفہ آپ کی حمایت کے لئے ایک لشکر جرار بھیجنے پر رضامند ہوگئے اور آپؑ سے ملحق ہوگئے۔ جب آپؑ کو یقین ہوگیا کہ یہ لوگ قابل ہدایت نہیں اور ہر قسم کے نتائج سے بے پروا ہوکر خود میں مست ہیں تو آپؑ بصرہ میں وارد ہوئے۔

مورخ مسعودی "مروج الذهب" میں منذر بن جارود سے نقل شدہ روایت کے مطابق آپ کے لشکر کی زبردست تنظیم و ترتیب اور ڈسپلن کی توصیف کرتا ہے جو بصرہ میں پانی کی طرح سے بہاجارہا تھا۔ راوی لکھتا ہے کہ جب مولائے متقیان کا یہ لشکر بصرہ میں موجود مقام "زاویہ" پر وارد ہوا تو وہ انہیں دیکھنے کے لئے گیا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ ہزار سواروں پر مشتمل ایک دستہ گزر رہا ہے جس کی سربراہی ایک ایسا شخص کررہا ہے جو سیاہی مائل گھوڑے پر سوار ہے وہ سفید لباس میں ملبوس ہے سر پر سفید ٹوپی اور گلے میں تلوار ہے اس کے ہمراہ بہت سے زرد و سفید پرچم اور تاج ہیں اور دستہ کے تمام لوگ زرہ پوش اور مکمل مسلح ہیں میں نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں تو جواب ملا کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی حضرت جابر بن عبداللہ انصاری ہیں اور ان کے ساتھ قوم انصار کے لوگ ہیں۔ ان کے بعد ایک اور سوار دکھائی دیا اس کے سر پر زرد رنگ کا عمامہ تھا اور بدن پر سفید لباس دکھائی دیتا تھا اس کے گلے میں تلوار اور کندھے پر کمان تھی اس کے ساتھ بھی ہزار سوار تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون ہیں جواب ملا کہ یہ خزیمہ بن ثابت ہیں جن کو آنحضرتؐ نے دوگواہوں کے برابر قرار دیا تھا۔ اس کے بعد ایک اور سوار گذرا وہ ایک ہتھیار بند اور زرہ پوش گھوڑے پر سوار تھا اس کے سر پر زرد عمامہ تھا جس کے نیچے چمکتی دمکتی ٹوپی دکھائی دیتی تھی۔ ان کے جسم پر بھی زرد رنگ کی قبا تھی اور ہزار سوار ان کی ہمراہی بھی کررہے تھے۔ میرے پوچھنے پر بتایا گیا کہ یہ ابو قتادہ ربعی ہیں ان کے بعد ایک اور سوار گزرا جو بڑے مضبوط اور تنومند گھوڑے پر سوار تھا وہ سفید پوشاک میں ملبوس تھا اور سر پر سیاہ عمامہ تھا جسے اس نے لٹکایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر وقار و متانت تھی اور وہ بلند آواز میں قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول تھا اس کے ہمراہ نقرئی پرچم اور ہزار سوار تھے جن کے سروں پر مختلف قسم کے تاج دکھائی دیتے تھے اور اطراف میں جوان، بوڑھے اور معمر سب ہی تھے کہ جن کی جبینوں سے سجدوں کے نشان چمک رہے تھے مجھ سے کہا گیا کہ یہ حضرت عمار بن یاسر ہیں اور ان کے ساتھ قوم مہاجر و انصار اور ان کے پیروکاروں کی ایک جماعت ہے پھر ہمارے پاس سے ایک اور گھڑ سوار گذرا اس کا گھوڑا سرخ اور زرد رنگ کا تھا اور اس کے پاؤں زمین پر گھسٹ رہے تھے وہ بھی ہزار سواروں کے درمیان تھا مجھ سے یہ کہا گیا کہ یہ قیس بن سعد بن عبادہ انصاری ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے صاحبزادے اور ان کی قوم قحطان کے لوگ ہیں۔ راوی اسی طرح گذرنے والے دستوں کو بیان کرتا رہا یہاں تک کہ اس دستہ کی باری آئی جس میں شیر خدا حضرت علی مرتضی

تشریف فرما تھے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک ایسا لشکر گذرا جس میں لوگ کثرت سے تھے اور ہتھیاروں اور زرہ سے سجے ہوئے تھے ان کے درمیان مختلف جھنڈے دکھائی دے رہے تھے۔ اس لشکر کے آگے ایک ایسا شخص چل رہا تھا جس کے بڑے مضبوط اور صحت مند ہاتھ تھے انہی لوگوں کے درمیان مجھے ایک خوبصورت اور نورانی چہرے کے جوان دکھائی دیئے اور مجھے بتایا گیا کہ یہ حضرت علی بن ابی طالب ہیں۔ ان کے دائیں بائیں امام حسن اور امام حسین ہیں اور سامنے محمد ابن حنفیہ ہیں جو اس وقت علمداری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ پیچھے حضرت جعفر طیار و عقیل وبنی ہاشم کے صاجزادے ہیں۔ جو بزرگ ان کے ساتھ دکھائی دے رہے ہیں وہ قوم مہاجر و انصار میں سے جنگ بدر کے مجاہد ہیں ان دستوں نے اپنی پیشقدمی جاری رکھی یہاں تک کہ زاویہ میں آکر قیام کیا۔

یہاں پہنچ کر جناب امیر علیہ السلام نے چاررکعت نماز پڑھی اور پھر چہرے کو خاک پر رکھ دیا کہ جو اشکوں سے تر ہوگئی اور بارگاہ ربوبی میں دونوں ہاتھ اٹھاکر فرمایا

پروردگارا! اے وہ ذات جو آسمان اور اس میں موجود ہر چیز اور زمین اور اس میں پائی جانے والی ہر شے کا رب اور ایک عظیم آسمان کا خدا ہے۔ پالنے والے یہ بصرہ ہے جس کی خیروخوبی کا سوالی ہوں اور اس کے شروفساد سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

اے خدا ہماری اس شہر میں آمد کو مبارک قرار دے اور بے شک تو بہترین نازل کرنے والوں میں سے ہے۔

پروردگارا! ان لوگوں نے میری اطاعت سے منہ موڑلیا ہے۔ میری بیعت توڑ ڈالی ہے اور میرے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا ہے۔ خدایا تو خود مسلمانوں کے خون اور ان کی جانوں کی پاسداری کر!

اس کے بعد آپ نے اپنے ساتھیوں میں سے کسی ایسے کو ان کی طرف بھیجا جو جان و مال کے بارے میں انہیں اللہ تعالیٰ کے احکامات یاد دلائے تاہم

انہوں نے ان تمام باتوں کو مسترد کرتے ہوئے جنگ پر اپنے تبدیل نہ ہونے والے موقف کا اظہار کیا۔

جناب امیر علیہ السلام اس کے باوجود بھی اپنے ساتھیوں کو صبر و ضبط سے رہنے کی تلقین کرتے رہے تاکہ شاید اس طرح اتنی جانیں ضائع ہونے سے بچ جائیں، حجت تمام کر دی جائے اور اتحاد و یکجہتی کی کوئی صورت نکل آئے۔

اس وقت حضرت عائشہ اپنے ماننے والوں کو جنگ کی ترغیب دینے میں مصروف تھیں وہ اونٹ پر سوار تھیں اور لوگوں کے ہجوم سے خطاب کر کے کہہ رہی تھیں کہ،

اے لوگو ہم عثمان کے ہنٹر اور اس کے لاٹھی پڑنے پر صرف تمہاری وجہ سے آگ بگولا ہوئے تھے۔ یاد رکھو کہ تمہارا خلیفہ مظلومیت کی موت مرا۔ ہم نے بہت سے امور میں اس پر اعتراض بھی کیا تھا اور اپنی ناراضگی اور غم و غصہ کا اظہار بھی کیا تھا تاہم وہ باز آگیا اور اس نے توبہ کر لی اور ایک مسلمان سے گناہ نہ کرنے کی بہ نسبت توبہ کرنے کا زیادہ مطالبہ کیا جاتا ہے لیکن اس کے دشمن اس پر ٹوٹ پڑے اور انہوں نے اسے قتل کر کے تین حرمتوں کو پامال کیا،

"جان کی حرمت مقدس ماہ کی حرمت اور مقدس شہر کی حرمت۔"

جب مصالحت و مفاہمت کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں تو خلیفۃ المسلمین نے اپنے اصحاب میں سے کسی ایک کو دشمن کی صفوں میں جاکر انہیں قرآن کریم کی طرف بلانے کی دعوت دی۔ آپ نے یہ بھی بتلا دیا کہ یہ لوگ اسے تیرباران کریں گے۔ اس سب کے باوجود ایک جوان آگے بڑھا اور اس ماموریت کو انجام دینے میں اس نے شک و تردید کو راہ نہ دی۔ اس نے حضرت عائشہ کے سامنے جاکر قرآن کریم کو ہاتھوں پر اٹھالیا اور انہیں خدا کے احکامات کی طرف بلایا۔ لیکن باغیوں نے اس کا جواب تیروں سے دیا اور جب شہادت کے بعد اسے جناب امیر علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے اس کے حق میں دعا کی۔ پھر آپ نے اپنے اصحاب کو دشمن کی طرف بڑھنے کا حکم صادر کیا

اور آپؑ کی فوجیں آہستہ آہستہ دشمن کی طرف پیش قدمی کرنے لگیں۔ ان کی سربراہی حضرت عمار بن یاسر کر رہے تھے انہوں نے ان باغیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ "اے لوگو تم نے اپنے نبیؐ کے ساتھ انصاف نہ کیا اس لئے کہ اپنی عزت و ناموس کو تو چار دیواری میں محفوظ رکھا اور جناب رسالت مآبؐ کی ناموس کو تلواروں کی زد میں لے آئے۔"

جواب میں اس طرف سے کئی تیر آئے جس سے کچھ لوگ جاں بحق ہوئے اور پھر گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی۔ لیکن ابھی مولائے متقیانؑ کے دل میں کوئی چیز باقی تھی جس کا آپؑ اظہار کرنا چاہتے تھے چنانچہ آپؑ دشمن کی صفوں کی جانب بڑھے اور آپ نے طلحہ و زبیر کو پکارا۔ جب وہ دونوں آپ کے پاس آکر کھڑے ہوگئے تو فرمایا کہ '

"کیا تم دونوں نے مجھ سے بیعت نہ کی تھی؟"

انہوں نے کہا کہ ہم نے مجبوراً آپ سے بیعت کی تھی اور آپ ہم سے زیادہ اس کے حقدار نہ تھے۔

آپؑ نے طلحہ کی طرف توجہ کر کے فرمایا کہ '

"تم نے اپنی دلہن کو تو بڑی حفاظت سے گھر میں رکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہلیہ کو ان تمام خطرات میں ڈال دیا جن میں خود گرفتار ہو۔"

پھر حضرت زبیر سے فرمایا کہ "کیا تمہیں وہ دن یاد ہے جب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تم سے فرمایا تھا کہ تم اس (علی) سے جنگ کرو گے جب کہ اس پر ظلم کر رہے ہوگے۔ آپؑ نے یہ بھی فرمایا کہ ہم تمہیں آل عبدالمطلب میں سے سمجھتے تھے جب تک کہ تمہارا بیٹا جوان نہ ہوگیا اور اس نے تمہارے اور ہمارے درمیان جدائی نہ ڈال دی۔ زبیر نے کہا کہ "ہاں آج مجھے وہ بات یاد آگئی اور اگر اس سے پہلے یاد آگئی ہوتی تو آپ کے خلاف خروج نہ کرتا۔"

اس گفتگو کے بعد روایات اور تاریخ میں حضرت زبیر کے موقف کے بارے میں اختلاف ہے۔ کچھ روایات میں ہے کہ وہ میدان جنگ چھوڑ کر چل دیئے یہاں تک کہ انہیں قتل کر دیا گیا جب کہ کچھ اور روایتوں کے مطابق جناب امیر علیہ السلام سے گفتگو کے بعد جب ان کے رویہ میں تبدیلی آئی تو ان کے بیٹے نے انہیں بزدلی کے طعنے دیئے اور کہا کہ'

"آپ نے علی بن ابی طالب کے پرچم دیکھ لئے ہیں اور آپ کو یقین ہو گیا ہے کہ ان پرچموں تلے موت ہے چنانچہ آپ خوفزدہ ہو گئے ہیں۔"

وہ اس حد تک انہیں طعنے دیتا رہا یہاں تک کہ انہیں غصہ آگیا اور انہوں نے کہا کہ 'تجھ پر وائے ہو' میں علیؑ سے جنگ نہ کرنے کا عہد کر چکا ہوں۔

اس نے انہیں کفارہ دینے اور غلام آزاد کرنے اور اس نبرد کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ وہ بڑی شدت سے جناب امیر علیہ السلام کی فوجوں سے نبرد آزما رہے یہاں تک کہ اونٹ کو پے کر دیا گیا اور ابن حرموز نے انہیں چھپ کر قتل کر ڈالا۔

ہماری نظر میں یہ روایت پہلی روایت کی بہ نسبت زیادہ صحیح دکھائی دیتی ہے اس لئے کہ زبیر ان صحابیوں میں سے نہ تھے جو جناب رسالتمآبؐ کی اس حدیث کو نظر انداز کر جاتے پھر وہ خود بھی جانتے تھے کہ وہ امیر المومنین علیہ السلام کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں اور ان کی علی کے خلاف تمام سرگرمیاں ظلم ہیں۔

جناب امیر علیہ السلام کی بصرہ میں آمد سے قبل انہوں نے طلحہ کے ساتھ مل کر بصرے کے بہت سے مسلمانوں کا خون کیا جب کہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ یہ قتل و غارتگری ان کے لئے کسی صورت جائز نہیں ہے لیکن دراصل اقتدار طلبی نے انہیں اندھا کر دیا تھا۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے کہا جانے والا ایک کلمہ اس وقت انہیں گمراہی و ضلالت سے دور نہ رکھ سکتا تھا جب کہ ہزاروں کی تعداد میں اسلحہ سے لدی ہوئی فوجیں ان سے جناب امیر کے خلاف تلوار اٹھانے کے تقاضے کر رہی تھیں جب کہ معاویہ شام

سے انہیں امیرالمومنین کہہ کر خطاب کرتا تھا۔

جہاں تک طلحہ کا تعلق ہے تو وہ اس معرکہ میں زخمی ہوگئے تھے اور جب ان کے تمام ساتھی بھاگ گئے اور میدان صاف ہوگیا تو مروان بن حکم نے حضرت عثمان کا انتقام لینے کے لئے ان کی طرف ایک تیر رہا کیا جو ان کے بازو کی رگ میں جاکر پیوست ہوگیا اور بہت سا خون بہہ جانے سے وہ بھی چل بسے۔

تاریخ میں ہے کہ عبدالملک بن مروان یہ کہتا تھا کہ اگر اس کے والد نے اسے یہ خبر نہ دی ہوتی کہ طلحہ کو انہوں نے ٹھکانہ لگایا تھا تو وہ عثمان کے بدلہ میں تیم خاندان کے ایک فرد کو بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ خلاصہ کلام یہ کہ فریقین کے درمیان وہ گھمسان کی جنگ ہوئی کہ جس کی نظیر بصرے کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ جنگ اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ جناب امیر کی فوجیں کامیابی کے دہانے تک نہ پہنچ گئیں تاہم حضرت عائشہ اونٹ پر سوار لوگوں کو مسلسل جنگ جاری رکھنے کی ترغیب دے رہی تھیں۔ وہ ہودج سے ہاتھ نکال کر کہتیں کہ لوگوں میں سے کون ہے جو ان کے لئے حضرت امیر کا سر لائے اور اس کے لئے دیناروں کی وہ تھیلی ہو (جو ان کے ہاتھ میں موجود تھی)[1]

ایک عرصہ اسی حالت میں گذرا لوگ بڑھ بڑھ کر موت کی طرف جاتے لیکن کسی کو ان کے اونٹ کے پاس پھٹکنے نہ دیتے۔ جناب امیر علیہ السلام نے جو یہ منظر دیکھا تو اپنے اصحاب کو اس اونٹ کے پاؤں کاٹنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس کے پاؤں کاٹ دو اس لئے کہ اس کی بقاء میں عربوں کی فنا ہے۔ چنانچہ اسے پے کر دیا گیا اور بقول راوی وہ اس خوفناک آواز اور پھنکار کے ساتھ نیچے آبیٹھا کہ جو اس سے پہلے کسی اونٹ سے نہ سنی گئی تھی۔ اس کی چیخ سنکر تمام لوگ بھاگ کھڑے ہوئے اور حضرت عائشہ میدان کارزار میں تنہا رہ گئیں۔ اس وقت مولائے متقیان نے ان کے بھائی محمد بن ابی بکر کو ان کی خیریت دریافت کرنے کی غرض سے ان کے پاس بھیجا اور جب انہوں نے کوئی

---

[1] عربی عبارت میں موجود ہے کہ جو میرے لئے "اصلع کا سر لائے"۔

جواب نہ دیا تو جناب امیر خود آگے بڑھے۔

آپؑ نے ہاتھ میں موجود چھڑی ھودج پر ماری اور فرمایا کہ'

"اے خاتون! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہیں گھر کی چار دیواری میں رہنے کا حکم نہ دیا تھا۔ خدا کی قسم ان لوگوں نے تم سے انصاف نہ کیا جنھوں نے اپنی عزتوں کو سات پردوں میں چھپاکر رکھا اور تمہیں میدان جنگ میں لے آئے۔"

پھر آپؑ نے ان کے بھائی سے کچھ فرمایا اور وہ انہیں حضرت صفیہ بنت حرث بن ابی طلحہ عبدی کے گھر لے گئے۔

جنگ کا خاتمہ باغیوں کی شکست اور طلحہ و زبیر کی موت پر ہوا ساتھ ہی طرفین کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ آپ کے حامیوں میں سے کچھ لوگ حضرت عائشہ پر ہاتھ اٹھانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن آپ نے ان پر کڑی نکتہ چینی کی اور حضرت عائشہ کو شدید حفاظتی انتظامات میں رکھا۔ اپنے لشکر میں آپؑ نے ندائے عام دلوائی کہ'

"کسی زخمی پر وار نہ کرو، کسی بھاگتے کا پیچھا نہ کرو اور کسی مفرور کا نشانہ نہ لو۔ جو اپنا ہتھیار پھینک دے وہ امان میں ہے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے وہ امان میں ہے۔"

جناب امیر علیہ السلام بڑی بے چینی اور کرب کے عالم میں اپنے اور مدمقابل کے مقتولین کے سامنے کھڑے ہوئے تھے آپ کو ان کے مارے جانے اور ان سے جنگ کرنے کا گہرا رنج و غم تھا اور اس کا بھی کہ جن اغراض و مقاصد کے لئے آپؑ حکومت و خلافت کے خواہاں تھے وہ ابتداء ہی میں اتنے بڑے سانحہ کا شکار ہوگئی تھی۔

اصل افسوس تو اس جہالت اور کم عقلی کا تھا جس کا شکار بہت سے مسلمان ہوئے اور نفسانی خواہشات نے انہیں ایک غلط راستہ پر لا ڈالا تھا جس کی توقع جناب امیرؑ کو نہ تھی۔ آپ کو اس پر بھی افسوس تھا کہ قریش جس طرح سے

آپ کے چچازاد بھائی کے خلاف سازشوں کے جال بچھاتے اس طرح انہوں نے آپ کے خلاف بھی سازشوں میں کمی نہ کی لیکن یہ آپؑ کے مقدر میں لکھا گیا تھا کہ جس طرح قرآن کریم کے نزول پر مشرکین سے جہاد کریں گے اس طرح قرآن کی تفسیر پر اس کا انکار کرنے والوں سے بھی نبرد آزما رہیں گے۔

بہرحال مسلمانوں کو ساتھ ملا کر ان کی توانائیاں اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف استعمال کرنا آپ کی دلی تمنا تھی لہٰذا مدمقابل کے ساتھ بھی اتنی شفقت و محبت سے پیش آئے کہ مقتولین کے لواحقین کو اپنے اپنے مقتول کو لے جاکر دفن کرنے کی اجازت دی اور اپنے ساتھیوں میں عام اعلان کرادیا کہ اس جنگ میں ان کے لئے کوئی دنیوی فائدہ یا مال غنیمت نہیں ہے۔ کچھ روایات میں ہے کہ جب عام دستور کے مطابق کچھ لوگوں نے باغیوں کی تمام چیزوں پر قبضہ کرنا چاہا اور آپ سے اس ضمن میں اجازت چاہی تو آپ نے انہیں جواب دیا کہ جنگی قیدیوں میں ان کی ماں عائشہ ہے کون انہیں لینا پسند کرے گا۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کہ یہ روایات صحیح ہوں یا غلط جو بات ناقابل انکار ہے وہ یہ کہ آپؑ نے عام معافی کا اعلان کیا اور کسی کو بھی حریف پارٹی کی ایک چیز لینے کی اجازت بھی نہ دی۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اگر حضرت عائشہ اور ان کے اتحادی جیت جاتے تو وہ کسی کو بھی صحیح سالم نہ چھوڑتے اور سب کے آنکھ کان کٹوادیتے۔ اپنے مخالفین کی جان و مال اور ناموس کو اپنے لئے جائز قرار دیدیتے اور خوف و ہراس پھیلانے اور انتقام لینے کا ہر ممکنہ حربہ آزماتے۔

اس جنگ سے کیا مخصوص جناب امیر علیہ اسلام کی ہر جنگ دشمن پر ظلم و زیادتی کے لئے نہیں بلکہ حق کے غلبہ اور باطل کی شکست کے لئے ہوتی تھی۔ وہ ان جنگوں سے ظالم و جاگیردار طبقہ کے ظلم و استحصال کو صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتے تھے اور مظلوم و غریب عوام کی حمایت کرکے اسلام کو ان کے دلوں میں مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے بعد آپ بصرہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل نہ ہوئے اس لئے کہ اس جنگ سے ان اغراض و مقاصد کی تکمیل نہ ہوتی تھی جس کے لئے معمولاً" آپ تلوار اٹھایا کرتے تھے۔

کچھ قدیم وجدید دور کے مصنفین کا نظریہ یہ ہے کہ قعقاع بن عمر نامی صحابی کے ذریعہ صلح ہوا چاہتی تھی کہ وہ لوگ اس کام میں حائل ہوگئے جو حضرت عثمان کے خلاف بغاوت میں پیش پیش تھے۔ انکا سرغنہ عبداللہ بن سبا تھا جو ایک یہودی اور تخریب کار تھا وہ تخریب کاری کے لئے اسلام کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھا بصرہ کی جنگ میں وہ جناب امیر کے ہمراہ تھا۔ چنانچہ جب اسے احساس ہوا کہ لوگوں کا جھکاؤ صلح کی جانب ہے تو وہ اور اس کے ساتھی ڈرنے لگے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس مفاہمت کی قیمت انہیں ادا کرنی پڑجائے چنانچہ انہوں نے آپس میں اتفاق کرلیا کہ اگر صلح ہوجائے گی تو وہ اپنی طرف سے جنگ شروع کردیں گے۔

ڈاکٹر محمد نجار اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں وہ جناب امیرؑ کو اس گروہ کے عناصر میں سے قرار دیتے ہیں اور بصرہ میں ہونے والی خونی جنگ کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اس لئے کہ ان کے خیال میں مولائے متقیان نے سبئیہ نامی اس گروہ کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی کہ جو مرضی میں آئے کرے[1] تاہم ان واقعات کی چھان بین کرنے والا اور انہیں گہری نظر سے دیکھنے والا باآسانی فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ بات حقیقت سے دور ہے۔ اس لئے کہ حضرت عثمان کا انتقام لینے والے بہت زیادہ جذباتی اور شدت پسند دکھائی دیتے تھے حالانکہ لالچ وطمع ہی نے انہیں حضرت عثمان کے قتل پر مجبور کیا تھا اور اسی لالچ کے تحت وہ جناب امیر سے جنگ کرنے اور اہل بصرہ سے مدد لینے پر مجبور ہوئے تھے ان حالات میں جب کہ ان کی خواہشات میں سے کسی ایک خواہش کی بھی صحیح سے برآوری نہ ہوئی تھی وہ کیسے صبر و تحمل کرسکتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ جناب امیرؑ کی جانب سے مصالحت کی کوششیں ہوئی ہوں گی اور قعقاع بن عمر بھی اس میں شریک رہا ہوگا لیکن تاریخ کے بنیادی اور اوریجنل مصادر سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی کہ جناب امیرؑ یا ان کے کسی

---

[1] علی بن ابی طالب ۔ نظرۃ عصریہ ص ۹۲

نمائندے کو ان کوششوں میں کامیابی حاصل ہوئی ہو۔ جو لوگ جناب امیر علیہ السلام کو سبئیہ فرقہ کا جزو قرار دیتے ہیں اور آپ پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ آپ نے اس گروہ کو قتل و غارتگری کرنے دی وہ اسی وقت یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ تین نمایاں شہروں سے جمع ہونے والے اور حضرت عثمان کے خلاف سرگرمیوں کا آغاز کرنے والے لوگ اس وقت تک اپنے گھروں سے نہ نکلے تھے جب تک کہ بنوامیہ کی کارستانیوں اور تخریب کاریوں سے عاجز نہ آگئے تھے۔

بعدازاں مصالحت کی تمام کوششیں ناکام ہونے کے بعد انہوں نے آخری حربہ کے طور پر حضرت عثمان کو قتل کیا تھا۔

جہاں تک ابن سبا اور سبئیہ گروہ کا تعلق ہے تو اسے شیعہ دشمنوں نے بصرہ کی جنگ گذر جانے کے سو سال بعد تاریخ میں شامل اور جعلساز کیا تھا جیسا کہ اس بات کی تائید جدید تحقیقات سے بھی ہو جاتی ہے۔

پھر بھی اگر ہم جناب امیر علیہ السلام کے لشکر میں کسی ایسے شخص کو فرض بھی کرلیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مصالحت و مفاہمت کی کوششوں میں سنجیدگی کے باوجود حضرت علی اور اصحاب علی کیسے کسی ایسے گروہ کے وجود کو برداشت کرسکتے ہیں یا اس سے غافل ہوسکتے ہیں جو ہمہ تن سازش میں مصروف ہو۔ ان چیزوں کو وہی لوگ صحیح مان سکتے ہیں جن کے دلوں اور نفسوں میں بیماریاں ہوں اور جو تاریخ کو اپنی مرضی سے چلانے کے درپے ہوں۔

بہرحال جنگ پایہ اختتام کو پہنچی' باغیوں کے دو لیڈر مار دیئے گئے اور لوگ پھر سے جناب امیر کی طرف پلٹنے لگے اور ان سے تجدید بیعت کرنے لگے۔ اس وقت جو چیز آپ کے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی وہ حضرت عائشہ کو بحفاظت ان کے گھر واپس بھجوانا تھا۔

چنانچہ "عقد فرید" کی روایت کے مطابق آپ نے ابن عباس کو ان کے پاس بھیجا اور ان سے کہا کہ انہیں (حضرت عائشہ) اس گھر میں واپس بھجوایا جائے جس میں خداوندعالم نے انہیں رہنے کا حکم دیا تھا۔

ابن عباس ان کے پاس گئے اور ان سے اندر جانے کی اجازت چاہی انہوں نے اجازت نہ دی تو ابن عباس خود ہی داخل ہوگئے اور تکیہ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس پر تکیہ کر کے بیٹھ گئے ۔

حضرت عائشہ نے ابن عباس پر اعتراض کیا کہ انہوں نے دو مرتبہ سنت نبوی کی توہین کی۔ پہلی یہ کہ ان کی اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہوئے اور دوسری یہ کہ ان کے کہے بغیر ان کی بساط پر بیٹھ گئے۔

ابن عباس نے جواب دیا کہ وہ سنت کو ان سے بہتر جانتے ہیں خدا کی قسم یہ وہ چار دیواری نہیں جس میں رہنے کا حکم رب العزت نے انہیں دیا تھا۔

پھر کہنے لگے کہ "امیر المومنین" تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اس شہر کی جانب روانہ ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ جس سے نکلی ہو۔

حضرت عائشہ اس وقت بھی دل میں پائی جانے والی ان نفرتوں اور کدورتوں کو مخفی نہ رکھ سکیں جو جناب امیرؑ کے خلاف تھیں حالانکہ اس وقت وہ آپ کی حراست میں تھیں اور آپ نے ان سے حسن سلوک میں اور ان کے احترام کو برقرار رکھنے میں کوئی کمی نہ آنے دی تھی۔

اس کے باوجود انہوں نے کہا کہ خدا امیرالمومنین حضرت عمر بن خطاب پر رحمتیں نازل کرے۔ ابن عباس نے کہا کہ امیرالمومنین علی بن ابی طالب پر بھی۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

ابن عباس نے کہا کہ آپ کا سارا زور اونٹ پر تھا۔ اب آپ نہ حکم چلاتی ہیں اور نہ لوگوں کو کسی چیز سے روکتی ہیں اور نہ ہی اب وہ جوش و خروش اور جنبش ہے۔

وہ ابن عباس کا یہ جواب سنکر رونے لگیں اور کہنے لگیں کہ "اچھا اب میں چلی جاؤں گی اس لئے کہ وہ شہر میرے حق میں سب سے برا ہوگا جس میں تم لوگ ہو۔"

ابن عباس نے کہا کہ یہ ہمیں اس بات کا صلہ مل رہا ہے کہ ہم نے آپ کو ام المومنین اور آپ کے والد کو صدیق کا درجہ دیا انہوں نے کہا کہ اے ابن عباس کیا رسول اللہ سے نسبت کو مجھ پر جتا رہے ہو۔

ابن عباس نے واپس پہنچ کر جناب امیرؑ کو حضرت عائشہ کی باتوں اور آپ کی طرف سے اپنے جوابات سے آگاہ کیا۔ آپ نے حفاظتی انتظامات اور ان کی خدمت کے لئے بہت سے مردوں اور عورتوں کو ان کے ساتھ روانہ کردیا یہاں تک کہ وہ مدینہ جاپہنچیں۔ البتہ جہاں تک مورخین کے درمیان شہرت یافتہ روایت کا تعلق ہے کہ حضرت امیر نے ان کے ساتھ بنی عبدالقیس کی چالیس عورتیں روانہ کیں جو مردوں کے بھیس میں تھیں اور سارے راستہ حضرت عائشہ کی خدمت کرتی رہیں لیکن مدینہ پہنچنے تک ان کا بھید نہ کھل سکا اور اسی لئے حضرت عائشہ سفر میں اٹھتے بیٹھتے حضرت امیرؑ کو برا بھلا کہتیں کہ انہوں نے ان کی بے حرمتی کی۔ بعد ازاں جب معلوم ہوا کہ وہ سب عورتیں تھیں تو وہ اپنے رویہ پر شرمندہ ہوئیں۔

باوجود اس کے کہ یہ روایت مورخین کے درمیان کثرت سے دکھائی دیتی ہے' اس کی کوئی بنیاد و اساس نہیں ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں عورتوں کو ان کے ہمراہ بھیجنا اور ان کی اصلی حالت کو ان پر مخفی رکھنا انتہائی غیر معقول اور غیر ممکن اقدام نظر آتا ہے اس لئے کہ حضرت عائشہ اتنی بیوقوف نہ تھیں کہ اتنے طویل سفر میں عورتوں اور مردوں میں تمیز نہ کرپاتیں۔ مزید یہ کہ اس قسم کے اقدام سے نہ اسلام اور نہ مسلمانوں کی کوئی خدمت ہوسکتی ہے۔

جو چیز قابل تصور ہے وہ یہ ہے کہ جنگ سے پیدا ہونے والی مشکلات کے بعد آپ نے ان کی خدمت کے لئے چند عورتوں اور حفاظت کے لئے کچھ مردوں کو ضرور بھیجا ہوگا تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی ان پر ہاتھ اٹھاسکے یا ان کی توہین کرسکے۔

مورخین لکھتے ہیں کہ جب وہ مدینہ میں ساکن ہوگئیں اور لوگ ان سے ملنے کے لئے آتے تو وہ زار و قطار روتیں اور کہتیں کہ "اے کاش میں جنگ جمل سے بیس سال پہلے مرگئی ہوتی" یا کبھی کبھار کہتیں کہ "اے کاش میں اس سے

پہلے ہی مرگئی ہوتی۔"

بے شک ان کی یہ گریہ و زاری توبہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کے لئے نہ تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں ایک زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا جس میں لشکر کی قیادت بھی ان سے چھن گئی تھی اور سوائے ذلت و بدنامی کے ان کے لئے کوئی چیز باقی نہ بچی تھی۔ جناب امیر علیہ السلام نہ صرف کامیاب ہوئے تھے بلکہ پہلے سے زیادہ مستحکم ہوگئے تھے اور یہ چیز حضرت عائشہ کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

امامؑ کوفہ کی طرف

ہمیں تاریخی مصادر میں یہ اشارہ نہیں ملتا کہ جناب امیر علیہ السلام مدینہ سے بصرہ روانگی کے وقت بصرہ چھوڑنے کی فکر میں تھے یا یہ کہ آپ کا کسی اور شہر کو اپنی حکومت کا مرکز بنانے کا ارادہ تھا۔ ہماری نظر میں یہ منتقلی آپ کی یا کسی اور شخص کی صوابدید پر مبنی نہ تھی بلکہ جنگ جمل کے بعد رونما ہونے والے واقعات نے آپ کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ حضرت عائشہ کے اپنے اصلی گھر میں منتقل ہونے' باغیوں کے منتشر ہونے اور امن و امان کے برقرار کئے جانے کے ایک یا دو ماہ بعد آپ عبداللہ بن عباس کو گورنر بناکر کوفہ کی جانب روانہ ہوگئے تاکہ اسے اپنی حکومت کا نیا دارلخلافہ بنا سکیں۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے اس اقدام کے اسباب کے بارے میں مورخین کے درمیان خاصا اختلاف پایا جاتاہے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مالک اشتر اور کوفہ کے دوسرے اشراف نے آپ سے یہ مطالبہ کیا تھا اور انہیں کے شدید اصرار پر آپ نے کوفہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا جب کہ کچھ اور مورخین کا یہ نظریہ ہے کہ چونکہ ان باغیوں نے کہ جنہیں طبری اور دوسرے

مورخین سبئیہ فرقہ نام دیتے ہیں، کوفہ کی جانب پیش قدمی کی تھی چنانچہ مجبوراً آپ کو بھی ان سے ملحق ہونا پڑا تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بصرہ کی طرح کوفہ میں بھی آپ کے لئے ایک اور فتنہ کھڑا کر دیں۔

کچھ روایات کے مطابق جب جناب امیر علیہ السلام نے تین شہروں کی گورنری اپنے چچا زاد بھائیوں کے سپرد کی اور عبداللہ بن عباس کو بصرہ میں، عبیداللہ کو یمن میں اور قثم بن عباس کو حجاز میں گورنر بنایا تو مالک اشتر نے آپ پر اعتراض کیا۔ اسی ناراضگی کو لئے وہ کوفہ کی جانب بڑھ گیا چنانچہ آپ نے کوفہ کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مالک اشتر یا دوسرے لوگوں کی وجہ سے امن و امان کو خطرہ لاحق ہو یا اس نئے نظام حکومت کو نقصان پہنچے۔

یہ اور اس جیسے نہ جانے کتنے اسباب بیان کئے گئے ہیں لیکن بظاہر ان میں سے کوئی بھی نتیجہ خیز نہیں ہے اس لئے کہ اگر سبئیہ فرقہ کا وجود مان بھی لیا جائے تب بھی یہ کہنا پڑے گا کہ بصرے میں اس گروہ کی سرگرمیاں اختتام کو پہنچ گئیں تھیں، ان کے مقاصد پورے ہوگئے تھے اور ان کے لئے کسی صورت صلاح نہ تھی کہ بصرہ میں جناب امیر کی کامیابی اور لوگوں کی آپ سے تجدید بیعت کے بعد بھی کوفہ میں حالات خراب کرتے جیسا کہ خود مورخین لکھتے ہیں۔ پھر خود ان لوگوں کے بیانات کے مطابق ابن سباء جناب امیرؑ سے الگ نہ تھا جو آپ کے خلاف بغاوت کرتا۔ جہاں تک عباس بن عبدالمطلب کے صاحبزادوں کو گورنر بنانے پر مالک اشتر کی ناراضگی کا تعلق ہے تو یہ بھی راویوں کی ایجاد کردہ چیزیں ہیں اس لئے کہ مالک کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ جناب امیرؑ کے خلاف سازشیں کرتے حالانکہ جناب امیرؑ سے موصول ہونے والی مصدقہ احادیث کے مطابق آپ نے فرمایا تھا کہ مالک میرے لئے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے رکھتا تھا اس کے علاوہ آپ اسلام میں مالک کے مقام و منزلت اور اس نئے نظام حکومت کے لئے ان کی پرخلوص کاوشوں سے واقف تھے اور اس سے بھی کہ مالک آپ کے ارادوں کے مطابق معاملات کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔

جب ہم جناب امیر علیہ السلام کی خلافت کے دوران پیش آنے والے واقعات اور کٹھن شرائط کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان میں سے باآسانی کوئی ایسا سبب مل جائے گا جس کی وجہ سے آپ نے مدینہ منورہ کو چھوڑکر کوفہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ بصرہ میں شروع ہونے والی مسلحانہ جدوجہد سے پہلے معاویہ کو برکنار کرنے کی خاطر آپ شام کے لئے ایک مضبوط و جرار لشکر ترتیب دینے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ پھر جب طلحہ و زبیر کی جانب سے اس جدوجہد کا آغاز ہوااور لالچی و حریص لوگوں اور خاندان بنی امیہ کے علاوہ حضرت عائشہ بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئیں تو امت اسلامیہ کے لئے یہ خطرہ ایک نئی شکل اختیار کرگیا جو کسی صورت معاویہ سے کم نہ تھا۔ حجاز سے شروع ہونے والی اس بغاوت میں معاویہ کو بھرپور موقعہ ملا کہ اپنے علاقہ میں کام کرے اور شام کے لوگوں کو اپنا مکمل مطیع و فرمانبردار بنالے اس نے تمام احتیاطی انتظامات کے باوجود عراق پر اپنا تسلط جمانے کے لئے وہاں کے بزرگ و مشائخ اور لشکر کے سرداروں کوزیر کرنے کی کوششیں بھی کیں نتیجتا" وہ کچھ کو اپنے ساتھ ملانے اور ان کی قیمت لگانے میں کامیاب بھی ہوا معاویہ کی یہ تمام چالیں جناب امیر سے ڈھکی چھپی نہ تھیں چنانچہ آپ نے ترجیح دی کہ ایک ایسی جگہ کو حکومت کا مرکز بنائیں جو شام سے قریب ہو اورکیونکہ کوفہ عسکری موقعیت کے علاوہ شام کی حدود سے بھی قریب تھا لہٰذا آپ نے اسے دارلخلافہ بنالیا۔

کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ ۳۶ ھ رجب المرجب کے اواخر میں حضرت علی علیہ السلام کوفہ میں داخل ہوئے تو لوگوں نے آپ کا پر تپاک استقبال کیا اور معاویہ کے خلاف کی جانے والی جنگی تیاریوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس لئے کہ جولوگ بصرہ کی جنگ میں آپ کے ساتھ تھے وہ ایک اور مرتبہ آپ کا ساتھ دینے کے متمنی تھے اور جنہوں نے جنگ بصرہ میں آپ کے خلاف تلوار اٹھائی تھی وہ اپنی اس غلطی کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ ان سب کا آپ سے یہ پر زور مطالبہ تھا کہ اس سے پہلے کہ معاویہ شام کی فوجوں کو لیکر عراق پر حملہ کرے آپ اس پر ایک زبردست یلغار کریں۔ کوفیوں کی جنگی تیاریوں اورجوش و ولولہ کے باوجود جناب امیر علیہ السلام نے ایک بار پھر معاویہ پر حجت تمام کرنا

چاہی اور ایک بار پھر سفیر بھیج کر اسے اپنی اطاعت کرنے اور عام مسلمانوں کے زمرے میں شامل ہوجانے کی دعوت دی۔ یہ دعوت اس لئے بھی تھی کہ آپ کے ساتھ موجود تمام لوگوں پر حق و حقیقت واضح ہوجائے۔ معاویہ نے آپ کی اس دعوت کا جواب مثبت انداز میں نہ دیا۔ وہ آپ سے ٹیڑھی ترچھی اور جذبات کو ابھارنے والی باتیں کرتا رہا اس نے آپ پر کئی الزامات بھی عائد کئے جن میں خلفاء کے حقوق کی پاسداری میں کوتاہی' عثمان سے حسد اور لوگوں کو اس کے خلاف ورغلانا بھی شامل تھا۔ اپنے ہر خط میں وہ آپ پر حملے کرتا رہا اور آپ کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتا رہا۔

اگر بصرہ میں مولائے متقیانؑ کے خلاف اس انداز میں بغاوت نہ ہوتی اور اگر عراق کے کچھ علماء معاویہ کے مفادات کی پاسداری نہ کرتے تو اس کی ہمت نہ تھی کہ آپ سے اس انداز میں مخالفت کرتا۔ ایسی صورت میں آپ کا فریضہ تھا کہ آپ اس کی تحریروں کا جواب دیتے اور اس کے فاسدار افکار اور باطل نظریات کو غلط ثابت کرتے لیکن ظاہر ہے کہ آپ اسی انداز میں جواب دیتے جو آپ کی شخصیت کے مطابق ہوتا۔

ان جوابات میں آپ فرماتے ہیں کہ'

"تم خیال کرتے ہو کہ میں نے خلفاء سے حسد کیا اور ان کے خلاف محاذ آرائی کی اگر یہ بات صحیح بھی ہو تو تمہارے خلاف کوئی کام نہیں کیا گیا جو تم سے معذرت کی جائے۔ یہ ایک ایسی شکایت ہے جس پر تمہیں شرم کرنی چاہیے۔ تم کہتے ہو کہ مجھے اس وقت تک اس اونٹ کے مانند پھرایا جائے گا جس کی ناک میں چھری ڈال دی گئی ہو یہاں تک کہ بیعت کرلوں۔ خدا کی قسم تم میری برائی کرنا چاہتے تھے جب کہ تعریف کردی اور مجھے رسوا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور خود رسوا ہوئے۔ اس لئے کہ ایک مسلمان کے لئے اس میں کوئی ذلت نہیں کہ اس پر ظلم کیا جائے جب تک کہ وہ اپنے دین میں شک نہ کرنے لگے اور اس کے یقین میں کمی واقع نہ ہو۔ جہاں تک میرا اور عثمان کا معاملہ ہے تو میرے بجائے اس واقعہ کا جوابگو تمہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ تم اس کے

قرابتدار ہو۔ ہم میں سے کس نے اس سے زیادہ دشمنی کی اور اس کے قتل کی راہ ہموار کی۔ آیا وہ جس نے اس کی نصرت و حمایت کی اور دشمنوں کی زد سے اسے بچایا یا جس سے مدد کے لئے کہا گیا تو وہ بہانہ بازی کرتا رہا یہاں تک کہ جو عثمان کے مقدر میں لکھا تھا وہ پورا ہوگیا۔

میں اس پر بھی معذرت نہیں کر سکتا کہ اس کے غلط اقدامات کی مذمت کرتا تھا اس لئے کہ اگر رہنمائی کرنا یا صحیح راہ دکھانا ہی میرا گناہ ہے تو یہی کہوں گا کہ بہت سے بے گناہ لوگوں پر طعن و تشنیع کی جاتی ہے اور نصیحت کرنے والا اور بھلا چاہنے والا بسااوقات تہمتوں کا مرکز بنتا ہے۔ میں تو صرف اصلاح چاہتا تھا اور میں تمام توفیقات صرف اللہ تعالیٰ ہی سے طلب کرتا ہوں۔

معاویہ نے اپنے کچھ خطوط میں جناب امیر سے کہا تھا کہ تمہارے اور تمہارے اصحاب کا حساب صاف کرنے کے لئے تلوار ہی ہوگی۔ امام نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ کب تم نے خاندان عبدالمطلب کو دشمن سے گریزاں اور تلوار سے ہراساں پایا ہے جو اس قسم کی تمسخر آمیز بات کرتے ہو۔ ذرا صبر سے کام تو لو پھر دیکھو گے کہ جسے تم مقابلہ کے لئے للکارتے تھے وہ تمہیں مقابلہ کی دعوت دے گا اور ناممکن کو ممکن بنادے گا۔ میں مہاجرین و انصار اور ان کے حامیوں کا ایک عظیم لشکر لیکر تم پر یلغار کرنے والا ہوں۔ ان لوگوں کے ساتھ جو انتہائی نیک ہیں اور آسمان و زمین میں بکھرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے موت کے کفن پہنے ہوئے ہیں اور ان کی نظر میں سب سے زیادہ پسندیدہ ملاقات اپنے پرودگار کی ملاقات ہے۔ ان کی ہمراہی جنگ بدر کے مجاہدین اور بنی ہاشم کی وہ تلواریں کررہی ہیں جن کا نشانہ تمہارا بھائی' تمہارا ماموں' تمہارے دادا اور تمہارے خاندان کے دوسرے لوگ بن چکے ہیں اور ظالموں کا یہ انجام کچھ بعید نہیں۔

مورخین دعویٰ کرتے ہیں کہ یوں معاویہ اور حضرت امیر کے درمیان خط و کتابت کا یہ سلسلہ کسی نتیجہ تک نہ پہنچ سکا۔ وہ اپنے خطوط میں رائے عامہ کو خراب کرنے کی بھرپور کوشش کرتا اور حضرت عثمان اور ان کے قاتلوں کا

تذکرہ کرتا۔ وہ آپ کے مستحق ہونے اور خلافت کے لئے دوبارہ سے شوریٰ قائم کرنے کے لئے کہتا اور اس طرح جھوٹ اور مکر و فریب سے کام لیتا۔ اگر وہ واقعی تہہ دل سے حضرت عثمان کا غم خوار تھا تو اس کا فرض تھا کہ پہلے بیعت کرتا پھر اگر حضرت عثمان کے لواحقین اسے خون بہاء کا اختیار دیتے تو وہ خلیفہ المسلمین سے محاکمہ کی درخواست کرتا اور اگر مقتول کے لواحقین اسے یہ حق نہ دیتے تو بقولِ امام علیہ السلام اس کے پاس حضرت عثمان کے خون کی بات کرنے کا کوئی مناسب جواز نہ تھا۔اگرچہ حضرت عثمان مظلومیت کے ساتھ ہی مار دیئے گئے ہوں۔

خلافت کے بارے میں معاویہ کی حرص و لالچ کسی ایک سے بھی ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اگر اس نے ایک زبردست لشکر تشکیل دیا تھا تو صرف اس لئے کہ موجودہ خلیفہ سے لڑسکے چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ چنانچہ اگر جنگ جمل میں طلحہ۔ زبیر کامیاب ہوجاتے اور ان میں سے کوئی ایک بر سراقتدار آجاتا تو وہ ان کے ساتھ بھی یہی کرتا۔ اس وقت وہ جناب امیر کا خیرخواہ بن جاتا اوران کے پاس آتا جیسا کہ حضرت ابوبکر کے خلیفہ بننے پر اس کا باپ آپ کے پاس آیا کرتا تھا اور آپ کو اس وقت کی خلافت کے خلاف ابھارتا تھا۔ وہ دوبارہ سے شوریٰ کا مطالبہ کرکے لوگوں کو دھوکہ دینا چاہتا تھا اس لئے کہ جس شوریٰ کی وہ بات کرتا تھاوہ حجاز و عراق کے انصار و مہاجرین نہ تھے بلکہ جیسا کہ خود اس کے خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ یہ شوریٰ شام کے لوگوں پر مشتمل تھی اس لئے کہ اس کے خیال میں اب حکومت اہل عراق وحجاز سے چھن چکی تھی اور یہ واضح تھا کہ شام کے لوگ صرف معاویہ کو منتخب کرتے اس لئے کہ معاویہ نے بنی امیہ اور بنی عاص کے لالچی و حریص لوگوں کا حلقہ لگایا ہوا تھا۔

معاویہ اور عمر بن عاص دونوں ایک دوسرے کے خلاف بھی بہت کچھ کہہ جاتے تھے اور ایک دوسرے کے بارے میں بدگمان بھی تھے۔

ابن طقطقی کی ”آداب سلطانیہ“ میں ہے کہ ایک دن معاویہ نے اپنے ہم نشینوں سے پوچھا کہ کون سی چیزسب سے زیادہ قابل تعجب ہے۔ سب نے کچھ

نہ کچھ کہا اس محفل میں عمر بن عاص بھی موجود تھا۔ وہ بولا کہ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ناحق حقدار پر غالب آجائے۔ اس کا اشارہ جناب امیرؑ اور معاویہ کے درمیان ہونے والی محاذ آرائی کی جانب تھا۔

معاویہ سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ صرف اس کی ذات ہے۔ لہٰذا اس نے عمر بن عاص سے جواباً" کہا کہ سب سے زیادہ حیرتناک بات یہ ہے کہ انسان وہ چیز دے دے جسے دینے کا مستحق نہ ہو خاص کر اس وقت جب اس چیز سے اسے کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔

اسی طرح ایک اور موقعہ پر تاریخ اس کے موقف کی ترجمانی کرتی ہے کہ وہ معاویہ کو کچھ بھی نہ سمجھتا تھا اور جناب امیرؑ کی فضیلتوں اور آپ کے حق پر ہونے کا معترف تھا لیکن ذاتی مفادات ان تمام چیزوں پر غالب آگئے تھے۔

مورخین لکھتے ہیں کہ جب مصر معاویہ کے قبضہ میں آگیا تو وہ ابن عاص سے کئے گئے وعدہ کو وفاء کرنے میں ٹال مٹول سے کام لینے لگا عاص کے بیٹے نے کسی کے ذریعہ سے اسے یہ قصیدہ بھجوایا کہ'

یہ ہماری جہالت و نادانی تھی کہ ہم نے سب سے زیاہ بافضلیت اور سب سے عظیم رہنما کے مقابلہ میں تمہاری مددو حمایت کی ورنہ تم کہاں اور وہ کہاں۔ ستارے کہاں اور خاک کہاں (یعنی تم ان کی خاک پاکے برابر بھی نہیں)۔

اس قسم کے کلمات سے کہ جن کا مبادلہ بسا اوقات ہوتا رہتا تھا' معلوم ہوتا ہے کہ طرفین کے درمیان نہ محبت و دوستی تھی اور نہ امت مسلمہ کے مفاد کے لئے وہ یکجا ہوئے تھے بلکہ یہ ذاتی مفادات تھے جنہوں نے انہیں جمع کر دیا تھا اور اسی مفاد کی خاطر وہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار تھے۔ اس کے بر خلاف ان کے حریف کا مقصد حق کی بالادستی تھی اور اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کسی سے جنگ نہ کرتے اسی لئے یہ ناممکن تھا کہ حق کو حاصل کرنے کے لئے وہ باطل کا سہارا لیتے اور ظالموں سے مدد حاصل کرتے۔ انہیں اس سے مطلب نہ تھا کہ آخر کار وہ مقصد تک پہنچ جائیں گے یا نہیں' یہی کافی تھا کہ وہ حق کی خاطر

لڑے۔ اگر وہ حق کے پرچم تلے جان بھی قربان کر دیتے تو یہ بھی ان کے لئے ایک واضح اور عظیم کامیابی تھی اور آنے والی نسلوں کے لئے جیتی جاگتی مثال تھی۔

خلاصہ کلام یہ کہ فریقین کے درمیان جاری خط و کتابت کسی نتیجہ تک نہ پہنچ سکی اور سوائے جنگ کے کوئی اور حل باقی نہ رہ گیا۔ معاویہ نے شام کی فوجوں پر مشتمل ایک لاکھ سے زائد لشکر تشکیل دیا جس کی قیادت وہ خود کر رہا تھا۔ اس نے عراق پر حملہ کے لئے پیش قدمی بھی شروع کر دی تھی۔ جب مولائے متقیان کو اس کی خبر ملی تو آپ نے ایک لشکر ترتیب دیا اور عراق کی حدود سے باہر نکل کھڑے ہوئے تاکہ قبل اس کے کہ معاویہ اور اس کی فوجیں عراق پر حملہ کر کے اسے خاک سے یکساں کر دیں اور وہاں قتل و غارتگری کا بازار گرم کریں آپ اس پر یلغار کر دیں۔

معرکہ صفین اور اس میں پیش آنے والے حادثات

معاویہ بھرپور فوجی تیاریوں کے ساتھ شام سے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے نہر فرات کے پاس واقع صفین کی وادی میں پڑاؤ ڈالا اور ر پر قبضہ کرکے بیٹھ گیا جب جناب امیر علیہ السلام اس وسیع و عریض وادی میں ایک ایسی جگہ پہنچے جو معاویہ سے چنداں دور نہ تھی تو معاویہ نے آپ کی فوجوں پر پانی بند کر دیا اور ایک بوند پانی پینے کی اجازت بھی نہ دی۔ چنانچہ پیاس سے آپ کی فوجوں کا برا حال ہونے لگا اور مارے تشنگی کے وہ تڑپنے لگے۔ آپ نے معاویہ کو پیغام بھجوایا کہ آپ اس آب و خاک پر قبضہ جمانے نہیں آئے اور اگر اس سے پہلے بھی پہنچ جاتے تو ہرگز ان لوگوں پر پانی بند نہ کرتے۔

کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ اس موقع پر ابن عاص نے کافی کوششیں کیں کہ معاویہ پانی کی ترسیل پر پابندی نہ لگائے لیکن اس نے ایک نہ سنی اور کہا کہ'

"یہ ہماری فتوحات کی ابتداء ہے۔ خدا نہ کرے کہ میں انہیں پانی پلاؤں تاکہ وہ مجھ پر غالب آجائیں۔"

یہی حال اس کی فوجوں کا بھی تھا جو چیخ چیخ کر عراق کے لوگوں سے مخاطب ہوتے اور کہتے کہ وہ ایک بوند بھی پانی نہ دیں گے یہاں تک کہ عراق کے لوگ پیاسے ہی تڑپ تڑپ کر مرجائیں گے۔

ایک طرف سے پانی کا مسئلہ درپیش تھا اور دوسری طرف سے جناب امیر علیہ السلام اس تیزی کے ساتھ جنگ کی پہل نہ کرنا چاہتے تھے۔ آپ گذشتہ کاوشوں کی طرح ابھی بھی اتمام حجت اور اتحاد و یکجہتی کے خواہاں تھے۔ اس بات کی تصدیق کثیر روایات سے ہوتی ہے لیکن معاویہ کے اس موقف کی وجہ سے مجبوراً آپ کو طاقت کا استعمال کرنا پڑا اور آپ نے اپنے دسیوں ہزار اصحاب کی جانیں بچانے کی خاطر ایک دستہ مالک اشتر کے ساتھ روانہ کردیا۔

مالک اشتر نے زبردست حملہ کر کے چند ہی گھنٹوں میں پانی پر قبضہ کرلیا۔ ابن قتیبہ کی روایت کے مطابق اس موقعہ پر ابن عاص نے معاویہ پر سخت تنقید کی اس لئے کہ معاویہ نے اس کے مشورہ پر عمل نہ کیا تھا اس نے معاویہ سے یہ تک کہہ دیا کہ علی تم سے اور تمہارے لشکر سے وہ بدسلوکی نہ کریں گے جو تم نے ان سے روارکھی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ معاویہ اور ابن عاص دونوں جناب امیر کو اچھی طرح پہچانتے تھے انہیں معلوم تھا کہ اگر معافی و درگزر کی ذرا سی گنجائش بھی ہو تو وہ سزا نہیں دیا کرتے اور ان کا اخلاق ہرگز ایسا نہیں کہ پانی جیسی ضروری چیز کو خلق خدا میں سے کسی ایک بند پر کردیں اور نہ ہی وہ ظلم و زیادتی کے بل بوتے پر فتح حاصل کرنا چاہتے تھے جیسا کہ معاویہ کا دستور تھا۔ ان دلائل کی بنیاد پر ابن عاص اور معاویہ کو معلوم تھا کہ حضرت علیؑ ان پر پانی بند نہ کریں گے چاہے یہی چیز ان کی شکست کا باعث بنے۔ کچھ لوگوں نے جناب امیر علیہ السلام سے بدلہ لینے کے لئے کہا اور مختصر سے عرصہ کے لئے کیوں نہ سہی لیکن دشمن پر پانی بند کرنے کی درخواست کی۔ لیکن آپ نے اسے سختی کے ساتھ مسترد کردیا

آپ نے اپنے ان دشمنوں کو پانی کا بے دھڑک استعمال کرنے دیا جو آپ کو پیاسا مار دینا چاہتے تھے تاکہ اس چیز کو آپ کے اصحاب نمونہ عمل بنا سکیں۔

اگر اہل شام میں انسانیت نام کی چیز ہوتی تو یہی نیک خصلت اور عفو و درگزر کی زندہ مثال کافی تھی کہ وہ حضرت علیؑ اور معاویہ میں فرق کر سکتے اور جان لیتے کہ معاویہ کی مدد کرکے وہ باطل کے مقابلہ میں حق کا' بھلائی کے مقابلہ میں برائی کا اور عفو و درگذر کے مقابلہ میں طغیان و سرکشی کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس حسن سلوک کے باوجود معاویہ نے اپنی فوجوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ امیرالمومنین حضرت علیؑ کو ناسزا کہیں۔ آپ کی فوج کے لوگوں نے جب اپنے مولا کے بارے میں اس قسم کی باتیں سنیں تو انہوں نے بھی معاویہ کو لتاڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جناب امیرؑ نے ان لوگوں کو اس قسم کی واہیات گفتگو سے پرہیز کرنے کے لئے کہا اور فرمایا کہ '"میں پسند نہیں کرتا کہ تم گالی گلوج کرنے والی قوم بن جاؤ۔ تاہم اگر کبھی ان لوگوں کے کرتوتوں کو بیان کرو یا ان کے کردار پر روشنی ڈالو تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔"

آپ نے مزید فرمایا کہ ناسزا کہنے کے بجائے تم یہ دعا کیا کرو' "پروردگارا تو ہماری اور ان کی جانوں کی حفاظت فرما۔ ہمارے اور ان کے درمیان مصالحت برقرار کر اور انہیں گمراہی سے نجات دے تاکہ وہ حق و باطل میں تمیز کر سکیں اور ان میں سے جن لوگوں نے دشمنی وعداوت کا راستہ اختیار کر رکھا ہے اسے چھوڑ دیں۔"

بعد ازاں (جب ادھر سے حملے ہونے لگے اور مولا نے جنگ کی اجازت دینے میں تامل کیا تو) آپ کے اصحاب نے جنگ کرنے میں آپ کو سست ٹھہرایا۔ کچھ نے کہا کہ آپ شام کے لوگوں کے بارے میں متردد دکھائی دیتے ہیں اور کچھ نے آپ کو بزدلی کے طعنے بھی دیئے آپ نے فرمایا کہ'

"خدا کی قسم میرے لئے فرق نہیں پڑتا کہ میں موت کے دامن میں جاگروں یا موت میرے پاس آجائے" آپ نے جنگ کے بارے میں تاخیر سے کام لینے پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ'

"میں نے اس لئے جنگ شروع کرنے میں تاخیر سے کام لیا ہے کہ مجھے امید ہے کہ شام کے کچھ گروہ مجھ سے آملیں اور ہدایت پائیں۔ میری نظر میں ایسا کرنا ان سے اس حالت میں جنگ کرنے سے بہتر ہے کہ وہ جاہل و نادان ہوں۔"

"اے خدا تو جانتا ہے کہ اگر تیری رضا اس میں ہوتی کہ میں تلوار کی دھار کو اپنے پیٹ میں اتار لیتا اور پھر اس حد تک خم ہوجاتا کہ وہ میری پشت سے باہر نکل آتی تو میں ایسا کرتا۔ پروردگارا آج کے دن میری نظر میں کوئی کام ایسا نہیں جو تیری بارگاہ میں ان فاسقوں سے جنگ و جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہو اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی عمل، تیرے نزدیک اس سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے تو اسے انجام دیتا۔"

آپ اسی رازونیاز اور حمد و ثنا میں تھے کہ آپ کے لشکر کے کئی آدمی کام میں آگئے۔ چنانچہ آپ نے بھی جنگ کی اجازت دی اور پھر وہ گھسان کی لڑائی ہوئی کہ تاریخ میں اس کا نظیر نہیں ملتا۔ ہم اس تباہ کن جنگ کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے جو مہینوں جاری رہی اور جس کی لپیٹ میں ایک لاکھ سے زائد مسلمان آگئے جیسا کہ تاریخ اس کے بارے میں قلم اٹھاتی ہے۔ جناب امیر علیہ السلام نے باقی ماندہ انصار و مہاجرین کے ساتھ مل کر اہل شام کی جانب پیشقدمی جاری رکھی۔ آپ کی فوج میں حضرت عمار بن یاسر اور دوسرے صحابہ کرامؓ پیش پیش تھے۔ حضرت عمار تو بلند آواز سے لوگوں کو مخاطب کرکے کہہ رہے تھے کہ،

"خدا کی قسم اگر وہ لوگ ہمارے ٹکڑے بھی اڑادیں گے تو ہمارے اس یقین میں کمی واقع نہ ہوگی کہ ہم حق پر ہیں اور وہ باطل پر ہیں۔"

وہ اپنے سینہ اور گردن پر تیر اور نیزوں کے حملے سہتے رہے یہاں تک کہ دشمن اور اپنی صفوں کے درمیان آکر انہوں نے دونوں ہاتھ اٹھادیئے اور کہا کہ،

اے خدا میں کسی ایسے کام سے واقف نہیں جو تیری بارگاہ میں ان لوگوں

سے جہاد کرنے سے افضل ہو اور اگر واقف ہوتا تو ضرور اسے ہی انجام دیتا۔

یہ حضرت عمارؓ کا بلند کردار اور ان کے نیک جذبات تھے کہ معاویہ اور اس کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد ڈگمگا گئی۔ اس لئے کہ جناب رسالتمآبؐ کی یہ حدیث قرآنی آیت کی طرح ہرایک کے ورد زبان ہوگئی تھی کہ'

"عمار پر صد آفرین ہو کہ انہیں باغی گروہ قتل کرے گا۔"

"عمار حق کے ساتھ ہیں اور جہاں جہاں یہ جاتے ہیں حق قدم قدم پر ان کے ساتھ رہتا ہے۔"

عمار پورے ایمان وایقان کے ساتھ جناب امیر علیہ السلام کی طرف سے لڑرہے تھے اور اللہ تعالیٰ سے یہ اظہار کررہے تھے کہ معاویہ سے جنگ کرنا ان کی نظر میں اللہ تعالیٰ کا محبوب عمل ہے۔ چنانچہ معاویہ اور اس کے ساتھی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق باغی تھے اس لئے کہ اللہ کے رسول جذبات یا نفسانی خواہشات کے باعث گفتگو نہ فرماتے تھے۔ پھر قرآن کریم مسلمانوں کو اس وقت تک باغی گروہ سے جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف پلٹ نہیں جاتے جیسا کہ اس آیۂ شریفہ میں ارشاد رب العزت ہوتا ہے کہ'

"وان طائفتان من المومنين اقتتلوفاصلحوا بينهما فان بغت احد هما على الاخرى فقاتلوا التى تبغى حتى تفىء الى امر الله-"

"اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں ایک دوسرے سے جنگ کرنے لگیں تو تم ان کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کرو پس اگر وہ ایک دوسرے کے خلاف بغاوت کر بیٹھیں تو اس سے جنگ کرو جس نے بغاوت کی ہو یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر پلٹ جائے۔"[له]

له سورۂ احزاب آیۂ نمبر-۹

چنانچہ عمار قرآن کریم کے حکم پر جنگ لڑ رہے تھے۔ ان کے افکار نے بہت سے ان ذہنوں کو جھنجوڑ دیا تھا جو معاویہ وابن عاص کے ہاتھوں دھوکہ کھا گئے تھے۔ ان کی آواز میدان بدر میں چاروں طرف گونج رہی تھی'

"خدا کے بندوں ہماری طرف آجاؤ۔ میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں بے شک جناب رسالت مآبؐ نے مجھے خبر دی تھی کہ مجھے پانی ملا ہوا دودھ پلایا جائے گا اور باغی گروہ قتل کرے گا۔"

یہ سنکر معاویہ کا لشکر تذبذب کا شکار ہوگیا۔ صورتحال اس وقت اور خراب ہوئی جب ذوالکلاع حمیری اور اس کے قبیلہ والوں اور ہم پیان لوگوں نے جنگ کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ عمار بن یاسر حضرت علیؑ کی جانب سے جنگ لڑ رہے تھے۔

معاویہ تک جب یہ خبر پہنچی کہ اس کے لشکر میں حدیث رسولؐ کے چرچے ہیں تو اس نے ابن عاص (ابن نابغہ) کو بلوایا اور اس مشکل سے نمٹنے کے سلسلہ میں اہم مشورے بھی کئے۔ ابن عاص نے ذوالکلاع حمیری سمیت دوسرے کمانڈروں کو جمع کر کے ان کے سامنے قسم کھائی کہ آخرکار عمار بن یاسر کو ان کی طرف آنا ہے۔ اس نے ان لوگوں سے چاہا کہ وہ جنگ جاری رکھیں اور ان دنوں کا انتظار کریں جب عمار معاویہ کے پرچم تلے ہوں گے۔ ابن عاص کی باتوں سے گھبراہٹ میں کمی واقع ہوئی اور دلوں کو کچھ اطمینان سا ہوا۔ دن گذرتے گئے اور لڑائی میں روز بروز شدت آنے لگی۔ شیر خدا اپنے اصحاب کے ساتھ بڑھ بڑھ کر معاویہ اور اس کی فوجوں پر حملے کرتے اور جو سامنے آتا انہیں تہ تیغ کرتے سوائے ان بےحیا بزدلوں کے جو موت کو سر پہ منڈلاتے دیکھ کر اپنی شرم گاہوں کو نمایاں کرتے۔

انہی دنوں میں سے ایک دن حضرت عمار ابولعادیہ جھنی کے تیر کا نشانہ بن گئے اور اسی دن ذوالکلاع حمیری بھی مارے گئے چنانچہ معاویہ کا چہرہ کھل کھلا اٹھا۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم اگر ذوالکلاع عمار کے بعد زندہ رہ جاتا تو لشکر کے بڑے حصہ کو علی بن ابی طالب کی طرف لے جاتا۔

کچھ روایتوں میں حضرت عمار کے قتل کو حضرت عمر کے ایک غلام سے نسبت دی گئی ہے۔

اس کے بعد یہ خونی جنگ ایک ہفتہ سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی اس پورے عرصہ میں کچھ مورخین کے مطابق ساٹھ ہزار لوگ کام میں آگئے۔ لڑائی دن رات جاری تھی اور عراق کا لشکر شام کی فوجوں پر غالب آیا چاہتا تھا اور معاویہ کو زندہ پکڑنے کے نزدیک تھا۔ معاویہ نے فرار کے لئے اپنا گھوڑا منگا بھیجا تھا اور جناب امیرؑ اپنے اصحاب کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے تھے۔

ابن قتیبہ "امامت وسیاست" میں لکھتے ہیں کہ امیرالمومنین نے بیچ رات میں بلند آواز سے کوچ کرنے کے لئے کہا۔ معاویہ نے جب یہ آواز سنی تو اس کے بارے میں عمر بن عاص سے دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ اس کے خیال میں یہ شخص کوچ کر رہا ہے جب صبح ہوئی تو شیر خدا اور ان کے اصحاب معاویہ کے لشکر میں جا گھسے تھے۔ اس نے معاویہ کو اشارہ کیا کہ قرآن کریم کو نیزوں پر اٹھوا دے۔ معاویہ نے ایسا ہی کیا اور اس جنگ کو رکوانے کی خاطر جو اسے اور اس کی فوجوں کو صفحہ ہستی سے مٹا رہی تھی' قرآن مجید کو نیزوں پر اٹھوا دیا اور اپنی جانب سے اعلان کیا کہ'

"اے عراق کے لوگو یہ خدا کی کتاب ہے جو ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ آؤ اس پر عمل کریں۔ شام کے لوگوں کے بعد کون ان کے بچوں کی کفالت کرے گا اور عراقیوں کے بعد کون ان کے معصوم بچوں کی دیکھ بھال کرے گا اور روم و کفار کی فوجوں سے نبرد آزما ہو گا۔"

"انساب الاشراف"[1] کے مطابق جب جناب امیرؑ نے کلام پاک کو نیزوں کی انی پر چڑھتے دیکھا تو فرمایا کہ' "معبود کی قسم یہ لوگ اہل قرآن نہیں ہیں۔ یہ صرف ایک دھوکہ وفریب ہے۔ انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ میں نے جنگ جمل میں اپنے حریفوں کے سامنے قرآن کو پیش کیا تھا چنانچہ انہوں نے بھی اسی

---

[1] بلاذری کی مشہور عالم تصنیف۔

روش کو اپنایا لیکن ان کے وہ ارادے نہیں ہیں جو میرے تھے چنانچہ تم لوگ ان کے ظاہر پر نہ جاؤ اور اپنے عزم وارادہ اور یقین کو باقی رکھو۔"

یوں تو لڑائی اپنے اختتام کو جا پہنچی تھی اور امیر المومنین علیہ السلام کی کامیابی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے اور معاویہ بھاگنے کی تیاریوں میں مصروف تھا وہ فرار کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ عربوں نے اسے صبر و ضبط اور حوصلہ سے کام لینے کے لئے کہا تھا۔ چنانچہ اس لمحہ جب معاویہ کی فوجوں پر خوف و دہشت طاری تھی ابن عاص جیسے فطین لوگوں نے اپنی چاپلوسی کو بروئے کارلاتے ہوئے قرآن کریم کو نیزوں پرچڑھوادیا اور اس کی طرف رجوع کرنے کے لئے کہا۔ اس نے در حقیقت جنگ بصرہ میں جناب امیرؑ کی روش سے فائدہ اٹھایا تھا لیکن ان دو موقعوں میں آسمان زمین کا فرق تھا۔ جناب امیر علیہ السلام اس وقت قرآن مجید کو جنگ کی صفوں میں سامنے لائے تھے جب مفاہمت کی تمام کوششیں ناکام ہوچکی تھیں تاکہ جنگ کے تلخ نتائج سے بچاجاسکے حالانکہ آپ بخوبی جانتے تھے کہ کامیابی آپ ہی کی ہوگی۔ کوفہ پہنچنے کے بعد اور ایک طویل عرصہ تک آپ اہل شام سے امن پسندانہ طرز عمل کو اختیار کرتے رہے آپ نے ان سے خط و کتابت اور سفیروں کی آمد ورفت کے ذریعہ مسلسل رابطہ رکھا آپ نے شام کے لوگوں کو جنگ سے پیدا ہونے والے ناخوشگوار حالات اور منفی اثرات سے بھی ڈرایا نیز پانی پر قبضہ اور پھر اسے معاویہ کی فوجوں کے لئے آزاد چھوڑکر عفو و درگزر اور حسن خلق کی ایک عمدہ مثال پیش کی۔ آپ درحقیقت ایک پیغام کے علمبردار تھے اور ایک مشن کو لیکر آگے بڑھے تھے لیکن معاویہ سلطنت کا رسیا اور اقتدار کا بھوکا تھا۔ وہ اسی بہیمانہ انداز سے جنگیں لڑتا تھا جس انداز سے اس کا باپ ابوسفیان اور ماں ھند' جناب رسالتمآبؐ کے خلاف جنگیں لڑا کرتے تھے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ معاویہ نے اس وقت خدا کی کتاب کی طرف بلایا جب جنگ نے اسے تباہ و برباد کردیا تھا اور کامیابی کی آخری امید بھی اس سے چھین لی تھی اس سب کے باوجود خدا کی کتاب کی طرف بلاکر وہ اسے فیصلہ کرنے کے لئے سامنے نہ لایا تھا بلکہ عراق سے آئے ہوئے لشکر کو جنگی میدان میں شکست نہ دے سکنے کے بعد اپنے مکر و فریب کے دام میں اسیر کرنا چاہتا

تھا۔ اس کی یہ چال کارگر ثابت ہوئی اور جگہ جگہ سے صلح کی آوازیں اٹھنے لگیں اور قرآن کریم کی طرف رجوع کرنے کے لئے کہا جانے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے صلح و آشتی کا نعرہ مارنے والے نیزوں پر قرآن بلند کرنے والوں کے ساتھ ملے ہوئے ہوں۔ ان میں اشعث بن قیس نمایاں تھا اور آنحضورؐ کی زندگی سے لیکر اب تک اس کا کردار مشکوک رہا تھا اسی لئے جناب امیرؑ اس پر اعتماد نہ کرتے تھے۔ آپ نے اپنے دور خلافت میں اسے اس عہدے سے معزول کر دیا تھا جو اسے گزشتہ خلافت میں حاصل تھا۔

تاریخی مصادر بڑی صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ عراق سے آئے ہوئے اس لشکر کی ایک کثیر تعداد کی نظریں معاویہ کی بذل و بخشش پر جمی ہوئی تھیں۔ انہیں انتظار تھا کہ معاویہ انہیں اپنی عطاء سے نوازے گا۔

شرح نہج البلاغہ اس ضمن میں لکھتی ہے کہ جب عک اور اشعری قبیلوں نے معاویہ کے سامنے اپنی شرائط رکھیں اور معاویہ نے انہیں منظور کرلیا تو پھر عراقیوں کے درمیان کوئی فرد ایسا باقی نہ رہ گیا تھا جس کے دل میں معاویہ کے مال و دولت کی لالچ نہ ہو اس لئے کہ اس معاہدے کا چرچا پورے عراق میں ہوا تھا پھر اس چیز کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے کہ عراق سے آئے ہوئے اس لشکر میں حجاز، کوفہ اور بصرہ کی فوجیں تھیں۔ ان میں حضرت عثمان کے حامی بھی تھے جنھوں نے جنگ جمل میں شکست کھائی تھی کچھ روایات میں ہے کہ ماہ محرم میں عراق کے لوگ شام والوں سے ملتے جلتے تھے اور باہمی امور پر تبادلہ خیال کرتے تھے بلکہ کچھ لوگوں نے تو براہ راست معاویہ اور ابن عاص سے ملاقاتیں بھی کی تھیں۔

نہج البلاغہ کی شرح میں سفیان بن عاصم بن کلیب حرثی اپنے والد سے اور وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ معاویہ نے مجھے بتلایا کہ جس دن وہ عراق کے لشکر کے ہاتھوں اسیر ہوتے بال بال بچ گیا تو اس کے لئے ایک خاص گھوڑا لایا گیا تاکہ وہ فرار کرسکے۔ ابھی وہ تیاریوں میں مصروف تھا کہ عراق سے ایک شخص اس سے آکر کہنے لگا کہ،

"میں نے علیؑ کے اصحاب کو رات کے آغاز میں بہت قریب سے دیکھا ہے" ...... یہ سنا تھا کہ میں رک گیا اور فرار کا ارادہ منسوخ کر دیا۔ راوی کے کہنے کے مطابق معاویہ نے اسے اس شخص کے بارے میں بتانے سے انکار کر دیا جس نے اسے حضرت علیؑ کے لشکر کی تفصیلات دی تھیں۔

ان شواہد سے یہ بات یقینی ہوجاتی ہے کہ نیزوں پر قرآن اٹھانے اور اسے تحکیم کے لئے پیش کرنے کی سازش نہ صرف جنگی شکست کی پیداوار تھی بلکہ اس کا خاکہ جنگ کے ابتدائی دنوں یا ماہ محرم میں معاویہ' ابن عاص اشعث اور حریص و لالچی لوگوں نے مل کر تیار کیا تھا۔وہ اس طرح جناب امیر علیہ السلام کی فوجوں میں فتنہ ڈالنا چاہتا تھا اور اس وقت انہیں ٹکڑوں میں بانٹ دینا چاہتا تھا جبکہ اس کام کو عسکری طاقت سے نہ کر سکا تھا۔

چنانچہ جیسے ہی نیزوں پر قرآن بلند کیا گیا ادھر ادھر سے صلح کی آوازیں اٹھنے لگیں اور لوگ جنگ جاری رکھنے کے بارے میں خلیفہ المسلمین کی مسلسل ہدایتوں اور شدید اصرار کے باوجود جنگ روکنے اور خدا کی کتاب کی طرف رجوع کرنے کے لئے کہنے لگے۔ اس سازش کا ایک اور ثبوت یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے بھی تحکیم کے نعرے لگائے اور آپ کو صلح پر مجبور کرکے آپ کے سامنے اپنی تلواریں کھینچ لی تھیں وہی لوگ معاہدہ ہونے کے بعد آپؑ سے اسے توڑنے کا مطالبہ کرتے تھے۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ'

"وائے ہو تم پر کیا ہم عھد و میثاق کرنے کے بعد اسے توڑدیں؟ کیا فرمان الٰہی نہیں کہ" اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو پورا کرو" یا یہ کہ "تمام معاہدوں کے پابند رہو اور قسمیں کھانے (یا عہد کرنے) کے بعد انہیں نہ توڑو۔"

ان تمام دلائل کے علاوہ خود جناب امیرؑ کے لشکر کا دو حصوں میں تقسیم ہوجانا اور زیادہ تر کمانڈروں کا لڑائی روک دینے پر اصرار کرنا باجودیکہ وہ فتح کے دھانہ پر کھڑے تھے' اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ یہ سب پہلے سے تیار کردہ سازش کے تحت ہوا تھا۔

اس ضمن میں تاریخ یعقوبی یہ لکھتی ہے کہ اشعث بن قیس نے کہ جس کے

ہمراہ یمانیہ بھی تھا' جناب امیرؑ سے کہا کہ'

''خدا کی قسم جس چیز کی طرف وہ بلا رہا ہے آپ اس کا جواب دیں ورنہ ہم آپ کو اس کی خدمت میں پیش کر دیں گے'' یہ اسی وقت تھا جب معاویہ نے اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا تھا۔

آپ نے فرمایا کہ'

''میں اس بات کا زیادہ حقدار ہوں کہ خدا کی کتاب کی طرف بلانے والوں کا جواب دوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ معاویہ' ابن عاص' ابن ابی معیط' ابن سرح اور ابن مسلمہ اہل دین و قرآن نہیں ہیں۔ میں انہیں تم سے زیادہ پہچانتا ہوں اور بچپن سے لیکر اب تک انہیں نزدیک سے دیکھتا آیا ہوں وہ بچپن میں شریر ترین بچے تھے اور بڑے ہوکر بدترین مرد بنے افسوس ہو تم پر! یقیناً یہ حق کا کلمہ ہے جس سے باطل کا ارادہ کیا گیا ہے اور یہ سراسر جھوٹ اور دھوکہ ہے۔ تم صرف کچھ دیر کے لئے اپنے آدمیوں کو ہمارے حوالے کردو بے شک حق اپنی منزل پر پہنچ گیا ہے اور ظالموں کا شیرازہ بکھرنے اور ان کی کمر ٹوٹنے میں کچھ باقی نہیں رہ گیا۔''

لوگوں نے آپ کا جواب اس طرح دیا کہ بیس ہزار سپاہی آپ کے اوپر تلواریں کھینچ کر آپ سے مطالبہ کرنے لگے کہ ''تم اس قوم کا جواب دو ورنہ تمہیں قتل کر دیا جائے گا بالکل اس طرح جیسا کہ عثمان کو قتل کیا گیا تھا۔ خدا کی قسم اگر تم نے ہمارا مطالبہ منظور نہ کیا تو ہم ہر صورت میں یہ کام کر دکھائیں گے۔''

اس جیسی کئی احادیث وروایات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب امیرؑ کے لشکر کی اکثریت نے آپ سے وہی موقف اختیار کیا تھا جسے اشعث اور اس کے دوستوں نے اپنایا ہوا تھا۔۔۔ آپ کی اطاعت صرف بنی ہاشم کی ایک مختصر و محدود سی تعداد کر رہی تھی اس بات کی تصریح خود اس جواب سے ہوجاتی ہے جو آپ نے خوارج کو دیا تھا جب انہوں نے عبداللہ بن عباس سے کہا تھا کہ ہم نے صفین کے دن علیؑ کو چھوڑ دیا تھا اور انہیں اپنی تلوار کا نشانہ نہ بنایا تھا۔

چنانچہ امامؑ نے اس جواب کے ضمن میں فرمایا تھا جیسا کہ اسے تاریخ یعقوبی نقل کرتی ہے کہ '

"اس دن تم کثیر تعداد میں تھے جب کہ ہم اور ہمارے اہل بیت محدود تعداد میں تھے۔"

خلیفہ المسلمین کے سامنے اس وقت دو ہی باتیں تھیں ایک یہ کہ جنگ جاری رکھتے جس کا مطلب یہ تھا کہ شام کے لشکر کے علاوہ اپنے تین چوتھائی لشکر سے آپؑ کو جنگ کرنا پڑتی اوراس کا وہی نتیجہ نکلتا جسے ابن عاص چاہتا تھا کہ آپ کی جان جاتی اور آپ کے وفادار مخلص اور آزمائے ہوئے صحابہ کرامؓ بھی کام میں آجاتے یا یہ کہ آپ تحکیم کو قبول کرلیتے جس میں نسبتاً نقصان کم تھا چنانچہ آپ نے تحکیم کو قبول کرلیا حالانکہ ابن عاص اور معاویہ یہ چاہتے تھے کہ آپ اس جنگ کو جاری رکھیں جس میں آپ اور آپ کے بچوں عزیزوں اور نمایاں صحابہ کرامؓ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ زیادہ تھا لہٰذا تحکیم کا مسئلہ ایک ایسے وقت سامنے آیا جب مولائے متقیان کے پاس اسے قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ راوی حضرات بہت کثرت سے فریقین کے درمیان ہونے والے بحث و مباحثہ اور ردو کد کو نقل کرتے ہیں یہ بحث و مباحثہ ایک حقیقت کا آئینہ دار ہے اور وہ یہ کہ اس سب سے فائدہ معاویہ نے اٹھایا اور اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنایا۔

طرفین کے درمیان تحکیم پر اتفاق عمل میں آگیا اور شام کے لوگوں نے اپنی طرف سے بغیر کسی اختلاف کے ابن عاص کو نمائندہ کی حیثیت سے منتخب کرلیا۔ جہاں تک اہل عراق کا تعلق ہے تو ان کے درمیان نمائندے کی تقرری میں شدید اختلاف رہا۔ ابوموسیٰ اشعری کسی بھی لحاظ سے جناب امیر علیہ السلام کے لئے قابل قبول نہ تھا وہ نہ صرف آپ سے باغی تھا بلکہ اس طویل معرکہ آرائی میں آپ کے ساتھ شریک نہ تھا۔ آپ نے تین صحابہ کرام میں سے ایک کو نمائندہ بنانے کے لئے کہا تھا تاہم جن لوگوں نے بھی تحکیم کا نعرہ لگایا تھا ان کا پرزور مطالبہ تھا کہ ابو موسیٰ اشعری کو نمائندہ بنایا جائے حالانکہ ابو موسیٰ

منافقت میں کسی صورت ابن عاص سے کم نہ تھا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عراق سے آئے ہوئے لشکر کی ایک کثیر تعداد اس سازش میں پہلے سے شریک تھی۔

ابو موسیٰ اشعری ایک صحیح کردار کا حامل شخص نہ تھا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ وہ حضرت عثمان کے زمانہ میں بصرہ اور بعد میں کوفہ کا گورنر رہا۔ امیرالمومنینؑ جب خلیفہ بنے تو آپ نے اسے کوفہ کی گورنری سے معزول کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ آپ سے نفرت کا اظہار بھی کرتا تھا اور آپ کے بارے میں غلط باتیں بھی کرتا تھا۔

نہج البلاغہ کی شرح میں مرقوم ہے کہ صلح کی قرارداد لکھی جا رہی تھی۔ دستاویز پر لکھا گیا کہ مندرجہ ذیل نکات پر امیر المومنین علیؑ اور معاویہ بن ابی سفیان اتفاق کرتے ہیں۔ معاویہ نے کہا کہ اگر وہ حضرت علی کو امیر المومنین تسلیم کرنے کے بعد بھی ان سے جنگ کرے تو وہ بدترین شخص ہو گا۔ چنانچہ ابن عاص نے جناب امیر علیہ السلام سے کہا کہ وہ اپنا نام بمعہ ولدیت کے سپرد قلم کریں۔ عراقیوں کا اصرار تھا کہ امیر المومنین کا لقب دستاویز میں باقی رہے لیکن شام کے لوگ کہتے تھے کہ وہ عراقیوں کے امیر ہوں گے شام کے لوگوں کے نہیں ہیں۔

آپ نے احنف بن قیس سے امیر المومنین کا لفظ مٹانے کے لئے کہا اور اس نے تامل کیا تو آپ نے فرمایا کہ'

"آج کا دن صلح حدیبیہ سے کتنا مشابہ ہے۔ جب صلحنامہ لکھے جانے کے وقت سہیل نے رسول اللہ کے لفظ پر اعتراض کیا تھا اور جناب رسالت مآبؐ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اے علی میں اللہ تعالیٰ کا رسول محمد بن عبداللہ ہوں اگر میں صرف اپنا نام رقم کروں تو اس سے رسالت میرے وجود سے الگ نہ ہوگی چنانچہ تم اسے مٹا کر نام لکھ دو ایسا واقعہ تمہارے ساتھ بھی پیش آئے گا جبکہ تم ایسا کرنے پر مجبور ہوگے۔"

تحکیم کے صلحنامہ کی دستاویز مرتب کرلی گئی اور طرفین کی جانب سے دس

دس سرکردہ افراد نے اس پر اپنے دستخط بھی کر دیئے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس میں طے پایا کہ سب اللہ تعالیٰ کے احکامات کے پابند رہیں گے اور اختلافی مسائل میں خدا کی کتاب کی طرف رجوع کریں گے۔ جس چیز کا حل قرآن کریم سے حاصل نہ کر پائیں گے اسے سنت رسولؐ میں تلاش کریں گے۔ نیز حضرت علیؑ و معاویہ اور ان کے حامی حکمین کے فیصلہ کے پابند رہیں گے۔ حکمین امت مسلمہ کے درمیان صلح برقرار کریں گے اور اسے فرقہ واریت یا انتشار کا شکار نہ ہونے دیں گے۔ حکمین شام و حجاز کے درمیان کہیں بھی ملاقات کا ایک دور کریں گے ان کی اس ملاقات میں کسی اور کو شریک ہونے کی اجازت نہ ہوگی بجز ان افراد کے جنہیں وہ مناسب سمجھیں۔ وہ ایسی جگہ کا انتخاب کریں گے جو ملاقات کے وقت اور اس کے بعد بھی پر امن رہے۔

یہاں تک تو روایات میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تاہم صلحنامہ کی چند اور معمولی چیزوں پر اختلاف ہے۔ البتہ کسی بھی روایت سے کوئی ایسی چیز موصول نہیں ہوئی جو پوری وضاحت کے ساتھ طرفین کے درمیان جاری اس تنازعہ کے اصلی اسباب یا موضوعات کی طرف توجہ دلائے حالانکہ جناب امیرؑ اور معاویہ کے درمیان اس درگیری کے اسباب تمام لوگوں کے لئے نمایاں تھے اور ان میں کسی قسم کا بھی اختلاف یا غلط فہمی موجود نہ تھی۔ جنگ جمل سے پہلے معاویہ حضرت عثمان کے قاتلوں کے محاکمہ یا انہیں اس کی تحویل میں دینے کی بات کرتا تھا تاکہ اس کے بقول وہ ان سے انتقام لے سکے بعدازاں اس کے موقف میں کافی شدت آگئی تھی اور وہ خلافت کو دوبارہ سے شوریٰ کے حوالے کرنے کی بات کرتا تھا تاکہ وہ اوراس کے حامی خلافت کے فیصلہ میں دخیل ہوں۔

امام عالی مقام نے اس کے پہلے مطالبہ کا یہ جواب دیا تھا کہ پہلے وہ تمام مسلمانوں کے زمرے میں داخل ہو جائے پھر اسے اس بات کا حق دیا جائے گا کہ وہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے حضرت عثمان کے قاتلوں سے قصاص کر سکے۔ جناب امیر علیہ السلام نے اس کے دوسرے مطالبہ کے جواب میں فرمایا تھا کہ مکہ ومدینہ (حرمین) کے جن لوگوں نے پہلے تین خلفاء کو منتخب کیا تھا

انہوں نے پورے اتحاد و اتفاق کے ساتھ آپ کو خلیفہ بنایا تھا مزید یہ کہ آپ کی خلافت میں تو بجز شام کے تمام شہروں کے لوگ شریک تھے حالانکہ گذشتہ دستور کے مطابق صرف مہاجر و انصار کی شہادت ہی حاضر و غائب تمام لوگوں کے لئے کافی ہوتی تھی۔ تین یا چار افراد کے علاوہ کہ جنہوں نے نہ بیعت کی نہ مخالفانہ طرز عمل اپنایا' تمام لوگوں نے آپ کی خلافت کو تہہ دل سے قبول کیا تھا چنانچہ یہ شام کے لوگوں کا فرض تھا کہ اسی زمرے میں داخل ہوجاتے جس میں تمام مسلمان آچکے تھے ورنہ اسلام و قرآن کے مطابق وہ باغی تھے اور ان سے اس وقت تک جنگ کرنا ضروری تھا جب تک کہ وہ خدا کے حکم کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرلیتے (جیسا کہ آیۂ مبارکہ میں بیان کیا جاچکا ہے)۔

چنانچہ ان حالات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ اس تنازعہ کے اسباب کا صحیح سے جائزہ لیا جائے' انہیں مرتب کیا جائے قلم بند کیا جائے اور پھر ان کا ٹھوس اور بنیادی حل تلاش کیا جائے۔ اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ صلحنامہ کے متن اور حکمین کے مذاکرات میں اس اہم اور بنیادی چیز کی طرف توجہ نہ کی گئی جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

کچھ روایات میں یہ عندایہ ملتا ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام کو خلافت سے برطرف کرنا طرفین کے درمیان پہلے سے طے پاچکا تھا۔ اختلاف صرف اس بات پر تھا کہ آپ کی جگہ کس کو لایا جائے۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابوموسیٰ اشعری نے عبداللہ بن عمر کو اپنی طرف سے خلیفہ بنانے کی تجویز پیش کی تو ابن عاص نے کہا کہ حضرت عثمان کو مظلومیت کے ساتھ مارا گیا تھا اور معاویہ ان کا جانشین ہے اس نے قرآن کریم کی یہ آیۂ مبارکہ تلاوت کی کہ'

" ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیه سلطانا "

اور جو مظلومانہ طور پر قتل کردیا گیا ہم نے اس کے ولی کے لئے "سلطان" (تسلط و حیثیت) قرار دیا۔

حالانکہ ابن عاص جانتا تھا کہ آیۂ شریفہ میں جس ولی کا ذکر کیا گیا ہے اس

سے مراد حقیقی وارث ہے اگر وارث نہ ہو تو خلیفہ المسلمین اس کا ولی ہے اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان دنوں جناب امیرؑ خلیفہ اور قانونی حاکم تھے اس کے باوجود ابوموسیٰ نے ابن عاص کے اس استدلال پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ ابن عاص اسے معاویہ کو خلیفہ کی حیثیت سے قبول کرنے کے لئے کہتا رہا اور اقتدار کی لالچ دیتا رہا۔ بہرحال ایک طویل گفتگو کے بعد ابن عاص ابوموسیٰ کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہوگیا ابن عاص نے پہلے اپنی موافقت کا اظہار کیا کہ حضرت علیؑ و معاویہ دونوں کو خلافت سے ہٹا کر کرسی خلافت کو مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے لیکن جب ابوموسیٰ حضرت امیرؑ کو خلافت سے برطرف کرچکا اور ابن عاص کی باری آئی تو اس نے معاویہ کی خلیفہ کی حیثیت سے تائید کی۔ مورخین کے مطابق تحکیم کا انجام کچھ اسی طرح ہوا۔

ہمارے خیال میں جناب امیرؑ تحکیم کے نتائج سے اور اس سے غافل نہ تھے کہ معاویہ کا موقف غالب آجائے گا۔ مخصوصاً ایک ایسی صورتحال میں جب حکمین میں سے دونوں اشخاص آپ کے بارے میں ایک طرح کے خیالات رکھتے تھے۔ آپ کے بارے میں ابوموسیٰ اشعری کے ارادے ابن عاص سے کچھ کم برے نہ تھے۔ لیکن اس سب کے باوجود جنگ جاری رکھنا زیادہ خطرناک اور نقصان دہ تھا۔ خطرات سے بھرپور ماحول میں معاہدہ ہوجانے کے بعد کچھ لوگوں کا اسے توڑنے پر شدید اصرار اسی سازش کی ایک کڑی تھی آپ نے ان کی بات ماننے سے انکار کیا انہیں نرمی سے سمجھاتے رہے اور امن و سلامتی کے راستہ کو انتخاب کرنے کی باتیں کرتے رہے۔ آپ نے بہت جلد صفین سے عراق واپس کی تیاریاں بھی کیں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملات مزید الجھ جائیں اور پھر آپ کو گرفتار کرلیں۔

روایات صراحت کے ساتھ رقم کرتی ہیں کہ صلح کئے جانے اور اس کی دستاویز مکمل ہونے کے بعد آپ بمشکل دو یا تین دن صفین میں رہے۔ چنانچہ اپنے اصحاب کی تدفین سے فارغ ہوکر ان تمام حادثات اور اس سانحہ کی تلخیاں اور دل میں چھپے ہوئے اس غم و غصہ کو لئے کوفہ کی جانب روانہ ہوگئے کہ جسے برداشت کرنے کی طاقت اور توان صرف آپ ہی میں تھی۔

خوارج

جنگ صفین ایک عظیم کامیابی کے بعد جسے جناب امیر علیہ السلام نے حاصل کیا تھا ایک سازش کا شکار ہوگئی۔ اس سازش کا نتیجہ ابن عاص اور ابوموسیٰ اشعری کے حکم قرار پانے کی صورت میں بر آمد ہوا جو حضرت علیؑ سے بغض رکھنے کے بارے میں خاصے مشہور ہوچکے تھے اگر تحکیم کا نظریہ اور حکمین کا انتخاب انصاف پر مبنی تھا اور آزاد فضا میں انجام پایا تھا جیسا کہ تاریخ اس پر یہ لیبل چڑھانے کی کوشش کرتی ہے تو صرف وہ نتائج کہ جن تک حکمین پہنچے اس فتنہ کو دبانے، عام امور کی اصلاح اور پورے لشکر کے اپنے اس عظیم قائد سے الحاق کے لئے کافی تھے جن کی مدبرانہ سیاست اور سیاسی شعور نے ان خراب حالات اور خطرات سے بھرپور صورتحال کا مقابلہ کیا۔ لیکن ان نتائج کے بعد کہ جنہیں نہ لوگ قبول کرسکتے ہیں، نہ دین مانتا ہے اور نہ ہی عقل و دانش انہیں تسلیم کرسکتی ہے سازشی افراد نے پھر سے فساد پھیلانا شروع کر دیا، فضا کو خراب کرنے کی کوشش کی اور صفین سے واپسی کے بعد ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ ان لوگوں نے تحکیم کو قبول کرنے کے سلسلہ میں اپنی غلطی کا اعتراف

کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اپنے اس فعل پر توبہ کی اور اس کا اظہار بھی کیا۔ یہ لوگ جناب امیر علیہ السلام کے پاس آئے اور آپ سے بھی یہ مطالبہ کرنے لگے کہ آپ تحکیم کے معاہدے کو توڑدیں اور ان کی طرح توبہ کرلیں مزید یہ کہ از سر نو جنگ شروع کرنے کے لئے واپس صفین چلیں۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے یہ ایک ناکام سی کوشش تھی۔ آپ نے ان کی یہ بات ماننے سے انکار کیا اس لئے کہ آپ اس کے غلط عواقب اور منفی نتائج سے بخوبی واقف تھے بہرحال صفین سے واپسی میں کوفہ پہنچنے سے پہلے ہی وہ آپ سے الگ ہوگئے اور "حروراء" نامی مقام پر جمع ہوگئے۔

انہوں نے یہاں اجتماع کیا اور جب جنگ کے لئے خود کو مہیا کرنے لگے تو مولائے متقیان نے ان کے پاس ابن عباس کو بھیجا کہ وہ انہیں جاکر سمجھائیں اور شاید اس طرح یہ لوگ اس غلط اور گمراہ کرنے والے راستہ کو چھوڑ دیں ابن عباس نے ان سے پوچھا کہ کون سی چیز اس بات کا باعث بنی ہے کہ وہ جناب امیرؑ کے دشمن بن بیٹھے ہیں؟

انہوں نے جواب دیا کہ مومنوں کا ایک امیر ضرور تھا لیکن جب اس نے خدا کے دین میں حکم چلایا تو وہ ایمان کے دائرے سے خارج ہوگیا چنانچہ اسے اپنے کفر کا اعتراف کرنے کے بعد توبہ کرلینی چاہئے۔ ابن عباس نے ان سے کہا کہ مومن کو زیب نہیں دیتا کہ اپنے ایمان کو شک سے آلودہ نہ کرنے کے باوجود اپنے کو کافر قرار دے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت علیؑ نے اللہ کے دین میں حکم صادر کیا ہے۔ ابن عباس نے کہا کہ کیا ہوا اللہ تعالیٰ نے شکار کرنے کے سلسلہ میں حکم کرنے کو کہا ہے کہ اور ارشاد فرمایا ہے کہ "تم میں سے دو عادل افراد اس کے بارے میں حکم کرتے ہیں۔"

انہوں نے کہا کہ حضرت علیؑ کے خلاف فیصلہ دیا گیا تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کردیا۔ ابن عباس نے کہا کہ حکومت امانت کی طرح ہے اگر خدا کے حکم کے خلاف فیصلہ دیں تو وہ فاسق ہیں اور ان کا فیصلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

خوارج کے کچھ لوگ کہنے لگے کہ قریش کے ان دلائل سے مرعوب نہ ہوجانا یہ وہی لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بدترین قوم کا خطاب دیا ہے۔

ابن عباس واپس ہوگئے انہوں نے واپس جاکر خوارج سے ہونے والی گفتگو سے آپ کو مطلع کیا آپؑ خود ان لوگوں کے پاس تشریف لے گئے اور صعصعہ بن جوحان عبدی سے کہا کہ وہ ان لوگوں کو بلائے اور بتائے کہ انکا سردار کون ہے اس نے یزیدبن قیس ارحبی کا نام بتایا۔ جب جناب امیرؑ حروراء پہنچے تو آپ نے ایک ایک کرکے خیموں کا جائزہ لیا اور جب یزیدبن قیس کے خیمہ میں جاپہنچے تو وہاں دو رکعت نماز ادا کی پھر خیمہ سے باہر نکل آئے اور لوگوں کی طرف توجہ کرکے فرمایا کہ'

"یہ وہ جگہ ہے جو یہاں کامیاب ہوجائے گا وہ آخرت میں بھی کامیاب و کامران رہے گا۔"

پھر آپؑ نے ان لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ'

"کیا تم کسی ایسے شخص کے بارے میں بتاسکتے ہو جسے میں نے اپنی حکومت کے قبول کرنے پر مجبور کیا ہو؟"

انہوں نے کہا "نہیں"

آپؑ نے فرمایا کہ تم جانتے ہو نہ کہ تم نے مجھ سے اس قدر اصرار کیا کہ مجھے حکومت قبول کرنا پڑی انہوں نے کہا "ہاں" آپؑ نے پوچھا کہ "پھر کیوں میری مخالفت کرتے پھرتے ہو اور مجھے برکنار کرنے کے خواہاں ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم ایک بڑے گناہ کے مرتکب ہوئے تھے بعدازاں ہم نے توبہ بھی کرلی چنانچہ اگر آپ بھی توبہ کرلیں گے تو ہم آپ کے ساتھ ہوجائیں گے۔

مولائے متقیان نے فرمایا کہ وہ ہر گناہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت طلب کرتے ہیں۔

آپؑ کا یہ کہنا تھا کہ انہوں نے آپ کی بات مان لی اور آپ کے ساتھ

کوفہ واپس ہوگئے مورخین نے ان کی تعداد چھ سے دس ہزار تک بتائی ہے کوفہ میں ان لوگوں نے اپنے عزیزوں اور اہل خانہ کے ساتھ مل کر اپنی بساط جمالی تھی۔

کوفہ میں اپنی اقامت کے دوران وہ مشہور کرتے رہے کہ حضرت علیؑ تحکیم سے پلٹ گئے ہیں اور اب ان کی نظر میں تحکیم سراسر غلطی ہے وہ جنگی سازوسامان کے مہیا ہونے کا انتظار کر رہے ہیں تاکہ معاویہ سے دوبارہ جنگ لڑی جائے ایسے میں اشعث اور اس جیسے فتنہ گروں نے زیادہ جوش و خروش دکھایا۔ یہ لوگ ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اہل کوفہ اور جناب امیرؑ کے درمیان معاملات طے ہوجائیں اور تعلقات بحال ہوجائیں اہل کوفہ وہ تیاریاں کریں کہ جناب امیر تحکیم کے معاہدے کو توڑ دیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوجاتا تو تحکیم اور اب تک کئے گئے معاہدے کے مطلوبہ نتائج بر آمد نہ ہوسکتے تھے چنانچہ اشعث آپ کے پاس آیا اور اس وقت جب کہ آپ کوفیوں کے مجمع عام میں تھے آپ سے کہنے لگا کہ '

"لوگ کہتے ہیں کہ آپ تحکیم سے پلٹ گئے ہیں' اسے حق سے انحراف کے مترادف سمجھتے ہیں اور اس پر باقی رہنے کو کفر گردانتے ہیں۔"

وہ آپ سے اسی قسم کی ٹیڑھی ترچھی باتیں کرتا رہا تاکہ ان لوگوں کو الگ کرواسکے جو کوفہ واپسی پر آپ سے الگ ہوگئے تھے۔ شرح نہج البلاغہ میں مرقوم ہے کہ مبرد "الکامل" کی جلد اول میں خیال کرتا ہے کہ امام نے فرمایا کہ۔

"جو یہ گمان کرتا ہے کہ میں تحکیم سے پلٹ گیا ہوں وہ جھوٹ بولتا ہے اور جو اسے گمراہی سمجھتا ہے وہ خود زیادہ گمراہ ہے۔"

ابوالعباس مزید کہتا ہے کہ جب لوگوں کو امام کی یہ باتیں معلوم ہوئیں تو وہ نہروان کے مقام پر چلے گئے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے بغاوت و سرکشی کا اعلان کیا۔

ہمیں تو اشعث اور امام علیہ السلام کے درمیان ہونے والے اس مکالمہ میں

ہی خاصا تردد ہے اور بعید نظر آتا ہے کہ امامؑ اس قسم کی باتیں کریں۔ جو چیز یقینی ہے وہ یہ کہ اشعث کی غلط حرکتوں کی وجہ سے کچھ لوگ آپ سے الگ ہوگئے تھے تاکہ اہل کوفہ کو معاویہ کے خلاف کی جانے والی جنگی تیاریوں سے روکیں۔

نہروان کے راستہ میں خوراج کی ملاقات ایک مسلمان اور ایک نصرانی سے بھی ہوئی انہوں نے مسلمان کا خون کردیا اس لئے کہ وہ مخالف افکار و نظریات کا حامل تھا لیکن نصرانی کا بال بھی بیکانہ کیا۔ راستہ میں ان کی ٹکر عبداللہ بن خباب سے ہوئی جن کے ہمراہ ان کی اہلیہ بھی تھیں عبداللہ بن خباب کے گلے میں قرآن مجید آویزاں تھا انہوں نے عبداللہ سے کہا کہ جو چیز ان کی گردن میں آویزاں ہے وہ ان کے قتل کا حکم دیتی ہے۔ انہوں نے تحکیم کے بارے میں بھی عبداللہ سے سوالات کئے اور جب یقین ہوگیا کہ وہ حضرت امیرؑ کے طرف دار ہیں تو انہیں نہر کے کنارے لے جاکر ذبح کردیا۔ ان کی اہلیہ کا جو حمل کے آخری مراحل میں تھیں پیٹ پھاڑ ڈالا اور پھر انہیں ان کے بچے کے ہمراہ ذبح کردیا۔

جب اس طرح کے کچھ اور جرائم بھی ہوئے اور جناب امیر علیہ السلام کو ان تخریب کاریوں کی اطلاع ملی تو آپ اپنے اصحاب کے ساتھ نہروان کی جانب روانہ ہوئے حالانکہ اس وقت آپ معاویہ کے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف تھے۔ نزدیک پہنچ کر آپ نے ان لوگوں کے پاس کسی کو بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ وہ جلیل القدر صحابی عبداللہ بن خباب کے اور راستہ میں قتل کئے جانے والے بے گناہ مسلمان کے قاتلوں کو ان کے حوالہ کردیں۔

انہوں نے ایک ہوکر جواب دیا کہ وہ سب عبداللہ کے قاتل ہیں اور اگر علی بن ابی طالبؑ تک بھی وہ دسترسی حاصل کرلیں گے تو انہیں بھی قتل کر ڈالیں گے۔ جناب امیرؑ خود ان لوگوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے کئے گئے خطاب میں فرمایا کہ،

اے لوگو میں تمہیں اس سے ڈراتا ہوں کہ اس قوم کی نظروں میں اتنے

گر جاؤ کہ ملعون قرار پاؤ اور تم پر طعن و تشنیع کی بارش ہو۔ تم بغیر کسی ہدف و مقصد کے اپنی اپنی جانوں سے جاؤ گے اور ناحق مارے جاؤ گے۔ کیا نہیں جانتے کہ میں نے تمہیں تحکیم سے سختی سے منع کیا تھا اور تم پر واضح کیا تھا کہ ان لوگوں کا مطالبہ صرف ایک دھوکہ ہے۔ تمہیں اس سے بھی مطلع کیا تھا کہ وہ اہل دین و قرآن نہیں ہیں اور یہ کہ میں تمہیں ان سے زیادہ جانتا ہوں۔ یہ دھوکہ باز اور فریبی لوگ ہیں لیکن تم نے میری ایک نہ سنی اور مجھ پر اتنا دباؤ ڈالا کہ تحکیم کو قبول کرنے پر مجبور کر دیا اور اس پر کہ حکمین کا فرض ہے کہ وہ قرآن کی روح کو زندہ کریں اور جس چیز کو قرآن ختم کر دینے کا حکم دیتا ہے اسے نیست و نابود کر دیں۔ لیکن جب انہوں نے کتاب وسنت کی مخالفت اور ہواو ہوس کی پیروی کی تو ہم نے ان کے فیصلے کو مسترد کر دیا اور اپنی حالت پر بدستور باقی رہے اور اب ہم معاویہ اور اس کے حامیوں سے جنگ کے لئے مستعد ہیں۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ جب ہم نے حکمین کا تقرر کر کے غلطی کی اور کافر ہو گئے تو پھر اللہ تعالیٰ کے حضور معافی مانگی لہٰذا اگر آپ بھی اپنے کفر کا اقرار کر کے توبہ کر لیں گے تو ہم بھی آپ کے ہمنوا بن جائیں گے اور آپ کے لشکر میں شامل ہو جائیں گے لیکن اگر آپ نے انکار کیا تو آپ کو بھی ٹھکرا پھینک دیں گے۔

جناب امیرؑ نے فرمایا کہ

"کیا ایمان لانے، ہجرت کرنے اور آنحضورؐ کے شانہ بشانہ جہاد کرنے کے بعد بھی ہم اپنے کافر ہونے کا اقرار کریں۔ اگر ایسا کر لیں گے تو ہم سے زیادہ کوئی گمراہ نہ ہوگا اور ایسے میں ہم ہدایت یافتہ لوگوں میں نہ ہوں گے، وائے ہو تم لوگوں پر کیوں کر تم نے ہم سے جنگ کو جائز قرار دیا اور کس بنیاد پر ہم سے علیحدگی اختیار کر لی۔"

انہوں نے آپ کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور ہر طرف سے جنت جانے کی چیخ و پکار سنائی دینے لگی چنانچہ فوراً ہی اسلحہ نکال لیا گیا اور تیروں اور نیزوں سے آپ کو استقبالیہ دیا گیا۔

شیر خدا نے بھی اپنے جوہر دکھائے اور صرف چند گھنٹوں میں اللہ تعالیٰ کے

کرم سے ان کا کام تمام کر دیا۔ اس سے پہلے آپ نے اپنے اصحاب کو آگاہ کر دیا تھا کہ ان کے دس سے کم لوگ شہید ہوں گے اور دشمن کے بھی دس سے کم لوگ بھاگنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے کہ آپ کی پیشنگوئی صحیح ثابت ہوئی۔ ان کے آٹھ یا نو افراد فرار کرنے میں کامیاب ہوگئے اور آپ کے نو اصحاب درجہ شہادت پر فائز ہوگئے۔ اس مقام پر مورخین مخدج نامی شخص کے بارے میں بھی لکھتے ہیں۔ جناب رسالتمآبؐ نے جناب امیرؑ سے فرمایا تھا کہ وہ خوارج سے جنگ کریں گے جن میں مخدج نامی شخص مارا جائے گا۔ یہ لوگ اس طرح دین سے باہر نکلیں گے جس طرح تیر کمان سے نکلتا ہے۔"

اس قسم کی روایات کثرت سے موصول ہوئی ہیں جنہیں ابن ابی الحدید صحیح اور متفق علیہ قرار دیتے ہیں۔

"مسند احمد" میں حضرت عائشہ سے موصول ہونے والی روایت کے مطابق مخدج کو بد ترین شخص کہا گیا ہے اور یہ وضاحت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا سب سے نیک اور برگزیدہ بندہ اسے قتل کرے گا۔

تمام تاریخیں پورے اتفاق کے ساتھ لکھتی ہیں کہ جنگ کے بعد جناب امیرؑ نے اسے تلاش کرنے کے لئے کہا اور جب آپ کے اصحاب اسے ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہوئے تو آپ خود میدان کارزار میں اسے ڈھونڈنے لگے۔ اچانک آپ نے تکبیر کہی اور آپ کے اصحاب نے بھی تکبیر کہی۔ بلاشبہ اگر مخدج کے بارے میں جناب رسالتمآبؐ نے کچھ فرمایا نہ ہوتا تو آپ اسے اتنی اہمیت نہ دیتے۔

ہم ان لوگوں کے بارے میں یہیں گفتگو کو خاتمہ دیتے ہیں تاہم مورخین انہیں خوارج کے نام سے یاد کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اسلام میں فرقہ واریت کی ابتداء انہی سے ہوئی۔ نیز انہیں عدل وانصاف کا داعی اور مختلف نظریات و عقائد کا حامل سمجھتے ہیں حالانکہ جس وقت انہوں زبیر و معاویہ جیسے دوسرے باغیوں میں کوئی فرق نہ تھا بلکہ ان کے سامنے تو کوئی خاص مقصد اور

واضح ہدف بھی نہ تھا[۱] ۔ البتہ جہاں تک تحکیم کے بارے میں پائے جانے والے اختلافات کا تعلق ہے تو ہمیں اس کے صحیح ہونے میں خاصا شبہ ہے ہماری نظر میں یہ لوگ صرف سازشی افراد تھے جن کا کام امیر المومنین کے لشکر میں پھوٹ ڈالنا اور اسے معاویہ سے جنگ کرنے سے باز رکھنا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خوارج کے قتل کے بعد آپ کے اصحاب میں سے کئی کے دلوں میں رنجشیں تھیں۔ اس لئے کہ جہنم کی زینت بننے والے یہ لوگ کوفہ و بصرہ کے قبیلے اور خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ مقتولین میں سے کسی ایک عزیز و رشتہ دار کے دل میں آپ کی طرف سے میل آنا ایک عام سی بات تھی للذا جنگ نہروان کے بعد آپکے اصحاب کے درمیان پھوٹ پڑگئی۔ ان کے وہ حوصلے نہ رہے اور اختلافات سامنے آنے لگے آپ انہیں جنگ کرنے کے لئے خروج کا حکم دیتے لیکن کوئی نہ سنتا۔ آپ بار بار مدد طلب کرتے اور خطاب کرتے تو وہ کہتے کہ،

"ہمارے تیر ختم ہوگئے ہیں، کندھے تھک گئے ہیں، سرنیزوں کو صفائی کی ضرورت ہے اور تلواریں ٹوٹ چکی ہیں" چنانچہ آپ ہمیں جنگ کی تیاری کرنے کی مہلت دیں۔ دشمن کے مقابلہ میں ایسا کرنا ہی ہمارے لئے بہتر ہے۔ کچھ عرصہ گزر گیا تو آپ نے انہیں ایک مقام پر جمع ہونے کے لئے کہا تاکہ معاویہ سے مقابلہ کے لئے لشکر ترتیب دیا جاسکے۔

لیکن چند معدود افراد کے علاوہ وہاں کوئی نہ آیا ایک طرف یہ صورتحال تھی اور دوسری طرف اشعث اور لحلیفہ بن ربعی جیسے لوگوں کا کام تخریب کاری اور لوگوں کو شکست خوردگی کا احساس دلانا تھا۔ وہ لوگوں سے یہ کہتے پھرتے کہ علیؑ کو اہل نہروان کے ساتھ وہی کچھ کرنا چاہئے تھا جو عثمان نے اپنے مخالفین سے کیا تھا۔ اس طرح یہ لوگ عام لوگوں کے دل و دماغ میں حضرت علیؑ کی دشمنی کے بیج بوتے اور خاندانی جذبات کو ابھارنے کی پوری کوشش

---

[۱] ہمیں مصنف کے اعتراض میں خاصا تردد ہے وضاحت کے لئے نہج البلاغہ میں موجود مولائے کائنات کے کلمات کی طرف رجوع کریں۔

کرتے۔

عبدالکریم بن خطیب اپنی مشہور عالم کتاب ''علی بن ابیطالب'' میں لکھتے ہیں کہ ایک دن جناب امیرؑ نے اپنے اصحاب سے خطاب کیا' انہیں جنگ جاری رکھنے کی ترغیب دی اور جنگ کے بارے میں سرد مہری دکھانے پر ان کی تنبیہہ بھی کی۔ ابھی آپ کی تقریر ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اشعث کھڑا ہوگیا اور جواب دینے کی غرض سے کہنے لگا کہ آپ حضرت عثمانؓ کے طرز عمل کو کیوں نہیں اپناتے ؟

آپ نے اس پوچھا کہ عثمان کا کیا طریقہ کار تھا۔ اس نے کہا کہ انہوں نے طاقت کے بل بوتے اور تلوار کی نوک پر اپنے مخالفین کو دبانے سے گریز کیا یہاں تک کہ خود اسے مار دیا گیا۔

آپ نے فرمایا کہ تجھ پروائے ہو جو عثمان نے کیا ہے وہ مجھے کرنے کے مشورے دیتا ہے۔ میں تیری باتوں کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں معبود کی قسم عثمان کا طرز عمل درحقیقت ایک ایسے شخص کی شکست تھی جس کا نہ کوئی دین ہو۔ اور نہ اس کے پاس واضح ہدایت اور روشن دلیل ہو۔ پس میں کیوں ایسا کروں جب کہ اپنے پروردگار کی ہدایت اور دلیل سے برخوردار ہوں اور حق میرے ساتھ ہے آپؑ نے مزید فرمایا کہ'

''اے اشعث ! تم جس حال میں ہو اسی پر باقی رہو البتہ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں اپنے سر کو تلواروں کی زد میں دیتا رہوں گا اور اپنے ہاتھوں اور کلائیوں کو متحرک و سرگرداں رکھوں گا اس کے بعد خداوند عالم جو چاہے گا انجام دے گا۔''

اشعث کی باتیں تیزی سے لوگوں کے درمیان پھیل گئیں۔ اس سے ان کے خوف و ہراس اور واہمہ میں اضافہ ہوا۔ معاویہ کو عراق کے سرکردہ لوگوں سے قریبی تعلقات استوار کرنے کا موقعہ ملا۔ چنانچہ اس نے ان سے خط و کتابت کی۔ انہیں وعدے دیئے اور ساتھ ہی بہت سے تحفے تحائف ارسال کرکے ان کی امنگوں کو نقد و باعجلت پورا کردیا جس کی خاطر انسان آخرت میں دیئے گئے

وعدوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس نے ان کے ضمیر خرید لئے انہیں ان کے امام سے منحرف کر کے اپنا مطیع و فرمانبردار بنالیا اور ان کے دلوں کو ذلت و خواری کا عادی کر دیا۔

خلاصہ کلام یہ کہ عراق کا سازشی ٹولہ معاویہ کی چالوں کو عملی جامہ پہنانے اور جناب امیر علیہ السلام کی تحریک کو مضمحل کرنے میں کامیاب رہا۔ انہوں نے آپ کے لئے مشکلات و مسائل کا وہ سلسلہ کھڑا کیا کہ آپ کو معاویہ سے دوسری جنگ لڑنے کی فرصت نہ ملی۔ ابھی نہروان کی جنگ ختم نہ ہوئی تھی کہ عراق کے زیادہ تر علاقوں میں آپ کی مخالفت اور شکست کے آثار دکھائی دینے لگے۔ جنگ نہروان ہی نے عراق کے قبیلوں کے دلوں میں وہ کاری زخم لگایا تھا جسے وہ آسانی سے بھلا نہ سکتے تھے خاص طور پر ایک ایسے وقت میں جب کہ معاویہ کے ایجنٹ مال و دولت سے ان کے منہ بند کر رہے تھے۔

ایک شخص سو یا دو سو آدمیوں کو لیکر بغاوت کا علم بلند کرتا اور خلیفہ المسلمین کو اپنے کسی صحابی کی سرکردگی میں ایک دستہ بھیجنے پر مجبور کر دیتا۔ ابھی وہ کوفہ واپس نہ پہنچ پاتے تھے کہ ایک اور جگہ سے بغاوت سراٹھاتی تھی۔

یہ صورتحال جاری رہی یہاں تک کہ خریت بن راشد نے خروج کیا۔ خروج کرنے سے پہلے وہ آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ'

"واللہ میں آپ کی اطاعت نہ کروں گا' آپ کے پیچھے نماز نہ پڑھوں گا اس لئے کہ آپ لوگوں پر اپنی حکومت جماتے ہیں حالانکہ حق سے منحرف ہو چکے ہیں۔"

آپ نے فرمایا کہ اگر ایسا کرو گے تو اپنے پروردگار کی نافرمانی کرو گے' عہد شکنی کرو گے اور اپنا برا کرو گے۔

آپ نے اس سے آئندہ مزید گفتگو کے لئے بھی کہا جسے اس نے بظاہر قبول کر لیا۔ ساتھ ہی اسے تاکید کر دی کہ وہ کسی کو نقصان نہ پہنچائے اور نہ ہی کسی کی عزت و ناموس یا جان و مال پر ہاتھ اٹھائے وہ چلا گیا اور واپس نہ آیا۔ اس

کی قوم بنی ناجیہ اس کی مطیع و فرمانبردار تھی چنانچہ وہ رات کی تاریکی میں اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ نکل کھڑا ہوا۔ راستہ میں اسے ایک مسلمان اور ایک یہودی ملا۔ اس نے مسلمان کو مار دیا اور یہودی کو آزاد چھوڑ دیا۔ یہودی نے سواد میں جناب امیرؑ کے گورنر کو اس روداد سے آگاہ کیا تو اس نے جناب امیرؑ کو لکھا اور آپؑ نے اپنے اصحاب کو ان لوگوں کا حساب صاف کرنے کے لئے بھیجا انہوں نے خریت سے مذاکرات بھی کئے اور قاتلوں کو ان کے حوالہ کرنے کے لئے کہا۔ انہوں نے انکار کیا جس کے نتیجہ میں وہ خونی جنگ ہوئی کہ جناب امیرؑ کو مزید رسد بھیجنی پڑی۔ خریت ایک طرف سے تو حضرت عثمان کے انتقام کا نعرہ لگاتا تھا اور دوسری طرف سے تحکیم کے مسئلہ میں جناب امیرؑ پر اعتراض کرتا تھا آخر کار وہ واصل جہنم ہوا اور اس کے پانچ سو آدمی اسیر ہوگئے ان جنگی قیدیوں کو واپس کوفہ لے جایا جا رہا تھا کہ گزر مصقلہ بن ہبیرہ شیبانی سے ہوا جو کچھ مقامات پر آپ کا نمائندہ تھا۔ جنگی قیدیوں نے اس سے داد و فریاد کی۔ روایات میں ہے کہ اس کا دل پسیج گیا اور اس نے ان سب کو لشکر کے امیر سے خرید لیا تاکہ ان کی قیمتوں کو محفوظ کر کے انہیں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ وہ اس خطیر رقم کی ادائیگی کو ٹالتا رہا اور جب عبداللہ بن عباس نے مطالبہ کیا تو کہنے لگا کہ اگر میں عثمان سے یہ یا اس سے زیادہ رقم بھی مانگتا تو وہ دیدیتے آخر کار وہ معاویہ کی طرف چلا گیا۔ معاویہ نے کھلے دل کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اس کی تمام خواہشات کو پورا کیا۔

چنانچہ اس قسم کی بغاوتیں جگہ جگہ سے سر اٹھانے لگیں اور قدم قدم پر سازشوں کے جال بچھائے جانے لگے۔ جیسا کہ روایات میں ظاہر کیا گیا ہے کہ مصقلہ بن ہبیرہ شیبانی کی مدد انسانی ہمدردی کی خاطر تھی۔ ایسا ہرگز نہ تھا بلکہ اس کا مقصد کچھ لوگوں کے مفادات کی پاسداری کرنا تھا اور معاویہ اس سے یہی کچھ چاہتا تھا جب خبر آئی کہ مصقلہ معاویہ کے پاس فرار کر گیا ہے تو جناب امیرؑ نے یہی فرمایا کہ۔

"ہمیں اس سے کیا کام وہ آزاد مردوں کی طرح کام کرتا تھا لیکن بزدلوں کی طرح فرار کر گیا۔"

عراق کے اندرونی حالات اتنے تباہ ہوگئے تھے کہ معاویہ کو اس کا بھرپور موقع ملا کہ شام کی سرحد سے ملتے جلتے علاقوں، قصبوں اور دیہات پر دھاوا بولے اور بغیر کسی مزاحمت کے قتل و غارتگری کا بازار گرم کرے ایسے میں جناب امیرؑ چیختے رہتے تھے اور ان تجاوزگروں کا حساب صاف کرنے کے لئے اہل عراق سے مدد مانگتے تھے لیکن کوئی آپ کی اس دعوت کا مثبت انداز میں جواب نہ دیتا تھا۔

معاویہ کی فوجوں نے بسر بن ارطاۃ کی قیادت میں یمن اور حجاز پر بھی چڑھائی کی۔ معاویہ نے اسے لوگوں میں رعب و وحشت پھیلانے کے ہر ممکنہ طریقہ کو آزمانے کے لئے کہا تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور راستہ میں بھی عزت و ناموس لوٹنے اور مال و دولت سمیٹنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مدینہ پہنچ کر اس نے وحشت و بربریت کے ساتھ ایک جنگ لڑی اور وہاں کی ایک کثیر تعداد کو قتل کر ڈالا اور باقی کو معاویہ کی بیعت پر مجبور کردیا۔ اس المناک حادثہ کی خبر جب یمن پہنچی تو وہاں ایک خاص قسم کا خوف و ہراس پھیل گیا اور جناب امیرؑ کے گورنر عبیداللہ بن عباس وہاں سے فرار کرگئے۔

اس نے وہاں پہنچتے ہی تخریب کاری، قتل اورلوٹ مار میں حد کردی اور جب عبیداللہ بن عباس کے دو معصوم بچوں پر دسترسی حاصل کی تو انہیں ان کی ماں کے سامنے ذبح کردیا چنانچہ صدمہ سے ماں کی عقل جاتی رہی اور وہ ان پر روتی پیٹتی رہیں یہاں تک کہ خود بھی ان سے جاملیں۔

معاویہ نے مصر پر قبضہ جمانے کے لئے ایک اور لشکر تیار کیا تاکہ ابن عاص کی دلی تمنا پوری کرے۔ اس نے اس لشکر کی قیادت بھی اسی کے سپرد کی۔ جب جناب امیر علیہ السلام کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے عراقیوں سے مصر میں موجود بھائیوں کے لئے مدد چاہی لیکن انہوں نے آپ کی آواز پر کان نہ دھرے۔ جب آپ نے مزید اصرار کیا تو کچھ لوگ مہیا ہوئے ابھی وہ تیاریوں ہی میں مصروف تھے کہ خبر ملی کہ ابن عاص مصر پر قابض ہوگیا ہے اور اس نے جناب امیرؑ کے والی محمد بن ابی بکر کو قتل کرکے انکا مثلہ کیا ہے اور پھر جلا کر

خاک کر ڈالا ہے۔

جناب امیرؑ نے مالک بن حرث اشتر کو طلب کیا اور انہیں اپنی طرف سے والی مصر منصوب کیا تاکہ مصر کے لوگوں کو ان غارتگروں سے نجات دلائیں۔ مورخین لکھتے ہیں کہ مالک اشتر بہت ہی مضبوط، طاقتور اور پرخلوص انسان تھے۔ وہ جناب امیرؑ کے لئے وہی مقام و منزلت رکھتے تھے جو جناب امیرؑ کو بارگاہ رسالت میں حاصل تھی۔ اس حقیقت کا اظہار خود مولائے متقیان نے بھی فرمایا ہے۔

اس خبر کا سننا تھا کہ خوف و ہراس اور تحیر و اضطراب معاویہ اور اس کی فوجوں پر چھا گیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے اس مشکل کا حل تلاش کیا اور اپنے حامیوں میں سے ایک ایسے شخص کو خطیر رقم کے بدلہ میں مالک کی جان لینے پر تیار کیا جس کا گھر مالک کی گزر گاہ یا راستہ میں واقع تھا۔ چنانچہ جب مالک وہاں پہنچے تو اس نے زہر ڈالا ہوا شہد مالک کے سامنے پیش کیا۔ وہیں مالک کا کام تمام ہوگیا اور معاویہ ان چالوں کے ذریعہ اپنے دشمنوں سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ اسی طریقہ کار کو آزماتے ہوئے اس نے اپنے خالہ زاد محمد بن ابی حذیفہ عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید، سعد بن ابی وقاص اور امام حسن مجتبیٰ کو اپنے راستہ سے صاف کیا تھا۔ وہ اپنی اس سیاست پر افتخار بھی کرتا اور کہتا کہ،

بے شک اللہ تعالیٰ کے پاس شہد کا ایک لشکر ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لیتا ہے۔

عراق میں یکے بعد دیگر سانحے اور حادثات رونما ہوتے رہے جس سے حضرت امیرؑ کی حکومت کمزور ہوگئی۔ آپ ایک سرکشی کو دبا نہیں پاتے تھے کہ دوسری سر اٹھالیتی تھی۔ ایک سانحہ سے فارغ نہ ہوتے تھے کہ دوسرا شروع ہوجاتا تھا۔ یہ سلسلہ اس حد تک آگے بڑھا کہ معاویہ آپ کے بارے میں گستاخ اور جری ہوگیا۔ ایک طرف یہ حالت تھی اور دوسری طرف باوجودیکہ عراق کے گرد و نواح میں قتل و غارتگری ہورہی تھی، لیکن عراق کے لوگ

آپ کی مخالفت کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ نیز خود ان کے درمیان بھی اختلاف اور کشمکش جاری تھی۔ مولائے متقیان جب انہیں کسی چیز سے نفرت دلاتے تو وہ نفرت نہ کرتے اور جب کسی چیز کو انجام دینے کا حکم دیتے تو حکم عدولی کرتے۔ وہ واہیات توجیہیں تراشتے اور فضول بہانے بناتے کہ ابھی بہت سردی ہے اور ابھی شدت کی گرمی ہے۔ نہ حق پرستی کے لئے انہیں غصہ آتا تھا' نہ دین کا درد ان کے دلوں میں موجود تھا اور نہ انہیں مظلوم و ستم رسیدہ لوگوں سے ہمدردی تھی۔ یہ بات اتنی آگے بڑھی کہ امامؑ ان سے عاجز آگئے اور شہادت و موت کے ذریعہ سے ایسے نامردوں کی جدائی کی تمنا کرنے لگے۔ کبھی کبھار اپنے دوستوں کے سامنے آپ پر رقت چھاجاتی اور آپ اپنے سر اور محاسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے کہ'

کب اس قوم کا شقی ترین شخص اٹھ کھڑا ہوگا اور اسے خون سے رنگین کرے گا۔

آپ یہ بھی فرماتے کہ اے کاش معاویہ آپ کے دس آدمی لے کر شام کا ایک شخص دے دیتا آخر کار آپ نے اپنے قریبی دوستوں' عزیزوں اور ان مخلص پیروکاروں کے ساتھ مل کر ہی معاویہ کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا جو ابھی تک آپ کے پرچم تلے تھے تاکہ آپ معاویہ کے خلاف جنگ کرتے ہوئے حق و عدالت کے راستہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کردیں اور خالق حقیقی سے جاملیں۔

اس مرتبہ آپ نے بہت ہی سخت لہجہ میں ان سے خطاب کیا اور انہیں تمام ذلت و خواری کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

بلاذری انساب الاشراف میں لکھتا ہے کہ آپ نے ان سے فرمایا کہ'

میں تمہاری سرزنش کرکر کے اور تم سے بول بول کے عاجز آگیا ہوں۔ تم میرے لئے واضح کرو کہ کیا کرنا چاہتے ہو (کیا ارادے رکھتے ہو)۔ اگر تم میرے دشمنوں کا حساب صاف کرنے میرے ساتھ چلو گے تو یہ وہی چیز ہے جسے میں چاہتا ہوں اور اگر تم ایسا نہیں کرسکتے تو اپنی صورتحال کو مجھ پر واضح

کرو۔ خدا کی قسم اگر تم سب کے سب مل کر دشمن سے جنگ کے لئے میرے ساتھ نہ چلو گے تاکہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور اس کے درمیان فیصلہ کرے اور بے شک وہ بہترین فیصلہ کرنے والوں میں سے ہے تو میں تم پر نفرین بھیجوں گا اور خود کو تمہارے دشمن کے سامنے ایک قیدی کی حیثیت سے پیش کردوں گا۔ اگر میرے ساتھ دس (لڑنے والے) بھی نہ ہوئے۔ آپؑ نے یہ بھی فرمایا کہ شام کے لوگ باطل کی پشت پناہی میں زیادہ صابر و بردبار ہیں اور باطل پر ان کا اتحاد و یکجہتی بھی زیادہ مستحکم ہے بہ نسبت تمہارے ارادوں کے باوجودیکہ تم حق پر ہو۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے اور کونسی بیماری لگ گئی ہے۔ !!!۔

روایات کے مطابق جناب امیرؑ کے اس پرصلابت انداز کا دلوں میں خاصا اثر ہوا اس لئے کہ عراق کے لوگوں کو یقین ہوگیا تھا کہ آپ خود اپنے خاندان والوں اور مخصوص لوگوں کو لے کر معاویہ سے جنگ کے لئے نکل کھڑے ہوں گے۔ اور اگر عراق کے لوگ اس حالت میں آپ کو جانے دیں گے تو ذلت و خواری ان کا مقدر بن جائے گی اور اس قسم کا واقعہ مثال کی حیثیت سے لوگوں کے زبان زد ہوجائے گا۔ چنانچہ عراق کے عمائدین اور قبائل کے سرداروں نے آپ کی اس دعوت عام کا مثبت جواب دیا اور اپنی اپنی قوم کے لوگوں کو جنگ کے لئے بلانا شروع کیا۔ یہ مہم اتنی آگے بڑھی کہ جنگ موضوع بحث بن گئی۔ آپ نے مختلف علاقوں کے گورنروں سے بھی اس اہم مقصد کے لئے تعاون چاہا۔ لوگ نخیلہ کے مقام پر لشکر تشکیل دینے کے لئے جمع ہونے لگے اور ماہ مبارک رمضان کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے کہ تقدیر نے آپ کا اور عراق کے لوگوں کا ساتھ نہ دیا اور رمضان کی انیسویں کو صبح کے تڑکے میں سب سے زیادہ ظالم و شقی انسان نے اللہ تعالیٰ کے گھر میں آپ کے سر مبارک پر تلوار سے وار کیا۔ اسی وقت خون کا فوارہ جاری ہوگیا اور آپ نے ندا دی'

فزت ورب الکعبہ

ہولناک سازش

رمضان ۴۰ھ کا مہینہ تھا۔ جناب امیرؑ علیہ السلام پوری جدوجہد کر رہے تھے کہ کسی طرح اپنے اصحاب کو حق کی بالادستی، محروموں اور ستم رسیدہ لوگوں کی حمایت اور ان باغیوں سے جنگ کے لئے تیار کر سکیں جن کا سرکردہ شخص ابوسفیان کا بیٹا معاویہ تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے آپ خاصی تیاریاں کر رہے تھے اور اپنے لشکر کی ٹکڑیوں کو ادھر ادھر بھیجتے تاکہ اس غارتگری کا سدباب کر سکیں جو معاویہ عراق و حجاز و یمن کے گرد و نواح میں کروا رہا تھا۔ اسی وقت آپ نے اپنی تمام طاقت و توانائی صرف کر دی تھی کہ اپنے گورنروں کو سیدھے راستہ پر لائیں تاکہ وہ تمام کاموں کو دیانتداری کے ساتھ انجام دیں۔ اپنے بنیادی واجبات و فرائض میں سستی نہ دکھائیں۔ آپ انہی کاوشوں میں مصروف تھے کہ ایک سازش کے تحت اچانک اللہ تعالٰی کے گھر میں ابن ملجم کی تلوار کی زد میں آکر گر پڑتے ہیں۔

اس سازش کے بارے میں زیادہ تر مورخین کا یہ نظریہ ہے کہ اسے مکہ مکرمہ میں حج کے دنوں میں تیار کیا گیا تھا۔ اس میں عبدالرحمن بن ملجم

مرادی، حجاج بن عبداللہ صریمی، جو برک کے نام سے مشہور تھے اور عمر بن بکر تمیمی نامی تین خوارج شریک تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تیسرا فرد زادویہ نامی غلام تھا۔ یہ لوگ یا تو اتفاقاً" حج کے دنوں میں ایک دوسرے کے قریب آبیٹھے تھے یا یہ کہ انہوں نے پہلے سے یہاں جمع ہونے کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ بہر حال انہوں نے مسلمانوں کی حالت زار کا جائزہ لیا اور ان کے درمیان پائے جانے والے اختلافات، تنازعہ اور فرقہ واریت پر نظر ڈالی اور آخر میں متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ جب تک علی بن ابی طالب، معاویہ بن ابی سفیان اور عمر بن عاص زندہ ہیں امت مسلمہ ان اختلافات اور تفرقہ بازیوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی۔ چنانچہ طے پایا کہ ابن ملجم مرادی جناب امیرؑ کو، حجاج بن عبداللہ معاویہ کو اور تیسرا ابن عاص کو قتل کرے گا۔ انہوں نے رمضان کی سترھویں یا انیسویں کی صبح مقرر کرلی تاکہ یہ کام ایک ہی وقت میں انجام پاسکے۔

تاہم بلاذری انساب الاشراف میں جس روایت کو نقل کرتے ہیں اس کے مطابق ان لوگوں نے ماہ رجب ۴۰ھ عمرہ کے دنوں میں اپنے وعدہ کو پورا کرنے کے لئے کہا تھا۔ روایت میں مزید روشنی نہیں ڈالی گئی لیکن احتمالاً انہوں نے ماہ رجب میں اپنی سازش تیار کی تھی تاکہ رمضان میں اس پر عملدرآمد نے بیس شعبان کو کوفہ میں قدم رکھا تھا، اس بات کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ ان لوگوں نے عمرہ میں یہ پلان تیار کیا تھا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سازش کے پیچھے اشعث بن قیس کندی کا ہاتھ تھا۔ اس کام کو انجام دینے کے بارے میں اس کا ابن ملجم سے معاہدہ ہوگیا تھا اور سازش کا منصوبہ "کندہ" میں تیار کیا گیا تھا۔

اس مقولہ کے طرفدار، ابوالفرج اصفہانی کی اس روایت پر تکیہ کرتے ہیں جسے انہوں نے محمد بن حسین سے نقل کیا ہے۔ ایک مرتبہ اشعث بن قیس جناب امیرؑ کے پاس آیا اور کسی مسئلہ کے بارے میں آپ سے اظہار خیال کرنے لگا آپ نے اس کا جواب سخت لہجہ میں دیا تو اس نے آپ کو موت کی دھمکی دی۔ آپ نے فرمایا کہ،

کیا مجھے موت سے ڈراتا دھمکاتا ہے۔ خدا کی قسم میرے لئے فرق نہیں پڑتا کہ میں موت پر جاپڑوں یا موت مجھ پر آگرے۔

دوسری روایت کے مطابق اشعث بن قیس نے ضربت کی رات مسجد کے کچھ گوشوں میں تنہائی میں ابن ملجم سے ملاقات کی تھی۔ حجر بن عدی ان دونوں کے پاس سے گزرا تو اس نے اشعث کو ابن ملجم سے یہ کہتے سنا کہ'

"اپنی ضرورت کو جلد پورا کر۔ صبح تجھے رسوا کیا چاہتی ہے۔" حجر بن عدی نے اشعث سے کہا کہ "اے کانے تو نے انہیں جان سے مار ڈالا"۔ یہ کہہ کر وہ جناب امیرؑ کی طرف دوڑا لیکن اس وقت تک ابن ملجم اپنا کام دکھا چکا تھا اور محراب میں مولائے متقیان کے سر مبارک پر تلوار سے وار کر چکا تھا۔

ان روایتوں کے علاوہ اس نظریہ کے حامل لوگ اشعث کے اس گستاخانہ طرز عمل کو بنیاد بناتے ہیں جو اس نے مختلف موقعوں پر جناب امیرؑ کے ساتھ اپنایا تھا۔ ہم تحکیم وغیرہ میں اس رویہ کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ معاویہ بن ابی سفیان اور ابن ملجم کی ملی بھگت تھی۔ اس رائے کو فلھوزن' اپنی کتاب "تاریخ الدول العربیہ" میں طبری سے نقل کرتے ہیں۔ کچھ لوگ دلیل کے طور پر ابو اسود دؤلی کے ان اشعار کو نقل کرتے ہیں جو انہوں نے سازش انجام پانے کے بعد معاویہ کو مخاطب کرکے کہے تھے۔

الا ابلغ معاویہ ابن حرب فلا قرت عیون الشامتینا

افی شھر الصیام فجعتمونا بخیر الناس طرا اجمعینا

قتلم خیر من رکب المطایا وذللھا ومن رکب السفینا

ومن لبس النعال ومن حذ اھا ومن قرء المثانی والمبینا

"کیا معاویہ کو یہ بات نہ پہنچاؤں کہ ہم سے شماتت کرنے والوں کی آنکھیں ٹھنڈی نہ ہوئیں کیا ماہ رمضان میں بہترین انسان کو مار کر ہم سب کو غمزدہ نہ

کر دیا۔ تم لوگوں نے اس ہستی کو قتل کر دیا جو سواریوں کے حق میں بھی بہترین انسان تھے اور انہیں رام کر لیتے تھے۔ جو نعلین پہنتے اور خود ہی اسے ٹانکتے تھے۔ اور جو کلام پاک کی آیات کی تلاوت کرتے تھے۔"

دوسرے اور تیسرے بیت میں اس قتل کو براہ راست معاویہ اور اس کی پارٹی سے منسوب کیا گیا ہے اور اگر یہ خوارج کا کیا دھرا ہوتا جیسا کہ ظاہر کیا جاتا ہے تو اس طرح معاویہ سے منسوب کرنے کا کوئی معقول جواز نہ تھا۔

استاد احمد عباس صالح کی کتاب "الیمین والیسار فی الاسلام" سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتلانہ حملہ معاویہ اور اس کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھا۔ وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ آخر کیوں صرف جناب امیرؑ کی بہ نسبت یہ سازش کامیاب رہی لیکن معاویہ اور ابن عاص اس سے مصون و محفوظ رہے۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ اس سازش کو بہت ہی مہارت کے ساتھ تیار کیا گیا تھا اور تمام ہونے والے جرائم سے کہیں زیادہ اس کے لئے منصوبہ بندیاں کی گئیں تھیں اور پوری دقت کے ساتھ اس پر عملدر آمد ہوا تھا۔

آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ یہ سازش اسی وقت بے نقاب ہوگئی تھی۔ لوگ اس کی حقیقت سے واقف ہوگئے تھے یا کم از کم اس کے واقع ہونے کا امکان دیتے تھے بلکہ کچھ نے تو برملا جناب امیرؑ سے اس کا اظہار کیا۔ اس وقت چند خاص اصحاب آپ کے پاس موجود تھے جن میں ابواسود دؤلی بھی تھے۔

بہرحال جس جرم کو ابن ملجم نے کامیابی سے انجام دیا اور اس کے دو دوست ناکام رہے اس کے بارے میں قدیم و جدید عہد کے مورخین و مصنفین انہیں تین احتمالات کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن زیادہ تر مورخین روایات کی چھان بین، اس وقت کے حالات اور جناب امیرؑ کے دور حکومت میں رونما ہونے والے حادثات اور پیدا کئے جانے والے بحران کا جائزہ لئے بغیر پہلے قول کو پسند کرتے ہیں (یعنی یہ خوارج کی سازش تھی)۔

اگر اس سازش کو حج کے موسم میں مکہ مکرمہ ہی میں تیار کیا گیا تھا جیسا کہ زیادہ تر روایات لکھتی ہیں اور اکثر مورخین اسے صحیح مانتے ہیں اور یہ کہ ان تینوں نے شام' عراق اور مصر میں سترہویں یا انیسویں رمضان میں ایک رات اور ایک وقت میں اسے نافذ کرنے کا پروگرام بنایا تھا تو اگرچہ اس نظریہ کے غلط ہونے کے بارے میں ہمارے پاس اور بھی بہت سے شواہد موجود ہیں لیکن اگر کچھ دیر کے لئے ان باتوں کو صحیح بھی تصور کرلیا جائے تو کچھ بعید نہیں کہ یہ ابن عاص' ابن زبیر اور ان جیسے دوسرے لوگوں کی سازش ہو جو خلافت کے حریص تھے۔ جناب امیرؑ' معاویہ اور ابن عاص کو مار کر وہ میدان دوسرے افراد کے لئے خالی کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ تمام راتوں کے برخلاف اس رات ابن عاص گھر سے باہر قدم نہیں نکالتا ہے۔ بے شک وہ بھی خلافت کا بھوکا تھا اور دومتہ الجندل میں ابوموسیٰ سے ہونے والی گفتگو میں اس بات کی کوشش کرچکا تھا کہ خلافت اسے یا اس کے بیٹے عبداللہ کو مل جائے۔ اور ابن عاص سے کچھ بعید نہیں کہ وہ سازش کا رخ اس انداز میں موڑ دے تاکہ کوئی اس پر یا کسی دوسرے پر تہمت نہ لگا سکے۔

میں نہیں سمجھتا کہ تاریخ کے اس نازک دور میں جہاں واقعات کی بھرمار تھی کوئی زبیر کے بیٹے اور ابن عاص کے بارے میں احتمال کو حقیقت سے دور سمجھے۔ لیکن ایک محقق اور اسکالر تاریخ سے نہ اس احتمال کے بارے میں ٹھوس دلائل پیش کرسکتا ہے اور نہ ہی پہلے نظریہ کی حمایت میں جسے زیادہ تر مورخین نے اپنایا ہے۔ اس لئے کہ جس انداز میں اسے نقل کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت سے دور دکھائی دیتا ہے اور اس کے بارے میں بہت سے سوالات ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ اس لئے کہ تین ایسے افراد کا ایام حج میں اتنے اہم اور حساس مسئلہ کے بارے میں اجتماع کرنا جو نہ خوارج کے رہنما تھے اور نہ نمایاں و سرکردہ افراد میں سے تھے اور نہ ہی ایک قبیلہ و خاندان کے لوگ تھے' تعجب سے خالی نہیں۔ کیسے ان میں سے ایک نے دوسرے کو اعتماد میں لے لیا اور کیوں اس کے اجراء کو آئندہ سال رمضان پر ملتوی کردیا گیا۔؟ اسی طرح جیسا کہ استاد احمد عباس لکھتے ہیں کہ کیوں معاویہ اس دن' زرہ پہن کر نماز

پڑھانے کے واسطے نکلا حالانکہ زرہ پوش ہوکر نماز پڑھانا ایک عجیب غیرفطری عمل تھا۔ جو روایات بھی لکھتی ہیں کہ اس پر ضربت پڑی ان میں یہ اتفاق دکھائی دیتا ہے کہ ضرب اتنی ہلکی تھی کہ اس کی کوئی حیثیت نہ تھی حالانکہ کچھ مورخین اس قسم کی روایات کے صحیح ہونے میں شک کرتے ہیں اور کچھ پورے یقین کے ساتھ انہیں بے بنیاد قرار دیتے ہیں۔

اگر تین افراد کی ملی جلی سازش مکہ ہی میں تیار کی گئی تھی توکیوں ابن ملجم نے شبیب بن بجران اور وردان بن خالد سے مدد مانگی اور کیوں اشعث جناب امیرؑ کو موت کی دھمکی دے کر گیا۔ یہ تمام سوالات زیادہ تر مورخین کے اپنائے ہوئے اس نظریہ میں شک و تردد کی دراڑیں ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔

ایسے میں جو بات عقل و منطق کے قرین اور اس وقت کے حالات و واقعات سے قریب دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ جان لینے کے بعد کہ امام علیہ السلام اہل عراق کو لے کر معاویہ پرچڑھائی کررہے ہیں معاویہ نے ابن عاص و اشعث کے ساتھ مل کر کوفہ اور اس سے باہر اس سازش کا جال بچھایا۔ اس لئے کہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس مرتبہ کسی قسم کے اندرونی مسائل اور مشکلات اسے ایسا کرنے سے نہ روک سکیں گے۔

اس روایت سے کہ اشعث نے جناب امیرؑ کو موت کی دھمکی دی تھی' اس نظریہ میں کوئی نقص وارد نہیں ہوتا بلکہ تائید ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح مورخ یعقوبی کی اس نقل کردہ روایت سے بھی کہ ابن ملجم کوفہ میں اشعث کے یہاں ایک مہینہ مقیم رہا اور اس سے بھی کہ ضربت کی رات اشعث نے اس لعین سے کہا تھا کہ'

"اپنی حاجت روا کر قبل اس کے کہ صبح تجھے رسوا کرے۔"

ہم امام عالی مقام کی صفین سے واپسی پر ان اندرونی سازشوں کے تسلسل کا تذکرہ کرچکے ہیں جس کی ابتداء نیزے پر قرآن اٹھوانے سے ہوئی تھی اور اختتام خود مولائے متقیان پر ہونے والے اس کامیاب قاتلانہ حملہ پر ہوا جسے بہت ہی منظم انداز میں ترتیب دیا گیا تھا۔

ابوالفرج اصفہانی کی روایت سے جسے وہ ابی مخنف سے اور وہ عبداللہ بن ازدی سے نقل کرتے ہیں' معلوم ہوتا ہے کہ راوی نے دو مرتبہ تلوار کو چمکتے دیکھا اور اسے اشعث کا وہ مقولہ بھی سنائی دیا جو اس نے ابن ملجم سے کہا تھا۔

ابوالفرج لکھتے ہیں کہ پہلی مرتبہ جو تلوار چمکتے دکھائی دی وہ شبیب بن بجیرہ کا وار تھا جو خالی گیا اور دوسری مرتبہ ابن ملجم کی تلوار چمکی جو امام المتقین کے سر مبارک کے بیچ میں آلگی۔ تلوار کا لگنا تھا کہ لوگوں نے ان دونوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ابن ملجم کو مغیرہ بن نوفل نے پکڑ کر گرایا اور اس سے تلوار چھین لی اور شبیب بن بجیرہ کو ایک شخص نے پکڑ کر گرایا اور اس پر چڑھ بیٹھا تاکہ قتل کر ڈالے۔ اس نے جب دیکھا کہ لوگ چاروں طرف سے چڑھے جا رہے ہیں اور اسے جان سے بھی مار سکتے ہیں تو وہ نیچے سے نکل کر بھاگ گیا اور اپنے چچازاد بھائی کے گھر جا پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہ ابریشم اپنے ہاتھ سے اتار رہا ہے اس نے پوچھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ امیرؑ المومنین کو قتل کر کے آ رہا ہے۔ وہ انکار کرنا چاہتا تھا کہ غلطی سے اقرار کر لیا اور چچازاد بھائی نے اسے قتل کر ڈالا۔ لوگ ابن ملجم پر چڑھ بیٹھے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ میں بھی ان کے مجمع میں چلا گیا۔ ناگاہ مجھے امیر المومنین کی آواز آئی وہ فرما رہے تھے کہ'

اگر میں مر گیا تو نفس نفس کے مقابلہ میں ہے[1]۔ چنانچہ جس طرح اس نے مجھے قتل کیا تھا اس طرح اسے بھی قتل کر دینا اور اگر زندہ بچ گیا تو اس کے بارے میں خود فیصلہ کروں گا۔

ابن ملجم نے کہا کہ میں نے اسے ہزار درہم میں خریدا تھا اور ہزار مرتبہ زہر پلایا تھا اگر پھر بھی مجھ سے وفا نہ کرے تو پھر خدا اسے مجھ سے دور رکھے۔

اس کے بعد اس نے کچھ نہ کہا۔ لوگوں نے ابن ملجم کو گھیرا ہوا تھا وہ چاہتے تھے کہ اسے کچا چبا جائیں اور اس کی بوٹیاں کر دیں۔ رونے پیٹنے اور گریہ

---

[1] قصاص کی آیۂ کریمہ کی طرف اشارہ ہے۔

وشیون کی آوازیں ہر طرف سے آرہی تھیں۔ اہل کوفہ اس عظیم سانحہ سے تحیر و وحشت میں ڈوب گئے تھے اور مبہوت ہوگئے تھے۔ وہ ابن ملجم سے کہتے کہ،

اے دشمن خدا! تونے یہ کیا کیا۔ تونے امت محمدیؐ کو ہلاک کر دیا اور جناب رسالت مآبؐ کے بعد بہترین انسان کو قتل کر ڈالا۔ ابن ملجم خاموش تماشائی بنا بیٹھا تھا۔

کوفہ کے لوگوں نے آپ کے لئے بہترین اطباء کو جمع کیا۔ ان میں اثیر بن عمر بن ھانی طب و جراحت میں سب سے زیادہ ماہر تھا۔ اثیر نے جب مولا کا زخم دیکھا تو غم و غصہ سے اسکا کلیجہ منہ کو آنے لگا اور آواز لرزنے لگی۔ اس نے آپ کے حضور عرض کیا کہ،

اے امیرالمومنین! آپ وصیت کرلیں اس لئے کہ اس لعین کی ضرب آپ کے سرمبارک کی گہرائیوں تک جاپہنچی ہے۔

مولائے متقیان اس کی گفتگو سے بالکل پریشان نہ ہوئے۔ آپ نے اپنے بچوں کو بلوایا۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی رسی مضبوطی سے تھامنے اور اسلام کے احکام یعنی اخلاقی کمالات اپنانے اور غریب و نادار لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی وصیت کی۔

آپ کی وصیت میں ہے کہ،

"تم لوگ فقراء و مساکین کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے بہت ڈرو اور انہیں اپنے معاش میں شامل کرو۔ اپنے غلاموں اور خادموں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنامیں تمہیں تمہارے کمزور غلاموں (خادموں) کے بارے میں بھلائی کی وصیت کرتا ہوں"۔ آپ نے مزید فرمایا "لوگوں سے خوش اسلوبی سے بولو اس لئے کہ جناب رسالت مآبؐ نے جو کچھ وصیت کیا اس کے آخر میں یہ فرمایا تھا کہ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ اور بھلائیوں کا حکم دینے اور برائیوں سے روکنے کے فریضہ کو ترک نہ کرنا ورنہ یہ ذمہ داری کسی اور کے

سپرد کر دی جائے گی اور پھر تم بلاتے رہو گے اور دعوت دیتے رہو گے لیکن کوئی نہ سنے گا۔ تمہیں ہمیشہ متواضع اور سخی ہونا چاہئے اور فرقہ واریت و اختلاف سے پرہیز کرنا چاہئے۔ نیکیوں اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ و دشمنی میں ہرگز ایک دوسرے سے تعاون نہ کرنا۔ یہ اور اس جیسی کئی باتیں جن کے بارے میں جناب رسالتمآبؐ چاہتے تھے کہ لوگ انہیں اپنالیں۔

جناب امیر علیہ السلام اس زخم سے تڑپتے رہے یہاں تک کہ رمضان کی اکیسویں کی رات کو آپ خالق حقیقی سے جاملے۔ آپ حق و حقیقت، عظمت و سربلندی اور عدالت کے شہید تھے۔ آپ نے اپنے پیچھے بہادری، ایثار اور دنیا اور اس میں موجود چیزوں سے بے اعتنائی کی سنہری مثالیں پیش کیں اور قدموں میں پڑی ہوئی دنیا سے خطاب کرکے فرمایا کہ،

اے دنیا جاکسی اور کو دھوکہ دے۔ میں تجھے تین مرتبہ طلاق دے چکا ہوں اب پلٹنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

جس طرح خانہ خدا میں آئے تھے اسی طرح خدا کے گھر سے رخت سفر باندھا اور امام حسن و حسین حضرت زینب سلام اللہ علیہا اور نیک و صالح اولاد اور پاک و طاہر نسل کو معاویہ اور دوسرے دنیا طلب انسانوں کے درمیان چھوڑ گئے۔ انہوں نے آپ کی ذریہ طاہرہ پر وہ مظالم ڈھائے کہ انسانیت کی تاریخ میں اتنے بھیانک اور ہولناک جرم دیکھنے میں نہ آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ مولائے متقیان کے تمام دشمنوں پر جو مرگئے اور جو قید حیات میں ہیں، لعنت بھیجے اور اپنی رحمتوں سے دور کرے۔

جناب سید جعفر مرتضیٰ عاملی سے کئے گئے سوالات
اور ان کے جوابات

بسمه تعالی

سماحة السيد جعفر مرتضى العاملي دام ظله العالي،

السلام عليكم ورحمة الله

اما بعد فنحن نريد انتشار آثار اهل البيت في اللغة الاردوية هذه، انا ترجمة كتاب "سيرة الائمة اثنى عشر" لهاشم معروف الحسني قد في هذه اللغة كما تعرفون وقد واجهنا فيه لبعض المسائل من حيث نظرياته الخاص المؤلف وربما ينظر ويتأمل فيه اهل العلم والتحقيق. وانتم قطعاً من اجله وعندكم عدة كتب في التاريخ والسير فنشير الى لبعض المسائل مع العنوانات ورقم الصفحة وانتم ترشدون الى رأيكم والمصادر الصحيح كما وافقتم.

والسلام دام ظلكم

نسأل الله مزيد التوفيق لكم ونشكركم.

عنوان الكتاب: سيرة الائمة الاثنى عشر لهاشم معروف الحسني

القسم الاول - دار التعارف للمطبوعات

طبعة ٦، ١٤٠٦ هـ.ق.

(١) نريد منكم ان تذكروا عن المؤلف ومقامه العلمي [illegible] في نظر العلماء [illegible]

وقد جاء في صفحة رقم ٢٧١ و ٢٧٢ ان علياً عليه السلام قد ظل مدة بعيداً بيته ستة أشهر وحده بعيداً عن وجهاء الصحابة ولم يحمل الثورة لأن مصلحة الاسلام عنده كان أعز وأعلى وإذا رأى بوادر العصيان والتمرد تنازل عن حقه قائلاً:

"والله لأسالمن ما سلمت أمور المسلمين ....."

هذا صحيح مذكور في نهج البلاغة للسيد الرضي ولكن لم يذكر لعله قولاً آخر

"والله ما كان الحق روحي."

هل هذا مستند أم الشيء ؟ لأن المؤلف لم يذكر المصدر والمأخذ !

تكفي مراجعة شرح النهج لابن أبي الحديد ج، صفحة ... عبد الأمير المطلبي (د).

ولعله في صفحة رقم ٣٣٢ و ٣٣٣ في عنوان "علي (ع) في حكم عمر بن الخطاب" المؤلف استشهد بذات القول: "والله لأسالمن..."

وبأن الامير عليه السلام لم يقف لعمر موقف المعارض ولم يذكر لعله هذا أنه رضي لنفسه ان يكون كغيره من الناس الذين لم يرضوا ولمن جاء بعده الا المحاسن وعلم أنه اذا الاسلام ليس بذلك السر في أقصى نقاط العالم والمسلمون بخير فلا يهمه من تولى الحكم أيف تولاه

وفي عنوان خلافة عثمان المؤلف يصرح بأن الأمير عليه السلام قد بايع احسان كما بايع لعمر -

وفي صفحة رقم ٣١٠ في كيفية البيعة لأبي بكر هو يقول نقلاً:

ان علياً في رأي مصلحة الاسلام فرض عليه ان يتجاهل كل ما مضى فأرسل الى أبي بكر ليدعوه اليه ... وتم اللقاء بينهما بروح أسودها التسامح والتساهل).

[illegible]

(٢)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

فماذا تقولون في هذه القضية والحال بعض النصوص التاريخية تخالف هذا ومنه كتاب الأصول لسليم بن قيس [illegible] وأن النبي [illegible] ؟

(٣)

في بعض النصوص التاريخية قد جاءت هذه العبارة
"والله لا نبايع أبا الفصيل" يعني أبا بكر —
السؤال: أنه لماذا سمي أبا بكر أبا فصيل — ؟
(صفحة - ٢٧٠)

هو أبو بكر / ولد الإبل والفصيل / هو البكر ولد الإبل / تأكيد كنية أبا فصيل.

(٤)

في صلح الحديبية [illegible] نقل المؤلف ره بعض الأحاديث في وصف أمير المؤمنين وتوسل النبي ﷺ فيها بخاصف النعل — وقد ذكر هذه الأحاديث في كتب أصول السنة، فهل يمكن أنه جعل أعداء أهل البيت هذه الأحاديث [illegible] على ساحة الإمام [illegible] وأنه خاصف النعل أم لا ؟
(صفحة - ٢١٨)

وقصة خاصف النعل [illegible] السلام [illegible] الصحابة.

(٥)

في عنوان "زهده في الدنيا" المؤلف يقول: إن أمير المؤمنين سلام الله عليه كان يتأسى بالأنبياء والمرسلين [illegible] والحال كيف يمكن أن يتأسى بالأنبياء وهو أفضل منهم ولا أقل لرسول الله أسوة حسنة من أسوتهم. لقد استشهد ببعض خطبه ويقول:
لقد كان في رسول الله أسوة إذ ....
وقد حققنا أن هذه العبارة غير مذكورة في نهج البلاغة [illegible]
أين أخذه وخطبته في الزهد بهذا الشكل
"لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة .."

التأسي بالأنبياء [illegible] [illegible] سورة النحل رقم ١٢٣ (راجع [illegible])

تكتب في الحاشية [illegible] [illegible] البلاغة [illegible]

مضافاً الى هذا ان الامام المعصوم يوعظ الناس ويقول لهم الأئمة ... لهم !!!
ان تباري بنيتهم او اذهب هو نفسه ... تأسى بمسائل الانبياء والمرسلين
(صفحة ـ ٣٠٦)

(٦)

في صفحة رقم (٣٥٨) ـ ينقل هذه الرواية

الطبع لان بعض الآيات ليست مضبوطة وبعض
الاعلام والمصادر كانت مجهولة نفسياً لمستعين
لتفتيش العنوان للآيات وشرح حضرة الكتاب و
دون بحث

"نحن اهل بيت النبوة ومعدن الحكمة امان لأهل الارض
ونجاة لمن طلب. ان لنا حقاً ان نعطه اخذناه وان نمنعه
نركب اعجاز الابل" ـ

في تفسير الكلمة الاخيرة "نركب اعجاز الابل" ـ يقول ما معناه
انه يجب ان نكون تبعاً لغيرنا ـــ كيف يمكن هذا ان الامام المعصوم
ليس تابعاً لغيره بأي شكل وطريق ـ ...!
واين شئ هذا من سيرته المباركة ـ
وقد راجعنا فيه شرح نهج البلاغة لابن ابي الحديد في ذيل
الخطبة الشقشقية ـــ ونقل ابن ابي الحديد من
"احمد بن خوي" من علماء اهل اللغة بتفسير وشرح
اهل اللغة تفسيراً آخر واختاره السيد الرضي صاحب نهج البلاغة
وهو انه يركب المصائب والمصاعب فهل تفسير المصنف
خطأ في نظركم الشريف أم لا؟ ـــ

هذا خطأ في التفسير ومراده منه شرحها التوضيح (الايضاح) بذلك والمعنى الصحيح هو انا نصبر على المشاق والمشقات والمتاعب ونتحمل حتى نصل الى ولا نبعد منه كما يتحمل الراكب على اعجاز الابل المشقة والمتاعب وصعوبة السير والله اعلم بعلمه الى هدفه كذلك نحن (ع) نتابع سيرنا في الثبات والاكرام والالتزام حتى نصل الى هدفه

انتقل من الرضي (رح) خطبة وهو ... نقل من نهج ... رقم ٢٢ ...

التماس سورہ فاتحہ برائے تمام مرحومین

۱] شیخ صدوق
۲] علامہ مجلسی
۳] علامہ اظہر حسین
۴] علامہ سید علی نقی
۵] بیگم و سید عابد علی رضوی
۶) بیگم و سید احمد علی رضوی
۷) بیگم و سید رضا امجد
۸) بیگم و سید علی حیدر رضوی
۹) بیگم و سید سبط حسن
۱۰) بیگم و سید مردان حسین جعفری
۱۱) بیگم و سید جبار حسین
۱۲) بیگم و مرزا توحید علی
۱۳) سید حسین عباس فرحت
۱۴) بیگم و سید جعفر علی رضوی
۱۵) سید نظام حسین زیدی
۱۶) سیدہ ہما زہرہ
۱۷) سیدہ رضویہ خاتون
۱۸) سید نجم الحسن
۱۹) سید مبارک رضا
۲۰) سید تہنیت حیدر نقوی
۲۱) بیگم و مرزا محمد ہاشم
۲۲) سید باقر علی رضوی
۲۳) بیگم و سید باسط حسین
۲۴) سید عرفان حیدر رضوی
۲۵) بیگم و اخلاق حسین
۲۶) سید ممتاز حسین
۲۷) بیگم و سید اختر عباس
۲۸) سید محمد علی
۲۹) سیدہ رضیہ سلطان
۳۰) سید مظفر حسنین
۳۱) سید باسط حسین نقوی
۳۲) غلام محی الدین
۳۳) سید ناصر علی زیدی
۳۴) سید وزیر حیدر زیدی
۳۵) ریاض الحق
۳۶) خورشید بیگم

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیلِ سکینہؑ

پاکستان

۷۸۶
۱۱۰-۹۲
یا صاحب الزماں ادرکنی

Knowledge for All
SABIL-E-SAKINA

DVD
Version

لبیک یا حسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔

SABIL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.page.tl
sabeelesakina@gmail.com

www.ziaraat.com

NOT FOR COMMERCIAL